روشن مثالیں

کراچی کی چار بستیوں میں شہریوں کے ترقیاتی اقدامات کا مطالعہ

ترتیب و تعارف:
عارف حسن

روشن مثالیں

کراچی کی چار بستیوں میں شہریوں کے ترقیاتی اقدامات کا مطالعہ
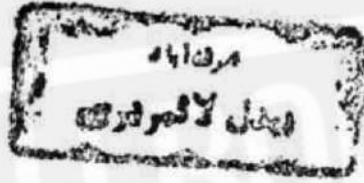
کراچی کی چار بستیوں میں شہریوں کے ترقیاتی اقدامات کا مطالعہ
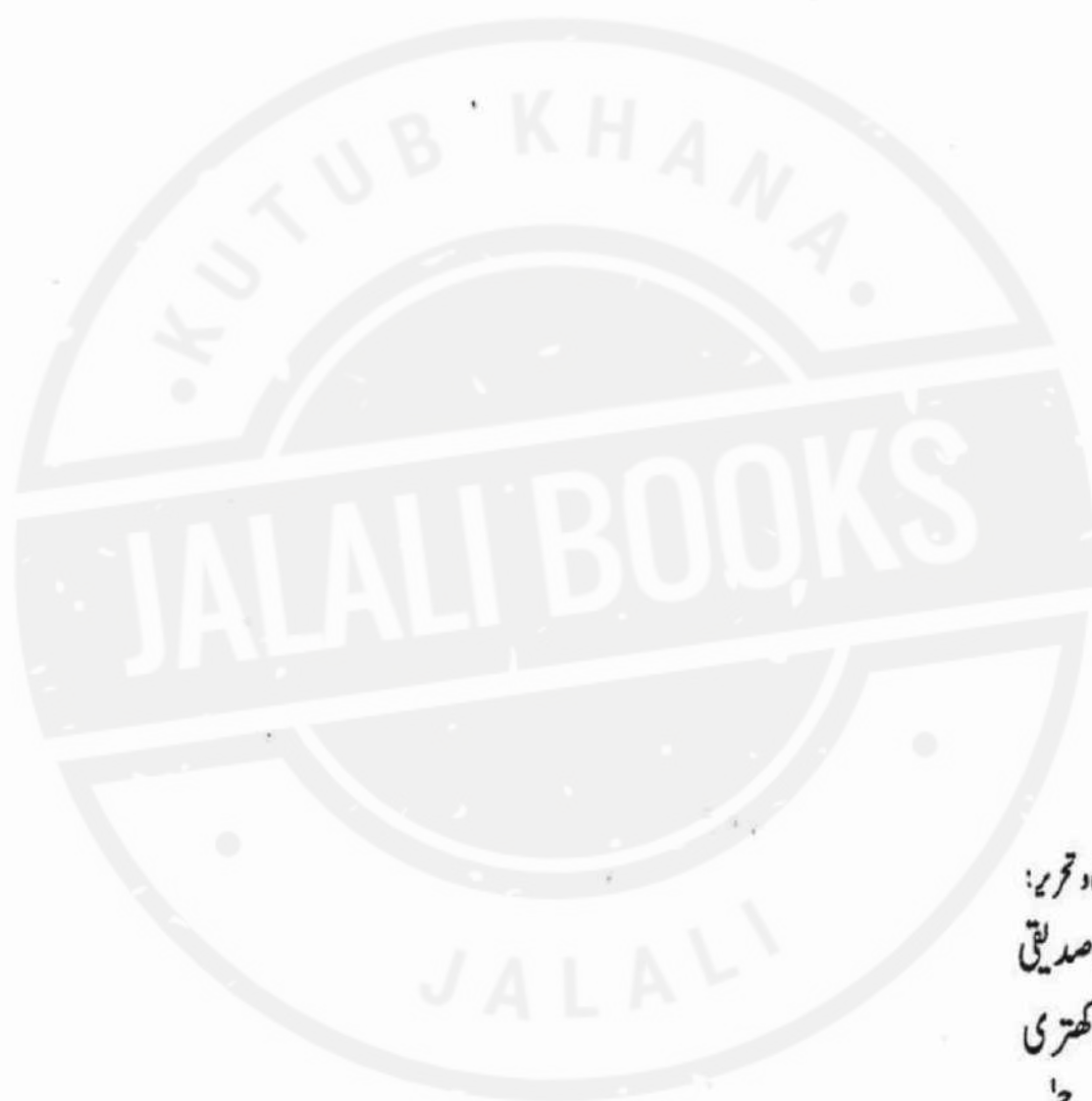
تحقیق و تحریر:
سارہ صدیقی
رشید کھتری
پروین رحمٰن
سلیم علیم الدین
انور راشد

ترتیب و تعارف:

عارف حسن

روشن مثالیں

عارف حسن

روشن مثالیں

کراچی کی چار بستیوں میں شہریوں کے ترقیاتی اقدامات کا مطالعہ

ISBN: 969-8380-33-7

ترجمہ: عطا صدیقی، ڈاکٹر تنویر انجم، اجمل کمال

اشاعت: اول ۲۰۰۰ء

طباعت: القوسین پروسس، شاہراہ لیاقت، کراچی

سٹی پریس

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 565-0623 (92-21)

ای میل: aaj@digicom.net.pk

فہرست

تعارف — عارف حسن

مطالعے

۱

نوالین، لیاری — سارہ صدیقی اور رشید کھتری

۲
ویلفیئر کالونی
پروین رحمٰن

۳
منظور کالونی
سلیم علیم الدین

٤ غازی آباد، اورنگی — انور راشد

ضمیمہ

NORTH KARACHI
SUPER HIGHWAY
ORANGI
Lyari River
NAZIMABAD
SITE
AIR PORT
MALIR
Malir River
SADAR
CBD
PORT
KORANGI
N
MANORA
CLIFTON
1. Nawalance
2. Welfare Colony
3. Ghaziabad
4. Manzoor Colony
ARABIAN SEA
0 1 2 3 4 5
KM

تعارف

عارف حسن

یہ چار مطالعے پاکستان اور کراچی کے تناظر میں

کراچی کے شہری باشندوں کے ترقیاتی اقدامات کی مثالوں کے یہ چار مطالعے، جو زیرِ نظر کتاب میں شامل ہیں، سوئس ڈویلپمنٹ کوآپریشن کے مالی تعاون سے چلنے والے تحقیقی منصوبے، ایکشن ریسرچ پروگرام، کے ایک حصے کے طور پر تیار کیے گئے ہیں۔ یہ تحقیقی منصوبہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار انوائرنمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ نے ایشیا اور لاطینی امریکہ کی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر شروع کیا ہے۔

یہ مطالعے تیار کرنے والے افراد ان این جی اوز سے وابستہ ہیں جو شراکتی ترقیات اور اس کے متعلقہ مسائل کے ضمن میں مقامی باشندوں اور گروپوں کے ساتھ عملی کام میں مصروف ہیں۔ تحقیق کے لیے ان افراد کے انتخاب میں دو اہم عناصر کارفرما تھے۔ ایک تو یہ کہ تحقیق کرنے والے فرد کو اس تحقیق کے ذریعے ایسی معلومات حاصل ہوں جنھیں وہ اپنے حالیہ یا مستقبل کے عملی کام میں استعمال کر سکے۔ اور دوسرا یہ کہ تحقیق کرنے والا ایسا شخص ہو جو علاقے کے باشندوں سے اس نوعیت کا مکالمہ کر سکے جو ان باشندوں کے لیے حالیہ یا مستقبل کے ترقیاتی کام میں مفید ثابت ہو سکے۔

کم آمدنی والے علاقے اور ان میں آباد باشندوں کے گروہ، جو اس تحقیق کا موضوع ہیں، ان کا انتخاب بھی احتیاط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ علاقے یا محلے مختلف طبعی، سماجی اور اقتصادی حالات کی نمائندگی کرتے ہیں اور علاوہ ازیں ترقیاتی عمل کے مابین فرق کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو شہر کے مختلف علاقوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ تاہم ان آبادیوں کے حالات کو مناسب طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے

کہ انھیں مجموعی طور پر پاکستان کے اور خصوصاً کراچی کی ترقیاتی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے۔ یہ تعارفی مضمون اسی مقصد سے تحریر کیا گیا ہے۔

ان مطالعوں کے سلسلے میں فیلڈ کا کام اکتوبر ۱۹۹۵ اور اپریل ۱۹۹۶ کے درمیانی عرصے میں مکمل کیا گیا۔ تب سے اب تک پاکستان کے سیاسی منظر پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں اور بہت سی شخصیات، جنھیں ان مطالعوں میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان بتایا گیا ہے، اب اپنے عہدوں پر نہیں رہے۔ علاوہ ازیں، اس عرصے کے بعد سامنے آنے والے ترقیاتی منصوبوں اور آبادی کے رجحانات کا بھی ان مطالعوں میں جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔

پاکستان کی سیاسی تقسیم

پاکستان چار صوبوں — سندھ، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان — پر مشتمل ایک وفاق ہے۔ ان صوبوں کو انتظامی طور پر ڈویژنوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ڈویژن ضلعوں میں، اور ہر ضلع تحصیلوں میں منقسم ہے۔ کراچی صوبہ سندھ کا حصہ اور اس کا ایک ڈویژن ہے۔ یہ ملک کی واحد بندرگاہ بھی ہے۔

۱۹۸۱ سے پہلے کی مردم شماری کے تمام اعداد و شمار اُس وقت کے کراچی ضلع سے متعلق تھے۔ یہ ضلع کراچی کے صرف شہری علاقے پر مشتمل تھا۔ ۱۹۸۱ کے بعد کے آبادی کے اعداد و شمار کراچی ڈویژن کا احاطہ کرتے ہیں جو پانچ شہری ضلعوں اور ایک دیہی ضلعے پر مشتمل ہے۔ کراچی کی آبادی کے ۹۶ فیصد سے زائد حصے کو شہری آبادی میں شمار کیا جاتا ہے۔

کراچی میٹروپولیٹن ایریا پانچ شہری ضلعوں پر مشتمل ہے۔ ضلع ایک انتظامی اکائی ہے۔ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (کے ایم سی) کی کونسل ۲۳۲ ارکان پر مشتمل ہے اور انھی پانچ ضلعوں سے منتخب کی جاتی ہے۔ اس کے ارکان یا کونسلر میئر کو منتخب کرتے ہیں۔ میٹروپولیٹن ایریا مزید پانچ حصوں میں منقسم ہے جنھیں زونل کونسل کہا جاتا ہے اور ہر ضلعے کے لیے ایک الگ زونل کونسل ہے۔ ان کونسلوں کو خاصی انتظامی خود مختاری حاصل ہے۔

جدول 1 پاکستان: آبادی، شہری اور دیہی آبادی کا تناسب اور اضافے کی شرح ۱۹۰۱ تا ۱۹۸۱

سال (فیصد)	آبادی			تناسب (فیصد)		سالانہ اضافہ
	کل آبادی	دیہی آبادی	شہری آبادی	دیہی	شہری	
1901	16,577,000	14,958,000	1,619,000	90.2	9.8	–
1911	18,805,000	17,116,000	1,689,000	91.0	9.0	0.42
1921	20,243,000	18,184,000	2,058,000	89.8	10.2	2.00
1931	22,640,000	19,871,000	2,769,000	87.8	12.2	3.79
1941	28,244,000	24,229,000	4,015,000	85.8	14.2	3.79
1951	33,740,000	27,721,000	6,019,000	82.2	17.8	4.13
1961	42,880,000	33,240,000	9,640,000	77.5	22.5	4.84
1972	65,309,000	48,715,000	16,594,000	74.6	25.4	4.75
1981	84,253,000	61,270,000	23,583,000	71.7	28.3	4.38
1991*	115,446,000	77,759,000	37,688,000	67.4	32.6	4.80
2001*	152,163,000	91,964,000	60,198,000	60.5	39.5	4.80

ماخذ: پاکستان کا ماحولیاتی خاکہ: حکومت پاکستان

کراچی-ایک مختصر تاریخ

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور اس کی واحد بین الاقوامی بندرگاہ ہے۔اس کی آبادی ایک کروڑ دو لاکھ پچاس ہزار ہے، یعنی ملک کی کل آبادی کا ۸،۶ فیصد اور ملک کی کل شہری آبادی کا ۲۷ فیصد حصہ اس شہر میں رہتا ہے۔اس کی آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح ۸،۴ فیصد ہے جس میں سے ۶،۲ فیصد آبادی میں فطری اضافے اور ۲،۲ فیصد ملک کے دوسرے حصوں سے کراچی منتقل ہونے والے افراد کو ظاہر کرتا ہے۔ شہر کی آبادی میں اضافے کی یہ شرح ملکی آبادی میں اضافے کی اوسط شرح یعنی ۹،۲ فیصد سالانہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

وفاقی محصولات کا ۲۵ فیصد اور مجموعی قومی پیداوار کا ۱۵ فیصد حصہ کراچی سے حاصل ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ملک بھر کے بینک ڈپازٹس کا ۵۰ فیصد اور جاری شدہ سرمائے کا ۲۷ فیصد کراچی سے تعلق رکھتا ہے۔ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ شہر پاکستان کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں کیوں اس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

کراچی کی بندرگاہ : تاریخی پس منظر

۱۷۲۸ میں حب دریا کی شاخ جس پر کھڑک بندر نامی دریائی بندرگاہ واقع تھی، شدید بارشوں کے سبب ریت سے اٹ گئی۔ چنانچہ اس بندرگاہ کو استعمال کرنے والے ہندو تاجروں کو کسی نئی بندرگاہ کی تلاش ہوئی۔ ۱۷۲۹ میں انھوں نے کراچی کی کھاڑی کا انتخاب کیا جو کھڑک بندر سے ۱۸ میل مشرق میں تھی، اور اس کے قریب ایک چھوٹے سے شہر کی بنیاد ڈالی۔ یہ شہر آگے چل کر کراچی کہلانے والا تھا۔

اگرچہ کراچی شہر اٹھارویں صدی کے اوائل میں آباد ہوا، لیکن اس کی کھاڑی کا ذکر قدیم تاریخی بیانات میں ملتا ہے اور اس کے آس پاس کے علاقے میں کئی مذہبی زیارت گاہیں اور تیرتھیں موجود ہیں۔ چنانچہ ہندو رزمیے رامائن (۱۰۰۰ ق م) میں مہادیو کے مندر کا ذکر ملتا ہے جو اب شہر کے نواحی علاقے میں واقع ہے۔ رامائن کے مرکزی کرداروں—رام اور سیتا— کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہنگلاج جاتے ہوئے ایک رات رام باغ میں بسرام کیا تھا؛ یہ باغ اب شہر کے مرکزی علاقے کا حصہ ہے۔ کروکلا کی کھاڑی، جس میں اکتوبر ۳۲۶ ق م میں سکندر اعظم کی فوج نے سمندری طوفان سے بچ کر پناہ لی تھی، اس کا محل وقوع کئی تاریخ دانوں کی تحقیق کے مطابق کراچی ہی تھا۔ اس کھاڑی کا ذکر بحیرۂ عرب میں جہاز رانی کے موضوع پر تحریر کردہ کئی قدیم عربی دستاویزوں میں بھی ملتا ہے جہاں اسے اس خطے میں سمندری طوفان سے بچ کر پناہ لینے کے لیے موزوں مقام قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں عبداللہ شاہ غازی (۷۶۳ء)، یوسف شاہ (۷۶۸ء) اور پیر منگھو (۱۲۲۱ء) کے مزارات شہر کے میٹروپولیٹن علاقے میں شامل ہیں اور سندھ کے مسلمان اور ہندو باشندوں کے لیے اب بھی اہم زیارت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کراچی شہر کا ارتقا

اٹھارویں صدی میں شمالی ہندوستان میں برپا سیاسی انتشار کے باعث ہندوستان کو وسطی ایشیا سے منسلک کرنے والے روایتی تجارتی راستے غیر محفوظ ہو گئے تھے۔اس لیے جزیرہ نمائے ہندوستان سے تمام تجارتی مال سمندری راستے سے کراچی بھیجا جاتا، اور یہاں سے زمینی راستے سے بلوچستان اور کابل ہوتے ہوئے سمرقند اور بخارا پہنچایا جاتا۔ وسطی ایشیا کے ساتھ اس تجارت کے سبب سے کراچی ایک اہم بندرگاہ بن گیا تھا اور یہاں کے مقامی تاجروں نے اپنے کاروبار کا دائرہ مشرق کی جانب چین تک، جنوب کی سمت زنجبار تک اور مغرب میں خیوا تک وسیع کر لیا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں بحیرۂ عرب کی جانب روسی پیش قدمی نے اس خطے میں برطانوی مفادات کو خطرے میں ڈال دیا تھا، چنانچہ ۱۸۳۹ میں انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کر لیا اور اس بندرگاہ کو روسیوں کی پیش قدمی روکنے کی غرض سے افغانستان بھیجی جانے والی فوجی مہمات کے لیے نفری اور اسلحہ اتارنے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ ۱۸۴۳ میں انگریزوں نے سندھ کی ریاست کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور کراچی کو سندھ کے انتظامی مرکز بنا دیا۔

کراچی: ۱۸۴۳ سے ۱۹۴۷ تک

۱۸۴۳ کے بعد سے کراچی کا پھیلاؤ بہت تیز ہو گیا۔ سندھ کے نئے انتظامی مرکز کی حیثیت سے یہاں نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور شہر کی آبادی، جو ۱۸۴۳ میں پندرہ ہزار تھی، ۱۸۷۰ میں ۵۶ ہزار تک جا پہنچی۔ ۱۸۷۰ کے عشرے میں ریل کے نظام کی تعمیر کے بعد کراچی کا زمینی رابطہ پنجاب کے زرعی علاقوں کے ساتھ قائم ہو گیا۔ ۱۸۹۰ کے عشرے میں جب صوبہ پنجاب میں آبپاشی کا نہری نظام قائم ہوا تو کراچی کی بندرگاہ وہاں کی زائد زرعی پیداوار کی برآمد کے لیے استعمال کی جانے لگی، اور اس

جدول 2 کراچی کی آبادی میں اضافہ

سال	آبادی	پچھلی مردم شماری سے اضافہ	مدت (سال)	فیصد اضافہ (کی)	آبادی میں اضافے کی اوسط سالانہ شرح
1941	435,887	135,108	10	44.90	3.70
1951	1,137,667	701,780	10	161.00	11.50
1961	2,044,044	906,377	10	79.70	6.05
1972	3,606,746	1,562,702	11	76.50	5.00
1981	5,437,984	1,831,238	9	50.80	4.96
1991*	10,250,000	2,806,337	10	37.70	
2001*	13,500,000	3,250,000	10	31.70	

* تخمینہ

ماخذ: حکومت پاکستان کی مردم شماری کی رپورٹوں کی بنیاد پر مصنف کا تخمینہ

سرگرمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہاں کی آبادی ۱۹۲۲ تک دو لاکھ تین ہزار ہو گئی۔ اس کے علاوہ برطانوی ہندوستان کی مغربی سرحدوں پر پہلے روس کے زاروں اور پھر سوویت حکومت کی جانب سے پڑنے والے دباؤ کے باعث کراچی کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا اور اس نے اہم بحری اڈے اور فوجی چھاؤنی کی حیثیت اختیار کر لی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اسے مشرقی محاذ پر ہونے والی کارروائی کی امداد کی غرض سے نفری اور فوجی ساز و سامان اتارنے کے لیے استعمال کیا گیا چنانچہ اس کی نشو و نما اور تیز رفتار ہو گئی۔ ۱۹۴۱ میں اس کی آبادی ۴۳۵۸۸۷ تھی۔ ۱۹۴۷ میں برطانوی ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی جس کے نتیجے میں پاکستان کی نئی ریاست قائم ہوئی۔ کراچی کو اس کا پہلا دارالحکومت بنایا گیا۔

۱۹۴۷ کے بعد کراچی کا پھیلاؤ

۱۹۴۷ میں کراچی کے نئی ریاست کا صدر مقام بننے کے بعد بیورو کریٹس، سرکاری اہلکار اور نیم سرکاری ادارے اس شہر میں منتقل ہوئے اور نئی ریاست کی ضروریات پوری کرنے کے لیے نئی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے چھ لاکھ سے زیادہ باشندے بھی کراچی کی آبادی کا حصہ بنے جس کے باعث شہر کی آبادی میں ۱۰ سال کے عرصے میں ۱۶۱ فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا۔ مہاجرین نے شہر کی تمام کھلی جگہوں، مرکزی علاقے، فوجی چھاؤنی اور سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ آبادی کی اس منتقلی نے کراچی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ شہر پر باہر سے آنے والی زبان اور کلچر کا غلبہ ہو گیا، اور اس امر نے آگے چل کر کراچی اور سندھ کے کئی نسلی اور سیاسی مسائل کو جنم دیا۔

۱۹۵۱ اور ۱۹۷۲ کے درمیانی عرصے کے دوران کراچی کی آبادی میں ۲۱۷ فیصد اضافہ ہوا۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ ۱۹۴۸ میں حکومت نے سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ (SITE) کا صنعتی علاقہ شہر کے مغرب میں قائم کیا۔ اب یہ علاقہ شہر کے مرکزی علاقے کا حصہ بن چکا ہے۔ سائٹ کے علاقے میں صنعتیں ۱۹۵۰ کے عشرے میں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے دارالحکومت کی انتظامی اور ترقیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک سروس سیکٹر بھی وجود میں آگیا۔ ان سرگرمیوں کو افرادی قوت ملک کے شمالی علاقوں سے ہونے والی نقل مکانی نے فراہم کی۔

۱۹۵۸ میں حکومت پاکستان نے ملک کے دیہی علاقوں میں سبز انقلاب کی تکنیکوں کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا اور ملک میں صنعتیں قائم کرنے کے لیے تیز رفتار اقدامات کرنا شروع کیے۔ ان فیصلوں کے سبب دیہی علاقوں سے کسانوں اور چھوٹے زمین داروں کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ صنعتی اور ترقیاتی سرگرمی کا مرکز کراچی تھا اس لیے سبز انقلاب کے باعث اکھڑنے والے لوگوں نے روزگار کی تلاش میں اسی شہر کا رخ کیا۔

۱۹۵۸ء ہی میں دریائے سندھ کے زیریں حصے پر کوٹری بیراج کی تعمیر شروع ہوئی۔اس کے نتیجے میں انڈس ڈیلٹا کے علاقے کا رقبہ ساڑھے تین ہزار مربع کلومیٹر سے سکڑ کر صرف ڈھائی سو مربع کلومیٹر رہ گیا۔اس علاقے کے بہت سے دیہات، جو بیشتر مچھیروں سے آباد تھے، پینے کے پانی سے محروم ہو گئے۔ان دیہاتوں کے باشندے بھی گروہوں کی صورت میں کراچی منتقل ہوئے اور شہر میں نئی ماہی گیری کی صنعت کی بنیاد رکھی۔۱۹۶۰ کے عشرے کے اوائل میں حکومت نے پولٹری فارم قائم کرنے کے لیے زمین اور قرض فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔یہ صنعت ماہی گیری کی صنعت سے مربوط تھی جس نے نہ صرف مقامی ضروریات کے لیے بلکہ برآمد کرنے کے لیے بھی پولٹری فیڈ تیار کرنا شروع کیا۔کراچی پولٹری کی مصنوعات کی برآمد کا مرکز بن گیا۔

ملک میں صنعتوں کے قیام اور زرعی شعبے میں سبز انقلاب کی تکنیکوں کے استعمال کے نتیجے میں بین الاقوامی اور اندرونِ ملک تجارت میں اضافہ ہوا۔اس کے باعث کراچی کی بندرگاہ کی سرگرمی دو عشروں کے عرصے کے دوران دگنی سے زیادہ ہو گئی۔صرف پنجاب کے زرعی علاقوں نے اس عرصے میں سالانہ ۱۳ارب ۲۰ کروڑ روپے مالیت کی فاضل زرعی اجناس پیدا کیں اور اس رقم کا بیشتر حصہ کراچی کی معیشت میں لگایا گیا۔

۱۹۶۱ میں حکومت نے فشریز ڈپارٹمنٹ قائم کیا اور ماہی گیری کے مشینی طریقوں اور نائلون کے جالوں کے استعمال کو رائج کرنا اور اس مقصد کے لیے ماہی گیری کے قرضے دینا شروع کیا۔یہ سلسلہ اقوام متحدہ کے خوراک اور زراعت کے ادارے ایف اے او (FAO) اور حکومت پاکستان کے مشترکہ پروگرام کے تحت چلایا گیا اور اس کے نتیجے میں ملک کے دریائی اور ساحلی علاقوں سے بڑی تعداد میں مچھیرے کراچی منتقل ہوئے۔فش ہاربر کی سرگرمی میں، جسے ۱۹۶۰ میں شہر کے مضافات میں قائم کیا گیا تھا، اس عرصے میں نمایاں اضافہ ہوا۔ماہی گیری کی سرگرمی میں اس اضافے کا جائزہ جدول ۳ میں دیے گئے اعداد و شمار کے ذریعے لیا گیا ہے۔

۱۹۵۸ اور ۱۹۶۰ کے عرصے کے دوران تیزی سے پھیلتے ہوئے شہر کی رہائش اور روزگار کی ضروریات پوری کرنے کے لیے گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان (GKRP) تیار کیا گیا۔اس منصوبے کے تحت شہر سے باہر لانڈھی کورنگی اور نیو کراچی کی دو ٹاؤن شپ قائم کی گئیں۔لانڈھی کورنگی کی ٹاؤن شپ کراچی سے ۲۰ کلومیٹر دور مشرق میں واقع تھی اور نیو کراچی کی ٹاؤن شپ شمال مشرق کی سمت ۲۴ کلومیٹر کے فاصلے پر۔۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط میں مہاجرین کو ان بستیوں میں منتقل کر دیا گیا۔ان دونوں مقامات پر صنعتی علاقوں کے لیے زمین مختص کی گئی تھی اور یہاں صنعتیں قائم کرنے کے لیے صنعت کاروں کو مراعات دینے کا اعلان کیا گیا تھا تاکہ یہاں رہنے والے شہریوں کو روزگار مہیا ہو سکے۔ان دونوں بستیوں میں مہاجرین کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں سے نقل مکانی کر کے کراچی آنے والے بہت سے شہری بھی آباد ہوئے۔ان بستیوں کے قیام نے کراچی شہر کی مستقبل کی طبعی ترقی کے خطوط بھی متعین کیے کیونکہ ان علاقوں کو شہر کے مرکز سے ملانے کے لیے تعمیر کی جانے والی سڑکوں کے کنارے غیر قانونی آبادیاں قائم ہوئیں جو ان سڑکوں کے آس پاس دستیاب شہری سہولتوں سے فائدہ اٹھانے لگیں۔

اسی عرصے کے دوران حکومت نے مہاجرین کی غیر قانونی آبادیوں کو شہر کے مرکز سے ہٹا کر خصوصی کالونیوں میں منتقل کر دیا۔ان میں سے بیشتر کالونیاں پرانے

جدول 3 کراچی اور سندھ کے ساحل پر ماہی گیری کی صنعت

سال	ٹرالرز	گل نیٹرز	مشینی / بادبانی کشتیاں	بادبانی کشتیاں
1957	3	70	–	1,030
1960	86	146	–	1,100
1965	258	490	–	2,794
1970	443	659	–	3,339
1975	1,098	752	230	3,978
1980	1,296	888	487	4,220
1985	1,631	1.090	2.211	2,785

جدول 4 کراچی: مرکزی کاروباری علاقے سے فاصلے کے اعتبار سے آبادی کا پھیلاؤ

مرکز سے فاصلہ	آبادی 1971	فی صد فاصلہ	آبادی 1981	فی صد فاصلہ	آبادی 1987	فی صد فاصلہ
0-5	999,801	30.3	1,316,937	27.9	1,401,063	18.8
5.1-10	1,088,588	33.0	1,124,913	23.8	2,085,778	28.0
10.1-15	472,732	14.3	910,065	19.3	1,832,009	24.6
15.1-20	411,198	12.4	882,492	18.7	1,273,400	17.1
20.1-25	311,009	9.4	425,115	9.0	701,426	9.4
25.1-30	13,335	0.4	36,784	0.8	80,665	1.1
30 سے زیادہ	6,157	0.2	28,341	0.6	69,322	0.9
کل	3,302,820	100.0	4,724,647	100.0	7,443,663	100.0

ماخذ: 1972 ,1981: مرکزی دفتر شماریات، حکومت پاکستان

1987 : کراچی میٹروپولیٹن ٹرانسپورٹ اسٹڈی (1988) میں لگایا گیا تخمینہ

شہر کی سرحدوں پر یا سائٹ کے علاقے کے آس پاس واقع تھیں۔ بہت جلد ان خصوصی کالونیوں کے اردگرد کچی آبادیاں بسنا شروع ہو گئیں۔ اس کے علاوہ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) نے گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان میں دیے گئے خطوط پر اوسط آمدنی والے طبقے کے لیے رہائشی زمین تیار کی۔ درمیانہ طبقے کے یہ رہائشی علاقے کراچی کے پرانے شہر اور نئی قائم کی گئی ٹاؤن شپس کے درمیان واقع تھے۔

۱۹۵۸ میں پاکستان میں فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس حکومت کے مقتدر افراد کا تعلق صوبہ سرحد کے شمالی اضلاع سے تھا۔ انھوں نے اپنے علاقے کے باشندوں کی سرپرستی کی اور کراچی میں تجارتی، صنعتی اور ٹرانسپورٹ کی سرگرمیاں شروع کرنے میں اُن کی مدد کی۔ اس کے علاوہ ملک کے شمالی علاقے کے باشندوں کو صنعتی مزدوروں کے طور پر بھی روزگار ملا اور اب سے کچھ عرصہ پہلے تک پولیس اور سکیورٹی اداروں میں بھی ان کی اکثریت تھی۔ اس امر نے بھی کراچی کے نسلی گروہوں کے مابین تناؤ میں اضافہ کیا، خصوصاً اس لحاظ سے کہ کراچی کی تقریباً تمام عوامی ٹرانسپورٹ کے مالک اور اسے چلانے والے صوبہ سرحد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹۶۱ میں وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے منتقل کر دیا گیا۔ اسلام آباد بہت فاصلے پر تھا اور اس نئے دارالحکومت کو کراچی کی بندرگاہ اور صنعتی علاقے سے منسلک کرنے کے لیے نئے اداروں اور ذیلی دفتروں کا قیام ضروری ہو گیا۔ اس سے شہر اور یہاں کے باشندوں کی بنیادی سہولتوں کی طلب میں مزید اضافہ ہوا۔

۱۹۷۲ سے ۱۹۸۷ تک کے درمیانی عرصے میں کراچی کی آبادی ۳۶ لاکھ سے ۷۴ لاکھ ہو گئی؛ اضافے کا یہ تناسب ۱۰۶٫۳۸ فیصد تھا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اضافے کا نصف ملک کے مختلف دیہی اور شہری علاقوں سے کراچی منتقل ہونے والے افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے علاوہ ۱۹۷۲ اور ۱۹۷۸ کے درمیان بنگلہ دیش سے تقریباً ساڑھے تین لاکھ مہاجرین یہاں منتقل ہوئے۔ ۱۹۷۷ اور ۱۹۸۶ تک کے عرصے میں کوئی تین لاکھ ایرانی اور افغان مہاجرین بھی یہاں آ بسے۔ بنگلہ دیش، سری لنکا اور فلپائن سے آنے والے غیر قانونی تارکین وطن کی تعداد بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ یہ غیر ملکی افراد گھریلو ملازموں کے طور پر اور گارمنٹ اور ماہی گیری کی صنعتوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کی تعداد کا اندازہ دو لاکھ لگایا گیا ہے۔

اسی عرصے میں پاکستان سے بہت بڑی تعداد میں لوگ روزگار کے لیے مشرق وسطی منتقل ہوئے۔ اس خطے میں کام کرنے والے تقریباً ساڑھے ۱۲ لاکھ پاکستانی باشندوں کی بھیجی ہوئی رقم (جو کہا جاتا ہے کہ ۳۰ ہزار روپے یا ۷۵۰ امریکی ڈالر فی کس سالانہ ہے) کے ۵۰ فیصد حصے کی سرمایہ کاری کراچی میں چھوٹے کاروبار اور جائیداد میں کی گئی۔ زمین اور رہائشی یونٹوں کی قیمتوں پر ہونے والی سٹے بازی کی بڑی وجہ یہی سرمایہ کاری ہے۔

جدول 5 — مرکز سے فاصلے کے اعتبار سے آبادی کے پھیلاؤ میں تبدیلی 1972-1987

مرکز سے فاصلہ (کلومیٹر)	آبادی میں تبدیلی 1972-81	فی صد فاصلہ	آبادی میں تبدیلی 1981-87	فی صد فاصلہ
0-5	317,136	22.3	84,126	3.1
5.1-10	36,325	2.6	960,865	35.3
10.1-15	437,333	30.8	921,944	33.9
15.1-20	471,284	33.1	390,908	14.4
20.1-25	114,106	8.0	276,311	10.2
25.1-30	23,449	1.6	43,881	1.6
30 سے زیادہ	22,184	1.6	40,981	1.5
کل	**1,421,827**	**100.0**	**2,719,016**	**100.0**

ماخذ: 1972 اور 1981 کے آبادی کے اعداد و شمار: مرکزی دفتر شماریات، حکومت پاکستان؛
1987 کے آبادی کے اعداد و شمار: کراچی میٹروپولیٹن ٹرانسپورٹ اسٹڈی، 1988

جدول 3 — کراچی کے بڑے کوریڈورز میں آبادی میں اضافے کا رجحان

سیکٹر	آبادی 1972	آبادی 1981	آبادی 1987	فی صد تبدیلی 1972-81	فی صد تبدیلی 1972
مشرقی	524,160	820,647	1,568,637	56.6	91.1
شمالی	1,291,679	1,526,711	2,602,912	18.2	70.5
مغربی	1,115,551	1,734,810	2,276,190	55.5	31.2
کل	**2,931,390**	**4,082,168**	**6,447,739**	**39.3**	**57.9**

نوٹ: کوریڈورز سے باہر کے علاقے اس جدول میں شامل نہیں ہیں۔
ماخذ: 1972 اور 1981 کے آبادی کے اعداد و شمار: مرکزی دفتر شماریات، حکومت پاکستان؛
1987 کے آبادی کے اعداد و شمار: کراچی میٹروپولیٹن ٹرانسپورٹ اسٹڈی، 1988

تحقیق سے کراچی کی آبادی میں اضافے کے جغرافیائی پھیلاؤ کے ضمن میں بعض اہم رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ پہلا یہ کہ کراچی کے زیادہ سے زیادہ باشندے اب شہر کے مرکزی علاقے سے دور آباد ہو رہے ہیں۔ جدول ۴ اور ۵ میں اس تبدیلی کی سطح اور نوعیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ شہر کے سب سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھنے والے کوریڈورز میں آبادی کے اضافے کے درمیان خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ اس فرق کو جدول ۶ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۹۷۲ اور ۱۹۸۲ کے درمیان مشرقی کوریڈور میں حکومت پاکستان نے اسٹیل مل کامپلیکس قائم کیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ڈیوٹی فری ایکسپورٹ پروسیسنگ زون (EPZ) بھی اسی کوریڈور میں اور پورٹ قاسم ہاربر اس سے متصل علاقے میں قائم کیا۔ ان تینوں کو خدمات فراہم کرنے کے لیے بہت سی بستیوں اور کالونیوں کی منصوبہ بندی کی گئی۔ لیکن ان میں کام کرنے والے بیشتر لوگ مشرقی کراچی کی کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ ۸۱-۱۹۷۲ کے عرصے میں اس کوریڈور میں آبادی میں

اضافے کا تناسب ۵٦٫٦ فیصد رہا جبکہ ۸۷-۱۹۸۱ کے عرصے میں یہ تناسب ۹۱٫۱ فیصد ہو گیا جس سے ان نئی ترقیاتی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شہر کے شمالی کوریڈور میں آبادی میں اضافے کا تناسب ۸۱-۱۹۷۲ کے عرصے میں ۱۸۰٫۲ فیصد جبکہ ۸۷-۱۹۸۱ کے عرصے میں ۷۰٫۵ فیصد رہا۔ یہ اضافہ بڑی حد تک کچی آبادیوں میں ہونے والے پھیلاؤ پر مشتمل تھا کیونکہ اس علاقے میں سرکاری زمین غیر قانونی قبضہ کر کے پلاٹ بیچنے کے لیے آسانی سے دستیاب تھی۔ اس کے علاوہ یہ کچی آبادیاں سائٹ کے علاقے کے قریب واقع تھیں، حب ندی سے آنے والی واٹر سپلائی سے فائدہ اٹھا سکتی تھیں اور ۱۹۷۰ کے عشرے میں تعمیر ہونے والے دو بڑی سڑکوں کو استعمال کر سکتی تھیں۔ یہ سڑکیں حیدر آباد جانے والی سپر ہائی وے اور کوئٹہ جانے والی آر سی ڈی ہائی وے ہیں۔ حکومت کی ڈیولپ کی ہوئی ہاؤسنگ اور کوآپریٹو ہاؤسنگ اسکیمیں بھی انھی دونوں سڑکوں کے کنارے واقع تھیں لیکن کچی آبادیوں کے برعکس یہ اسکیمیں زیادہ تر غیر آباد پڑی ہیں۔

کراچی کا مغربی کوریڈور پرانے شہر، برطانوی کنٹونمنٹ اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر مشتمل ہے۔ اس کوریڈور میں آبادی میں اضافے کا تناسب کم ہو رہا ہے جس کے اسباب واضح ہیں۔ ۸۱-۱۹۷۲ کے دوران آبادی میں اضافے کی شرح ۵۵٫۵ فیصد تھی اور ۸۷-۱۹۸۱ کے عرصے میں یہ کم ہو کر ۳۱٫۲ فیصد ہو گئی اور تب سے مسلسل کم ہو رہی ہے۔

اوپر جن رجحانات کا ذکر کیا گیا وہ ۱۹۸۷ سے ۱۹۹۳ تک کے عرصے میں بھی قائم رہے ہیں۔ اب یہ بات مسلّمہ طور پر مانی جانے لگی ہے کہ کراچی کی آبادی ایک کروڑ ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے توقع ہے کہ ۲۰۰۱ تک بڑھ کر ایک کروڑ ۳۰ لاکھ

جدول 7 رہائشی سہولتوں کی سالانہ طلب اور رسد

طلب کا عنصر	طلب (یونٹوں کی تعداد)
(۱) آبادی میں اضافہ	48,000
(۲) گزشتہ جمع شدہ طلب	34,200
(۳) متبادل رہائش	13,000
کل	96,500

رسمی سیکٹر میں رہائشی سہولتوں کی رسد (مختلف سرکاری محکموں سے جاری ہونے والے پرمٹوں کی تعداد) 1987-91 کے عرصے میں 26,700 یونٹ سالانہ تھی جبکہ طلب 96,500 یونٹ تھی۔

ماخذ: Seven Reports on Housing، عارف حسن

جدول 8 کچی آبادیوں کا پھیلاؤ

	1970 کا عشرہ (1978)	1980 کا عشرہ (1985)	تازہ ترین (1988)	سن 2000 (تخمینہ)
کچی آبادی میں رہنے والوں کی تعداد	2,000,000	2,600,000	3,400,000	7,070,000
کچی آبادی میں رہنے والے گھرانوں کی تعداد	227,000	356,000	465,000	960,000

ماخذ:

(۱) کراچی لینڈ اینڈ ہوسنگ اسٹڈی، ڈاکٹر ڈی ڈوال - ایم پی ڈی 1989

(۲) شیلٹر فار لو انکم کیمونٹیز: انسپکشن رپورٹ آن سندھ، ورلڈ بینک، اکتوبر 1990

جدول ۹ مکانوں کی اقسام: 1970تا 1986

مکانوں کی قسم	1970کا عشرہ (1969)	1980 کا عشرہ (1981)	تازہ ترین (1986)
مستقل یا پکے مکان	223,888	360,370	452,760
نیم مستقل یا نیم پکے مکان	179,730	360,370	534,688+
غیر مستقل یا کچے مکان	86,382	137,285	90,552+
کل تعداد	490,000	853,033	1,078,000

ماخذ: مندرجہ ذیل اخذات میں دی گئی معلومات کی بنیاد پر تخمینہ لگایا گیا:
(ا) ہاؤسنگ رپورٹ، کے ڈی اے ماسٹر پلان ڈپارٹمنٹ، 1972
(۲) ہاؤسنگ سینسس رپورٹ، حکومت پاکستان، 1981
(۳) ہاؤسنگ سیکٹر اسٹڈی ٹیکنیکل نوٹ، کے ڈی اے ماسٹر پلان ڈپارٹمنٹ، اے ای آر سی 1988

تک پہنچ جائے گی۔ ہر سال اندازاً پانچ لاکھ افراد شہر کی آبادی میں بڑھ جاتے ہیں۔ ایک اور تخمینے کے مطابق کراچی میں ہر سال ۳۳ ہزار خاندانوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ سندھ کی کل آبادی کا ۴۰ فیصد اور پاکستان کی کل آبادی کا ۸ء۹ فیصد حصہ کراچی میں رہتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد کے ابتدائی عرصے میں آبادی کی نقل مکانی نے اہم کردار ادا کیا۔ تاہم اب آبادی میں ہونے والا فطری اضافہ زیادہ اہم عنصر بنتا جا رہا ہے۔

رہائش کی بنیادی سہولتیں اور سماجی اشاریے

رہائش: طلب اور رسد کا فرق

حکومت نے کراچی کے لیے نت نئے انداز کی رہائشی پالیسیاں اور اسکیمیں وضع کیں، لیکن ان کا فائدہ غریب باشندوں تک نہ پہنچ سکا جن کی ضروریات شہر کی رہائشی سہولتوں کی طلب کا ۶۰ فیصد ہے۔ اس ناکامی کے اسباب یہ ہیں کہ ان اسکیموں سے مہیا ہونے والی رسد طلب کے مقابلے میں بہت کم تھی، ان کے نتیجے میں تیار ہونے والے رہائشی یونٹوں کی قیمت غریب باشندوں کی استطاعت سے باہر تھی اور اگرچہ مکان بنانے کے لیے قرض کی سہولت دستیاب تھی لیکن زمین خریدنے کے لیے نہیں۔ ان اسکیموں کے تحت زمین اور پھر اس پر مکان بنانے کے لیے قرض حاصل کرنے کا طریق کار نہایت پیچیدہ تھا اور اس عمل کے دوران سرکاری اہلکار غریب شہریوں سے شک وشبے اور درشتی سے پیش آتے اور رشوت کا مطالبہ کرتے تھے۔ رہائشی سہولتوں کی طلب اور رسد کے درمیان یہ فرق شہر کے مرکز میں واقع پرانے محلوں کی گنجانی میں اضافے، شہر کے مضافات میں نئی غیر قانونی کچی آبادیوں کے قیام، اور نئے رہائشی یونٹوں کی تعمیر کے التوا سے پورا ہوتا ہے۔ طلب اور رسد کے اس فرق کی سطح اور اس کے اثرات کا جائزہ جدول ۷ میں پیش کیا گیا ہے۔

تاہم کچی آبادیوں کے قیام کے باوجود کراچی میں عارضی مکانات کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ کچی آبادیوں میں زمین کی قانونی ملکیت کا بہتر تحفظ ہے اور کچی آبادی امپرووِمنٹ اینڈ ریگولرائزیشن پروگرام (KAIRP) جس کے باعث سرکاری زمین پر قائم تمام کچی آبادیوں کو جو ۱۹۸۵ سے پہلے سے موجود ہیں، قانونی تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن ۱۹۸۵ سے پہلے قائم ہونے والی کچی آبادیاں متواتر پھیل رہی ہیں اور ان کی آبادی مسلسل زیادہ گنجان ہوتی جا رہی ہے اور حکومت کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے وہ اس عمل کو روک سکے یا اس رجحان کو قانونی تحفظ دینے سے انکار کر سکے۔ جدول ۸ میں پیش کیے گئے آبادی کے اعداد و شمار اس حقیقت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، رہائشی سہولتوں کی طلب اور رسد کے درمیان

موجود فرق پرانے محلوں کی گنجانی میں اضافے اور سرکاری زمین پر قبضے اور پلاٹوں کی فروخت کے ذریعے کچی آبادیوں کے قیام سے پورا کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں عمل ذیل میں تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں۔

آبادی کی گنجانی میں اضافے کا رجحان اندرون شہر کے مزدور طبقے کے محلوں میں سب سے زیادہ ہے۔ اس علاقے کے درمیانہ طبقے کے محلے بھی اس قدر گنجان ہو چکے ہیں کہ درمیانہ طبقے کے لوگ یہاں سے منتقل ہو گئے اور ان کی جگہ نچلے طبقے کے افراد نے لے لی۔ اس رجحان کے اسباب یہ ہیں کہ پرانے شہر میں قائم تھوک کاروبار کے پرانے بازار، جو ۱۹۴۱ میں شہر کی چار لاکھ کی آبادی کو خدمات فراہم کرتے تھے، اب ایک کروڑ کے شہر کو سہولت دینے کے عمل میں بے حد پھیل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۱ اور ۱۹۹۱ کے اسی عرصے کے دوران کراچی بندرگاہ کی سرگرمی ۲،۷ ملین ٹن سالانہ سے بڑھ کر ۲۶ ملین ٹن سالانہ تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن اس سرگرمی کے ساتھ ساتھ گودام اور ذخیرہ کرنے کی سہولتوں میں اضافہ نہیں ہوا، چنانچہ شہر کا پرانا حصہ، جو بندرگاہ کے قریب واقع ہے، ایک بڑے گودام میں تبدیل کر دیا گیا۔ علاقے کی پرانی عمارتیں ڈھا دی گئیں اور ان کی جگہ ایسی عمارتوں نے لے لی جن میں نچلی منزل پر سامان ذخیرہ کرنے کی جگہ اور اوپر کی منزلوں پر مزدور طبقے کے لوگوں کے رہنے کے لیے کرائے کی جگہیں بنی ہوتی ہیں۔ یہ مزدور تقریباً تمام مرد ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں سے کراچی آئے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں یہاں چھوٹے کارخانے بھی کھل گئے ہیں۔ یہاں کے پرانے رہنے والے یہ علاقے چھوڑ کر شہر کے مضافات کی کچی آبادیوں میں منتقل ہوتے جا رہے ہیں جہاں رہائشی حالات یہاں سے بہتر ہیں گو زمین کی ملکیت کا قانونی تحفظ نہیں ہے۔ پرانے شہر کے ان رجحانات کو بلڈنگ بائی لاز سے بہت تقویت حاصل ہوئی ہے جن کے تحت ان علاقوں میں جہاں تین منزل سے زیادہ تعمیر کرنے پر پابندی تھی، وہاں کثیر منزلہ عمارتیں بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

چنانچہ اندرون شہر کے علاقوں میں محلوں میں پایا جانے والا اجتماعی احساس ناپید ہو چکا ہے اور یہاں اب جسم فروشی، منشیات اور جوئے کے اڈے بڑی تعداد میں چل رہے ہیں جن کو بدعنوان پولیس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ سماجی علوم کی اصطلاح میں شہر کے مضافات میں قائم ہونے والی کچی آبادیوں کے برخلاف یہ قدیم علاقے پسماندہ محلوں (slums) میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

سرکاری زمین کی غیر قانونی تقسیم کراچی میں رہائشی سہولت فراہم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جائزوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس عمل کے ذریعے کراچی میں ہر سال ۲۸،۰۰۰ رہائشی یونٹوں کے لیے پلاٹ تیار کیے جاتے ہیں اور اسے اس حقیقت سے تقویت ملتی ہے کہ کراچی میں تقریباً ۹۴ فیصد زمین کسی نہ کسی طرح سرکاری ملکیت میں ہے۔ غیر قانونی تقسیم کے اس عمل میں غیر رسمی سیکٹر سے تعلق رکھنے والا کوئی ڈویلپر سرکاری زمین پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس عمل میں اسے بدعنوان سرکاری اہلکاروں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے جو اس زمین کو پلاٹوں میں تقسیم کرنے اور ڈویلپ کرنے کے عمل میں اس کے شریک کار بن جاتے ہیں۔ ابتدا

جدول 10 کچی آبادیوں میں مکانوں کی قدامت اور معیار کا سہولتوں کی فراہمی سے تعلق

	مکانوں کی قدامت				
	0-5 سال	6-10 سال	11-15 سال	16-20 سال	20 سال سے زیادہ
آر سی سی کی چھت	22.7	16.4	14.4	21.1	19.4
پلاسٹر شدہ دیواریں	56.0	55.6	58.7	63.5	55.4
پائپ سے پانی کی فراہمی	48.1	48.7	57.4	50.9	48.9
بجلی کی فراہمی	63.0	71.5	81.2	87.5	83.5
گیس کی فراہمی	27.7	28.2	39.3	43.1	41.1

ماخذ: اے ای آر سی سروے، 1989

میں کسی بھی قسم کی سہولت سے محروم اس زمین پر غریب خاندانوں کو لا کر بسایا جاتا ہے اور ڈویلپر ان کے لیے پانی کا بندوبست ٹینکروں کے ذریعے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں جلد ہی ایک ٹھیکیدار بھی مکان بنانے کے لیے نقد رقم اور عمارتی سامان قرض پر فراہم کرنے اور تعمیر کے سلسلے میں تکنیکی مشورے دینے کے لیے اس علاقے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ پلاٹ خریدنے والے جب اپنے پلاٹ کا قبضہ لیتے ہیں، یا احاطے کی دیوار بناتے یا مکان کی چھت ڈالتے ہیں یا بجلی، پانی یا گیس کا کنکشن لگواتے ہیں تو علاقے کی پولیس ہر بار ان سے بھتہ وصول کرتی ہے۔ اس بھتے کے بدلے میں ان کو اس بات کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ انھیں ان کے پلاٹوں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔

ڈویلپر علاقے کے باشندوں کی ایک انجمن قائم کرتا اور اسے رجسٹر کراتا ہے۔ اس انجمن کے ذریعے وہ پانی اور بجلی کی فراہمی، سڑکوں کی تعمیر اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے کے لیے سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالتا ہے۔ وہ اور اس کے غیر رسمی شریک کار دونوں کا مفاد علاقے کے ڈویلپ ہونے سے وابستہ ہوتا ہے کیونکہ وہ علاقے میں بہت سے پلاٹوں کے مالک ہوتے ہیں اور قیمت بڑھنے پر انھیں فروخت کر کے منافع کمانا چاہتے ہیں۔ علاقے کے باشندوں یا کاروباری افراد کی کوششوں سے اسکول قائم ہوتے ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر کے معالج علاقے میں صحت کی سہولت فراہم کرنا شروع کرتے ہیں۔ پندرہ سے بیس سال تک کے عرصے میں یہ آبادیاں بیشتر سہولتیں حاصل کر لیتی ہیں، سوائے گندے پانی کے نکاس کی سہولت کے، جیسا کہ جدول ۱۰ میں دکھایا گیا ہے۔ ایسی بیشتر آبادیوں میں بسنے والے یا تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو ملک کے دیہی علاقوں سے نقل مکانی کر کے شہر آئے ہوں یا وہ خاندان جو شہر کے اندرونی علاقوں سے مضافات کی کچی آبادیوں میں منتقل ہوئے ہوں۔

گزشتہ عشرے میں کچی آبادیوں میں رہنے والوں کی تعداد ۹٫۲ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھی ہے جبکہ ملک کی شہری آبادی میں اضافے کی شرح ۴٫۸ فیصد ہے۔

کچی آبادی امپروومنٹ اینڈ ریگولرائزیشن پروگرام (KAIRP)

یہ کچی آبادیوں کی حالت میں بہتری لانے اور انھیں قانونی حیثیت دینے کا سرکاری پروگرام ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کی ۲۳۲۰ کچی آبادیوں کو ریگولرائز کرنا ہے جن میں ۵٫۵ ملین باشندے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے مقاصد میں ان آبادیوں کو پانی، نکاس، بجلی اور سڑکوں کی سہولتیں اور سماجی سہولتیں مہیا کر کے ان کی حالت بہتر بنانا بھی شامل ہے۔ آبادی کے باشندوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان ترقیاتی کاموں کی قیمت زمین اور ڈویلپمنٹ کے واجبات کی صورت میں ادا کریں گے جنھیں مشترکہ طور پر "لیز چارجز" کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ پروگرام ۱۹۷۸ سے جاری ہے۔ تاہم اسے بہت سے مسائل کا سامنا ہے جن پر ذیل میں گفتگو کی جا رہی ہے۔

کے اے آئی آر پی کے تحت کام کی رفتار بہت سست رہی ہے۔ ۱۹۷۸ سے اب تک ۸۵٫۱۳ فیصد خاندانوں یا ۲۲٫۴۱ فیصد کچی آبادیوں کو ریگولرائز کیا جا سکا ہے یا وہ اس عمل میں ہیں۔ کام کی اس سست رفتار کے بیان کردہ اسباب میں فنڈز کی کمی، حکومت کی جانب سے ترقیاتی کام میں بھاری مالی امداد اور آبادیوں سے لیز چارجز کی عدم وصولی (جس کے باعث فنڈز گردش میں آنے سے قاصر رہتے ہیں) اور آبادیوں کے رہنے والوں کی اس پروگرام سے عدم دلچسپی شامل ہیں۔ کچی آبادیوں کے اس کام سے سابقہ انبار کو دیکھتے ہوئے ہر سال ایک لاکھ خاندانوں کو اس پروگرام

جدول 11 کچی آبادی اور منصوبہ بند محلوں کے انفراسٹرکچر کا موازنہ

سہولت	منصوبہ بند محلے (فیصد)	کچی آبادیاں (فیصد)
پائپ سے پانی کی فراہمی	84	50
بجلی کی فراہمی	95	76
گیس کی فراہمی	75	35
سینی ٹیشن کا نظام	85 (تخمینہ)	12 (تخمینہ)
سوکھے کچرے کا بندوبست	60 (تخمینہ)	10 (تخمینہ)

جدول 12 — کچی آبادیوں اور منصوبہ بند محلوں کے سماجی اشاریوں کا موازنہ

سماجی اشاریے	منصوبہ بند محلے	کچی آبادیاں
آبادیاتی		
گھرانے میں افراد کی اوسط تعداد	6.9	7.3
گھرانے میں مردوں کی تعداد (فیصد)	54.0	65.0
گھرانے میں عورتوں کی تعداد (فیصد)	46.0	35.0
گھرانے میں بیس سال سے کم عمر افراد کی تعداد (فیصد)	48.6	56.4
پیدائش کی مجموعی شرح	1.3	3.6
آمدنی		
اوسط ماہانہ آمدنی (روپے)	3,808 - 4,930	1,899 - 2,158
تعلیم		
آبادی میں دس سال سے بڑے خواندہ افراد کی تعداد (فیصد)	76.0	48-67
آبادی میں پرائمری تعلیم یافتہ افراد کی تعداد (فیصد)	60.1	45.4
آبادی میں سیکنڈری تعلیم یافتہ افراد کی تعداد (فیصد)	50.6	23.7
آبادی میں انٹر میڈیٹ افراد کی تعداد (فیصد)	30.8	7.4
آبادی میں گریجویٹ افراد کی تعداد (فیصد)	19.1	3.1
پرائمری اسکولوں میں داخلہ لینے والے لڑکوں کی تعداد (فیصد)	87.0	60.0
پرائمری اسکولوں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد (فیصد)	83.0	49.0

ماخذ: اے ای آر سی سروے 1989

جدول 13 — کم آمدنی والی آبادیوں کے سماجی اشاریوں کا موازنہ

	اورنگی	کریم آباد	عیسیٰ نگری	بابا بھٹ
سروے کا سال	1984	1984-85	1986-87	1989
گھرانے میں افراد کی اوسط تعداد	7.6	5.1	6.7	7.3
مکان میں کمروں کی اوسط تعداد	2.0	2.9	1.7	2.3
کمرے میں افراد کی اوسط تعداد	3.8	1.8	4.2	3.2
دس سال سے بڑے خواندہ افراد کی تعداد (فیصد)	73.0	92.6	54.2	19.6
گھرانے کی اوسط ماہانہ آمدنی (روپے)	1,490	2,400	1,535	2,309
گھرانے کے سربراہ کا کراچی سے پیدائشی تعلق (فیصد)	0.0	0.0	16.3	88.1
پیدائش کی مجموعی شرح (فی ہزار)	40.8	16.3	44.4	39.2
اموات کی مجموعی شرح (فی ہزار)	9.6	7.3	10.9	20.0
شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح (فی ہزار زندہ پیدائش)	110.4	33.3	105.0	208.9

ماخذ: کمیونٹی ہیلتھ سائنسز ڈپارٹمنٹ، آغا خان میڈیکل یونیورسٹی، کراچی

سے مستفید ہونا چاہیے۔ لیکن ہر سال موجودہ پروگرام کے تحت صرف ۳۰۰۰۰ خاندان اس سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔ (ماخذ: پاکستان لوکاسٹ ہاؤسنگ پروجیکٹ، ایشین ڈویلپمنٹ بینک، ۱۹۸۹)۔

۱۹۸۹ کے بعد سے کل پاکستان سطح پر کارکردگی میں بہتری نہیں ہوئی ہے۔اب تک اس پروگرام پر ۶۶۸،۴۴ ملین روپے خرچ کیے جاچکے ہیں۔اس کے بدلے میں ۲۲۵،۷۵ ملین روپے لیز چارجز کے طور پر وصول کیے جانے کی توقع ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈویلپمنٹ کے اخراجات کا ۵۰ فیصد حصہ حکومت برداشت کرتی ہے اور باقی ۵۰ فیصد اس سے فائدہ اٹھانے والے باشندوں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔اگر وہ باشندے یہ پوری واجب الادار قم ایک ساتھ ادا کردیں تو انھیں اس پر ۵۰ فیصد کی رعایت بھی دی جاتی ہے۔

صوبہ پنجاب میں—جہاں کا کچی آبادی کا ترقیاتی پروگرام پاکستان میں سب سے زیادہ کامیاب ہے—۳،۵ ملین افراد یا تقریباً ۵۰۰،۰۰۰ خاندان کچی آبادیوں میں رہتے ہیں۔ ۲۵۰ ملین روپے (یا ۸ ملین امریکی ڈالر) کے سالانہ بجٹ کے ساتھ ہر سال صرف ۵۰،۰۰۰ خاندان اس پروگرام سے مستفید ہو سکتے ہیں۔اس رفتار سے اس پروگرام کے مکمل ہونے میں دس برس کا عرصہ لگے گا،اور وہ بھی اس صورت میں کہ زمین اور ڈویلپمنٹ کے چارجز پوری طرح وصول کیے جاسکیں۔اب تک وصولی کی کارکردگی بہت کمزور رہی ہے۔مثال کے طور پر لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی (LDA) نے اس پروگرام پر کل ۲۰۰ ملین روپے خرچ کیے ہیں اور وصولی صرف ۱۰ ملین روپے کی ہوئی ہے۔صوبائی کچی آبادی ڈائرکٹریٹ کے واجبات کی وصولی کسی قدر بہتر رہی ہے۔

اگرچہ فنڈز کی کمی کو کام کی سست رفتار کے ایک سبب کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن ہر سال پروگرام کے لیے مختص کیے جانے والے ۴۰۰ ملین روپے میں سے درحقیقت صرف ۲۰۰ ملین روپے استعمال کیے جاتے ہیں۔یہ بات پروگرام پر عملدرآمد کے ذمہ دار سرکاری محکموں میں صلاحیت کی کمی کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ (ماخذ: اے ڈی بی، ۱۹۸۹)۔

اگرچہ ترقیاتی پروگرام کے تحت موقع پر موجود انفراسٹرکچر اکثر صورتوں میں تعمیر کرلیا جاتا ہے، لیکن ثانوی انفراسٹرکچر تعمیر کرنے میں، یعنی آبادیوں کو شہر یا قصبے کے نکاس یا مواصلات کے نظام سے منسلک کرنے کے بندوبست میں ناکامی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ سرکاری محکموں اور شہریوں کے درمیان باہمی اعتماد کی کمی ہے جو کچی آبادیوں کے باشندوں کو لیز حاصل کرنے سے روکتی ہے۔اس رویے کو مزید تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ کچی آبادیوں کے رہنے والوں کو اپنی ملکیت کا غیر رسمی تحفظ پہلے ہی حاصل ہوتا ہے،اور اس سے بھی کہ لیز حاصل کرنے کا عمل خاصا طویل اور پیچیدہ ہے جس کی ہمت غیر معمولی طور پر دلیر اور ہوشیار باشندے ہی کرپاتے ہیں۔

کے اے آئی آر پی کے لیے مقرر کردہ منصوبہ بندی کے معیارات بھی غیر ضروری طور پر اونچے ہیں اور ان پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچی آبادی کے تقریباً ۳۵ فیصد لوگ اپنے مکانوں سے محروم ہو جائیں۔ ان اکھڑے ہوئے لوگوں کی باز آبادکاری بڑے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پیدا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ مقرر کردہ معیارات کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا،اور اب، دس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد، ریگولرائزیشن کا عمل سرکاری محکموں کے ہاتھوں خود ان کے اپنے مقرر کردہ معیارات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انجام دیا جارہا ہے۔

انفراسٹرکچر

اندرونِ شہر کے باقاعدہ منصوبہ بند غریب محلّوں اور بے ضابطہ پس ماندہ بستیوں میں انفراسٹرکچر پہلے سے موجود ہے۔ تاہم وقت گزرنے اور آبادی کی گنجانی میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بہت خراب ہو چکی ہے اور بہت سے علاقوں میں یہ منہدم ہونے کے نزدیک ہے۔دوسرے علاقوں میں انفراسٹرکچر کا مطلب صرف پانی کے اجتماعی نلکے اور عوامی بیت الخلا تھا۔اب صرف یہ سہولتیں وہاں کے باشندوں کی ضروریات پوری نہیں کرسکتیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ قبیلے کی بنیاد پر بسنے والی آبادیوں نے کثیر نسلی محلّوں کی صورت اختیار کرلی ہے اور لوگوں کو اب اپنی خلوت قائم رکھنے کی خواہش ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ پانی اور بیت الخلا کی سہولت اپنے مکان کے اندر چاہتے ہیں۔

زمین کی غیر قانونی تقسیم کے ذریعے وجود میں آنے والی آبادیوں میں انفراسٹرکچر کی سہولتیں کس طرح حاصل کی جاتی ہیں اس کی وضاحت اوپر کی جاچکی ہے اور اس سلسلے میں ان کچی آبادیوں اور منصوبہ بند علاقوں کے درمیان موازنہ جدول ۱۱ میں پیش کیا گیا ہے۔

سماجی اشاریے

کراچی کے منصوبہ بند علاقوں اور کچی آبادیوں کے درمیان سماجی اشاریوں کے لحاظ سے بہت نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ان اشاریوں کے ضمن میں دونوں قسم کے علاقوں

کے درمیان فرق جدول ۱۲ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ کم آمدنی والے علاقوں کے درمیان بھی سماجی اشاریوں کے لحاظ سے خاصا فرق موجود ہے۔ یہ فرق جدول ۱۳ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان جدولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ آمدنی کا لازمی مطلب بہتر سماجی اشاریے نہیں۔

یہ چار مطالعے کراچی کے تناظر میں

اب ان چار مطالعوں کو جو موجودہ کتاب میں شامل ہیں، کراچی کے مجموعی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(۱) نوالین، لیاری

یہ شہر کے مرکز میں واقع ایک پرانا محلّہ ہے جس کے باشندے یہاں سو برس سے زیادہ عرصے سے رہ رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اٹھارویں صدی میں اُس وقت یہاں آئے جب شہر کے طور پر کراچی کی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ اس محلے کے اردگرد کا پورا علاقہ بڑی تیزی سے سروس سیکٹر کے علاقے میں بدل رہا ہے جہاں ٹرانسپورٹ اور بندرگاہ سے متعلق سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔ خود نوالین کا محلّہ بھی بہت گنجان آباد ہو گیا ہے۔ یہاں کی آبادی اپنی اصل کے لحاظ سے قبائلی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اس نے اپنے قبائلی سماجی ڈھانچے اور رسم ورواج کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ سماجی اشاریوں کے اعتبار سے یہ محلّہ شہر کا پست ترین علاقہ ہے۔ تاہم چونکہ اس کی جڑیں سندھ کی زمین میں ہیں اور یہاں کے باشندوں کو باہر سے ہجرت کر کے آنے والا گروہ نہیں سمجھا جاتا، اس لیے اسے دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی بعض طاقت ور سیاسی تنظیموں کے زیر اثر متعدد سرکاری ترقیاتی منصوبوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔

(۲) ویلفیئر کالونی

ویلفیئر کالونی شہر کی پھلوں اور سبزیوں کی بڑی منڈی کے پاس واقع ہے اور اسے سرکاری زمین کی غیر قانونی تقسیم کے ذریعے بسایا گیا تھا۔ اس آبادی میں ترقیاتی کام سرکاری محکموں، این جی اوز یا سیاسی پارٹیوں کی جانب سے کسی قسم کی حمایت یا امداد کے بغیر انجام دیا گیا ہے۔ سبزی منڈی کی مزدور یونین، اور دوسری مزدور یونینوں سے اس کے روابط، نے یہاں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس آبادی کے باشندے مختلف لسانی اور نسلی پس منظر رکھتے ہیں، اور ان مختلف گروہوں کی سماجی ترقی کی منزلوں کا پتا ان کی عورتوں کے ادا کردہ کردار سے بخوبی چل جاتا ہے۔ اس آبادی کے تمام گھرانے چالیس سال یا اس سے کم مدت پہلے اس شہر میں آکر بسے ہیں۔

(۳) منظور کالونی

منظور کالونی بھی سرکاری زمین کی غیر قانونی تقسیم کے ذریعے وجود میں آنے والی آبادی ہے اور اس کے اردگرد درمیانہ طبقے کے رہائشی علاقے واقع ہیں۔ یہاں رہنے والے بیشتر خاندان پنجاب کے دیہی علاقوں سے نقل مکانی کر کے کراچی آئے ہیں اور کاریگر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر بیس سے تیس سال پہلے شہر میں آئے تھے۔ اس آبادی کے ترقیاتی کام میں کراچی کی دو اہم این جی اوز نے معاونت کی ہے۔

(۴) غازی آباد، اورنگی

غازی آباد کے وجود میں آنے کا طریقہ بھی سرکاری زمین کی غیر قانونی تقسیم تھا۔ تاہم یہ ایک نسبتاً نئی آبادی ہے اور اس میں کیا جانے والا ترقیاتی کام مقامی پیش قدمی کا نتیجہ ہے جسے باہر سے کوئی خاص امداد حاصل نہیں ہوئی۔ یہ مقامی پیش قدمی تعلیم یافتہ سماجی کارکنوں اور ایسے باشندوں کی مرہونِ منت ہے جو، باقی تینوں آبادیوں کے برعکس، شہری پس منظر رکھتے ہیں۔

ان تمام آبادیوں کو جو اس مطالعے کا حصہ ہیں، ملکیت کا تحفظ، انفراسٹرکچر اور سماجی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے مختلف طریقے سے جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ اس کتاب میں پیش کی جانے والے مطالعے اس جدوجہد اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی کہانی سناتے ہیں۔

۸ نومبر ۱۹۹۶

نوالین، لیاری

بستی کا خاکہ

نوالین، لیاری

سارہ صدیقی اور رشید کھتری
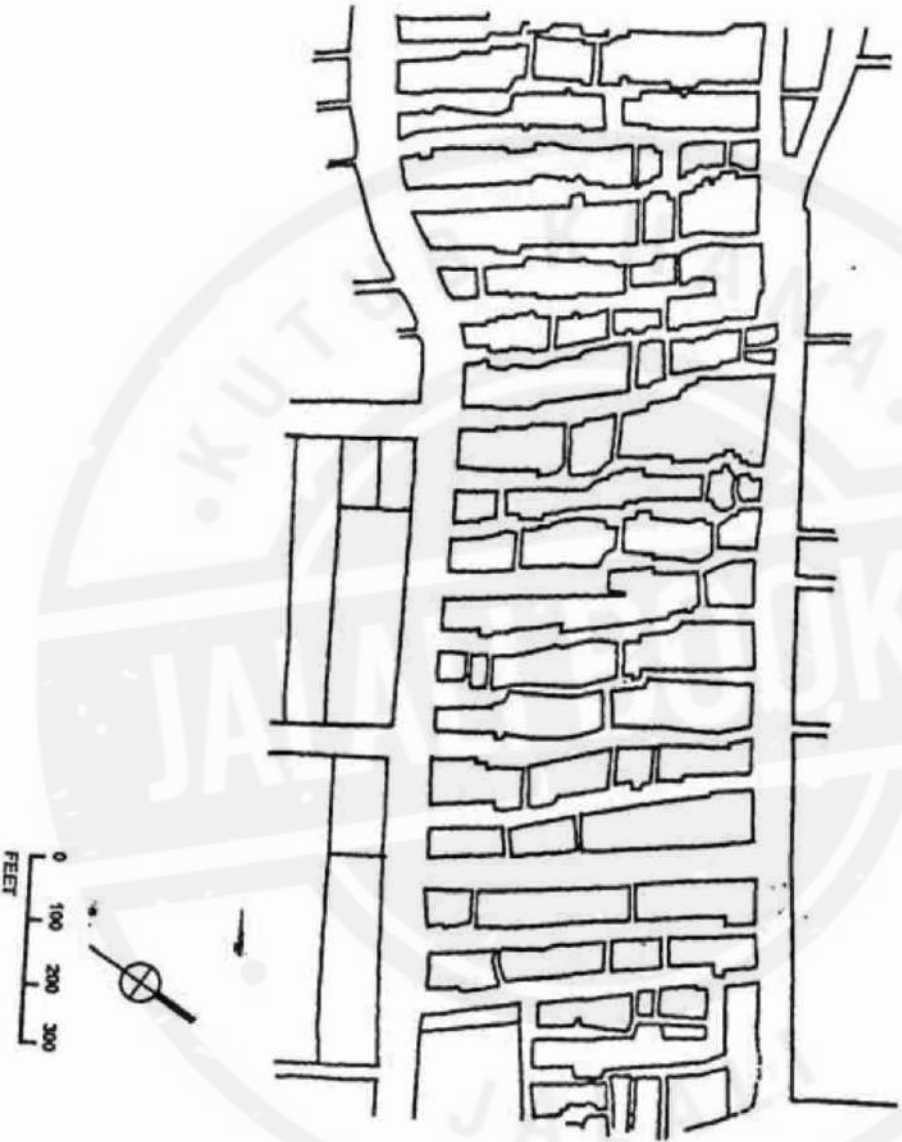
آبادی کا قیام اور تاریخ

لیاری کراچی کے ضلع جنوبی میں واقع ہے اور ۱۴ محلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا محل وقوع شہر کے مرکزی کاروباری علاقے صدر کے قریب ہے۔

اس علاقے کے رہنے والے یہاں کی تاریخ کو ۲۵۰ سال پہلے سے شروع کرتے ہیں جب بھوجو مل نامی ایک تاجر حب دریا کے مغربی کنارے کی کھڑک بندر نامی چھوٹی سمندری بندرگاہ سے ۳۰۰ دوسرے افراد کے ساتھ کراچی منتقل ہوا جو اُس زمانے میں مچھیروں کی ایک چھوٹی بستی اور قدرتی بندرگاہ تھی۔ لیکن یہ بندرگاہ اس وقت زیادہ استعمال نہیں کی جاتی تھی۔ بھوجو مل نے کراچی کے گاؤں میں مچھیروں کی بیس پچیس جھونپڑیاں دیکھیں۔ کھڑک بندر سے نکلنے کے اسباب لیاری کے بیشتر باشندوں کے ذہن میں زیادہ واضح نہیں ہیں، لیکن بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ بندرگاہ زلزلے کے باعث تباہ ہو گئی تھی۔

بھوجو مل اپنے ساتھیوں سمیت کراچی کی بندرگاہ کے نزدیک دو محلوں میٹھادر (جہاں میٹھے پانی کا کنواں واقع تھا) اور سمندر کے بالکل سامنے کھارادر (یعنی کھارے پانی کا دروازہ) میں آباد ہوا۔ اس تاجر کے پڑپوتے سیٹھ ناؤں مل ہوت چند نے شہر کے بسنے کی روداد اپنی یادداشتوں میں تحریر کی ہے۔ ناؤں مل کے مطابق اپنے ابتدائی دور میں کراچی ایک قلعے کی فصیل کے اندر بسا ہوا تھا اور یہ فصیل ۱۷۲۹ میں بھوجو مل کے آدمیوں نے تعمیر کی تھی۔ اس فصیل بند شہر کا رقبہ ۳۰ سے ۳۵ ایکڑ تک تھا۔ شہر میں داخلے کے دو دروازے تھے۔ مغرب کی جانب سمندر کے رخ کھلنے والا دروازہ کھارادر، اور شمال مشرق کی سمت دریائے لیاری کے رخ کھلنے والا دروازہ میٹھادر کہلاتا تھا۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ (KPT) کی جانب سے شائع ہونے والی کراچی بندرگاہ

کی تاریخ میں کہا گیا ہے، "اپنی ریکارڈ شدہ تاریخ کے ابتدائی دور میں کراچی کا ساحلی شہر (کراچی کے مغرب کی جانب واقع ایک سلطنت) قلات کے خان کے انتظامی اختیار میں تھا۔ لیکن اس کے حکمران کئی بار تبدیل ہوئے کیونکہ سندھ (یعنی اب یہ جس صوبے کا حصہ ہے) کے حکمرانوں کی نظریں بھی دفاعی اور تجارتی اہمیت رکھنے والے اس شہر پر تھیں۔ ۱۷۹۵ میں سندھ کے حکمران میر فتح علی خان تالپر نے اس شہر پر قبضہ کر لیا جب کہ قلات کے خان نے یہاں سے اپنی فوجی چھاؤنی ہٹالی۔ میر فتح علی نے اس بندرگاہ کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے ۱۷۹۷ میں منوڑا کے جزیرے پر ایک قلعہ تعمیر کیا تاکہ سمندر کی جانب سے اس ساحلی شہر کی طرف ہونے والی کسی پیش قدمی کی صورت میں اس کا دفاع کیا جاسکے۔ تالپر دور میں کراچی شہر میں پہلی بار تجارتی سرگرمیاں بڑے پیمانے پر اور منظم انداز میں شروع ہوئیں۔"

کراچی کی بندرگاہ میں لوگ لسبیلہ (جو یہاں سے شمال مغرب میں ۲۰۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے)، اور کچھ (بلوچستان کا ایک ضلع) سے بھی آکر آباد ہوئے۔ یہ نئے آنے والے عموماً اپنے علاقے میں خشک سالی اور قحط کی صورت میں کراچی کا رخ کرتے تھے۔ لاسی (لسبیلہ سے آنے والے) اور کچھی خشک سالی کے زمانے میں چھوٹی موٹی مزدوری مثلاً بندرگاہ میں جہازوں پر سامان چڑھانے اتارنے والے قلیوں کے طور پر کام کرنے آتے تھے اور خشک سالی ختم ہوتے ہی واپس لوٹ جاتے تھے۔

لاسیوں اور کچھیوں کے بہت بعد ایرانی بلوچستان کے جنگجو قبیلوں کے لوگ یہاں آئے۔ یہ خوش حال لوگ تھے؛ انھوں نے یہاں زمینیں خریدیں، اور کچھ لوگوں نے تو تجارت بھی شروع کر دی اور علاقے میں خاصا اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ اگر وہ کوئی جرم کرتے تو ان کے لیے یہاں سے اپنے آبائی علاقے کو فرار ہو جانا بھی آسان تھا۔ لیاری کے لاسیوں اور ایرانی بلوچوں نے اپنے اپنے آبائی علاقوں سے اپنا تعلق برقرار رکھا ہے۔

کراچی میں عرب نژاد لوگ بھی آباد تھے جو محمد بن قاسم کے ساتھ اس وقت آئے تھے جب اس نے آٹھویں صدی میں سندھ پر حملہ کیا تھا، اور بعض ایسے تھے جو ہمسایہ ایران اور ساحل مکران سے آئے تھے۔

لوالین اور نیو کمہارواڑہ میں داخلے کے راستے پر کے ایم سی کی تعمیر کردہ ایک یادگار

لیاری کی نئی صورت حال

انیسویں صدی کے اوائل میں شہر کی بڑی سرگرمی مسقط، عمان (مشرق وسطیٰ)، گوادر (ساحل مکران، بلوچستان) اور پوربندر (ساحل گجرات) کے ساتھ تجارت پر مشتمل تھی۔ ۳۸-۱۸۳۷ میں یہاں درآمد کی جانے والی اشیا کی مالیت ۱،۵۹۹،۶۲۵ روپے تھی۔ بمبئی کے راستے درآمد کی جانے والی اشیا میں لوہا، فولاد، تانبا، ململ اور جامدانی کے کپڑے، ریشم، مخمل، گھی، ناریل اور گرم مسالے، سیاہ مرچ، لونگ اور الائچی شامل تھیں۔ مسقط سے آنے والے جہاز کھجوریں، بادام، ہاتھی دانت، تانبے کی سلاخیں، دوائیں اور مشرق وسطیٰ اور مشرقی افریقہ سے غلام لاتے تھے۔ لیاری کے بغدادی اور شاہ بیگ لین کے موجودہ محلوں کے آس پاس وہ منڈی واقع تھی

جہاں افریقہ اور حبشہ سے لائے گئے غلاموں کی (جنھیں بالترتیب "شیدی" اور "حبشی" کہا جاتا تھا) خرید و فروخت ہوتی تھی اور ان کی قیمت پانچ روپے سے پانچ سو روپے تک ہوتی تھی۔ قریب ہی گھاس منڈی تھی جہاں مویشیوں کا چارا، گھاس، بنولہ اور ایسی دوسری چیزیں ملتی تھیں۔

آباد پایا۔ اس نے موجودہ لیاری اور گارڈن کے علاقوں میں پھلوں کے باغ اور سبزیوں کے کھیت بھی دیکھے۔

بعد میں یہ شہر کلہوڑوں اور تالپر میروں کے دائرۂ اختیار میں آگیا۔ تالپر سندھ کے آخری دیسی حکمران تھے اور نسلاً بلوچ تھے۔ تالپروں نے سندھ کو سات انتظامی

اہم تاریخیں اور واقعات

۱۷۳۵	کھڑک بندر سے آنے والے تین سو افراد کھارادر اور میٹھادر میں آباد ہوئے۔
۱۷۸۳ تا ۱۸۴۳	سندھ پر تالپر میروں کی حکمرانی۔
۱۹۴۰ کا عشرہ	محراب خان عیسیٰ خان کو کراچی میونسپلٹی میں لیاری کا پہلا نمائندہ منتخب کیا گیا۔
۱۹۴۷	کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین لیاری اور شہر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہوئے۔
۱۹۵۰ کا عشرہ	حکومت نے لیاری کے باشندوں کو شہر کے بیرونی کنارے پر منتقل کرنے کی کوشش کی۔
۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰	لیاری میں پنجابیوں اور پٹھانوں کی آمد۔ بائیں بازو کی تحریکوں نے زور پکڑا۔
۱۹۷۰ کا عشرہ	بنگلہ دیش سے آنے والے بہاری لیاری میں آباد ہوئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں انتخابات جیتے، لیاری میں اکثریت حاصل کی۔
۱۹۷۶	پیپلز پارٹی کی حکومت نے لیاری کے باشندوں کو زمین کے مالکانہ حقوق دیے۔
۱۹۷۲ تا ۱۹۷۷	پیپلز پارٹی کی حکومت کے تحت لیاری میں طبعی ترقی کا بھاری کام۔
۱۹۸۵	غیر جماعتی بنیادوں پر بلدیاتی انتخابات۔
۱۹۸۵ تا حال	نکاس، پانی کی فراہمی اور کچرا اٹھانے کے نظام رفتہ رفتہ ناکارہ ہو گئے۔
۱۹۸۵ تا ۱۹۸۷	جماعت اسلامی کے کونسلروں کی طرف سے طبعی حالات کو بہتر بنانے کی کوششیں۔
۱۹۸۸-۸۹	پیپلز پارٹی کی حکومت کی جانب سے ۳ ملین گیلن یومیہ پانی کی فراہمی کی اسکیم کی منظوری۔ ۱۰۰۰ بے روزگار افراد کو شہری محکموں میں کھپایا گیا۔
۱۹۹۰ تا ۱۹۹۳	پیپلز پارٹی کی حکومت کی برطرفی۔ ترقیاتی کام میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔
۱۹۹۳-۹۴	شہریوں / کمیونٹی تنظیموں نے پانی کی فراہمی اور سینی ٹیشن کے مسئلے پر حکومت سے پیروکاری کے لیے لیاری ایکشن کمیٹی بنائی۔
۱۹۹۳	عبوری حکومت نے ۶ء۳ ملین روپے کی لاگت سے پانی کی فراہمی کی اسکیم منظور کی اور ۹۵۰ رننگ فٹ کی نکاس کی لائن کی منظوری دی۔
۱۹۹۴	پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ قائم ہوئی، جس نے ۶۱۵ ملین روپے کی لاگت سے نکاس کی لائن کی اسکیم منظور کی۔

کراچی بندرگاہ سے برآمد کی جانے والی نمایاں اشیا میں گھی، اون، نیل، کشمش، سن جیت، گوگڑ، گیہوں، نمک لگی مچھلی اور شارک کے پنکھ شامل تھے۔ افیون بھی برآمد کی جانے والی چیزوں میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ بعض برسوں میں تو اس کی مجموعی مالیت کسی بھی دوسری برآمدی شے کی مالیت سے زیادہ ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چین کو برآمد کرنے کے لیے افیون اونٹوں پر لاد کر کراچی لائی جاتی تھی۔ ۱۸۳۷-۳۸ میں کراچی کی بندرگاہ کی تجارت کی مالیت ۲،۱۳۶،۶۲۵ روپے تھی جس میں افیون کی تجارت بھی شامل ہے۔

بھوجو مل جب کراچی آیا تو اس نے بندرگاہ کے آس پاس کے علاقے میں میر بحر (کشتی والے)، جت (گوالے) اور جوکھیو (زراعت پیشہ) قبیلوں کو پہلے سے

اکائیوں میں تقسیم کر رکھا تھا جن میں حیدرآباد سب سے بڑی اکائی تھا۔ انھوں نے سندھ پر ۱۷۸۳ سے ۱۷ فروری ۱۸۴۳ تک حکمرانی کی جب چارلس نیپیئر نے حیدرآباد سے ۱۵ کلومیٹر دور میانی کے مقام پر تالپر فوج کو شکست دے دی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کراچی اصل میں بلوچستان کا حصہ تھا اور اسے بلوچ قبائل کے ہاتھوں سندھی سرداروں کی ہلاکت کے تاوان کے طور پر سندھ کے حکمرانوں کے حوالے کیا گیا تھا۔

۱۵۰ سال پہلے جب انگریز سندھ میں آئے تو پہلے انھوں نے حیدرآباد کو، جو کراچی سے ۱۶۰ کلومیٹر دور واقع ہے، اپنا مستقر بنایا۔ تجارت کا مرکز ایک قریبی مقام ٹھٹہ تھا جو حیدرآباد سے ۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور جہاں انگریزوں نے اپنی پہلی

فیکٹری قائم کی تھی۔ کراچی کو انھوں نے ابتدا میں کوئی اہمیت نہ دی لیکن حیدر آباد کے موسم کو نامناسب پاکر انھوں نے آخر کراچی کارخ کیا۔

کراچی کو ۱۸۴۳ میں سندھ کے ساتھ ہی سلطنت برطانیہ کا حصہ بنادیا گیا تھا۔ کھارادر کے تجارتی علاقے تک پہنچنے کے لیے انگریزوں کو خچروں پر سوار ہو کر وہ دلدلی علاقہ پار کرنا پڑتا جو کیماڑی اور منوڑا کے جزیروں اور نیٹو جیٹی اور نیپیئر مول کے درمیان واقع تھا۔ بعد میں انگریزوں نے نیٹو جیٹی کا پل تعمیر کرایا۔ کراچی بندرگاہ کی تاریخ کے مطابق ۱۸۴۳ سے ۱۸۶۰ تک کا عرصہ اس عمل کا تشکیلی دور تھا جس کے نتیجے میں کراچی کی ایک جدید تجارتی راستے کے طور پر نشوونما ہوئی۔

حیدر آباد کے تاجروں نے (جو بیشتر ہندو تھے) ابتدا میں کراچی منتقل ہونے سے اس بنا پر انکار کیا کہ ان کے خیال میں کراچی ایک غیر ترقی یافتہ مقام تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس بات سے بھی خوف زدہ تھے کہ اگر کراچی ترقی کر کے ایک پوری طرح کار آمد بندرگاہ میں تبدیل ہو گیا تو ان کی تجارت باہر سے آنے والوں سے متاثر ہو جائے گی، اور جب افغانی باشندے کام کی تلاش میں یہاں آئے تو بالکل یہی بات پیش آئی۔ یہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کی بات ہے۔

انگریزوں نے یہاں بہت سی روسی اشیا، خصوصاً کپڑے، کی تجارت کا مشاہدہ کیا۔ روسی اثرات پر روک لگانے کی غرض سے انھوں نے سندھ میں کپاس کی کاشت کو فروغ دیا۔ اس کپاس کو خام مال کے طور پر کراچی سے مانچسٹر کی ٹیکسٹائل ملوں کو بھیجا جاتا تھا۔ جہاں اب ایوان صنعت و تجارت کی عمارت واقع ہے اس کے قریب گودام تعمیر کیے گئے، ریلوے لائن اور سڑکیں بنائی گئیں اور کاٹن کارپوریشن قائم کی گئی۔ سندھ ۱۹۳۷ تک بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ رہا۔ کراچی کی آبادی کپاس کی فصل کے لحاظ سے کم زیادہ ہوتی رہتی تھی۔ جب کپاس کی بوائی یا چنائی کا وقت آتا تو مزدور پیشہ لوگ دیہی علاقوں کو لوٹ جاتے۔

انگریزوں کے زیرِ انتظام کراچی کی بندرگاہ کی تعمیر کے دوران مزدوروں میں بمبئی سے آنے والے مہاراشٹرین (جو بندرگاہوں کی تعمیرات میں مہارت رکھنے کے لیے مشہور تھے) اور بمبئی ہی کے مارواڑی شامل تھے، لیکن بعد میں افغانیوں، لاسیوں اور ایرانی بلوچوں نے ان کی جگہ لے لی۔ ایرانی بلوچ کام کی تلاش میں کوئلے کے گوداموں کے آس پاس بس گئے۔ افغانی لیاری کے موسیٰ لین اور جونا کمہار واڑا کے علاقوں میں مقیم ہوئے۔ اب وہ فارسی کے علاوہ بلوچی اور سندھی بھی بولتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی خوبی سے خود کو دوسری برادریوں کے ساتھ جوڑ لیا ہے۔

انگریز فوج نے کچھی کمہاروں کو لیاری کے مضافات، یعنی موجودہ جامع کلاتھ مارکیٹ، سے اٹھا کر لی مارکیٹ سے متصل جونا (پرانا) کمہار واڑا میں منتقل کر دیا۔ یہ کمہار مٹی کے برتن بناتے اور شہر بھر کو مہیا کرتے تھے۔ جب لی مارکیٹ کے علاقے کو ترقی ہوئی تو ان کمہاروں کو ایک بار پھر اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور اس بار وہ اس علاقے میں جا کر آباد ہوئے جسے آج کل نیو کمہار واڑا کہا جاتا ہے۔ ان کو اپنے پیشے کی جگہ اور بھٹیوں سے محروم ہونے کے معاوضے کے طور پر نئے علاقے میں بڑے رہائشی پلاٹ دیے گئے۔ بعد میں اس آبادی کو باضابطہ درجہ دے کر زمین کے قانونی حقوق دے دیے گئے۔ نتیجہ یہ کہ یہ کمہار اب اپنے اردگرد آباد دوسری برادریوں کے مقابلے میں نسبتاً خوشحال ہیں۔

کے پی ٹی کو انگریزوں نے ۱۸۸۶ میں قائم کیا تھا۔ اس وقت تک کراچی اتنا پھیل چکا تھا کہ اس میں ۲۸ میونسپل حلقے تھے جن میں لیاری سب سے بڑا حلقہ تھا جس کی آبادی ۲۴۰۰۰ تھی۔ دوسرے حلقوں میں زیادہ سے زیادہ ۸۰۰۰ کی آبادی تھی۔ کراچی کی کل آبادی اس وقت ۸۷۰۰۰ تھی جو ۴۷ مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہر علاقے سے ایک میونسپل نمائندے کا انتخاب انگریز اور پارسی کرتے تھے۔ تاہم لیاری سے لیے جانے والے ممبر کا میونسپل کونسل میں ووٹ نہیں ہوتا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز کے قریب بمبئی کی ایک اور برادری، جسے بھیے کہا جاتا تھا، کراچی کی میونسپلٹی، پولیس، سڑکوں اور بجلی کے محکموں میں شامل ہوئی اور یہ لوگ بھی لیاری کے آس پاس آباد ہوئے۔

۱۹۳۶ تک لیاری سے انگریزی، گجراتی (کچھی میمنوں، خوجوں اور بوہریوں کی زبان) اور اردو میں اخبارات شائع ہونے لگے تھے۔ ۱۹۴۰ میں محراب خان عیسیٰ خان میونسپل کونسل میں لیاری کے پہلے منتخب نمائندے بنے۔ آج کل لیاری کی ایک سڑک ان کے نام سے منسوب ہے۔

۱۹۴۶ میں ہندوستان کے مشرقی صوبہ بہار میں ہندو مسلم فسادات کے بعد وہاں کے مسلمان بھی کراچی آئے اور لیاری کے قریب اس مقام پر آباد ہوئے جسے اب بہار کالونی کہا جاتا ہے۔ اس وقت علاقے میں محض ایک یاد وا سکول تھے۔ اب تک یہاں آباد ہونے والے لوگوں میں بیشتر تعمیراتی کام اور سامان کی نقل و حمل کے لیے مزدوروں کے طور پر کام کرتے تھے۔ یہاں مویشیوں کے باڑے اور بکریوں اور اونٹوں کی خرید و فروخت کی دو منڈیاں تھیں اور ایندھن کے طور پر کام آنے والی لکڑی کی منڈی بھی تھی۔

شہر میں بڑے تجارتی مفادات رکھنے والے ہندو تاجر ابتدا میں کراچی کو ایک تجارتی مرکز کے طور پر ترقی دینے کے خلاف تھے۔ ان کی جڑیں حیدر آباد اور ٹھٹہ میں تھیں۔ انھوں نے لیاری کی مسلمان اکثریت کی آبادی کو مادی انفراسٹرکچر اور تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور اس پورے علاقے کو کچی آبادی یا پسماندہ محلے کے طور پر دیکھتے رہے۔ علاقے میں کہیں نکاس کی نالیاں یا عوامی بیت الخلا موجود نہیں تھے۔ ہیضہ اور آنتوں کی بیماریاں عام تھیں۔

محمد اسمٰعیل بی اے لیاری سے تعلق رکھنے والے پہلے شخص تھے جنھوں نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔ وہ اس تعلیمی قابلیت پر فخر کا اظہار کرنے کے لیے اپنے نام کے ساتھ "بی اے" کا لقب اپنے خاندانی نام کی جگہ استعمال کرتے تھے۔ بعد میں انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اب تک گل محمد لین میں رہتے ہیں۔ علاقے کے ایک اور مسلمان باشندے غلام محمد نورالدین نے ماسٹرز تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۰ میں ایک اسکول قائم کیا۔ انھوں نے آگے چل کر لیاری کے رہنے والوں کو شہر کے دوسرے علاقے میں منتقل کرنے کے منصوبے کی مزاحمت کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۴۷ میں برصغیر کی تقسیم کے بعد کراچی نئے ملک کا دارالحکومت بنا۔ ہندوستان سے بڑی تعداد میں مسلمانوں کی آمد کے باعث حکومت کو ان مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل سے نمٹنا پڑا۔ لیاری کی ترقی کو اس دور میں ترجیح حاصل نہ تھی چنانچہ وہ شہری منصوبہ سازوں کے لحاظ سے پس منظر میں چلا گیا۔

ہندو تاجروں کی جگہ ریاست جوناگڑھ، کاٹھیاواڑ (گجرات)، کچھ اور بمبئی سے آنے والے مسلمان تاجروں — میمنوں، خوجوں اور بوہریوں — نے لی اور انھوں نے لیاری کے تجارتی علاقے کے اردگرد کھارادر، میٹھادر اور کھڈہ کے علاقوں میں رہائش اختیار کی۔ کھارادر اور میٹھادر کے محلے اب مادی انفراسٹرکچر کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ ہیں اور دوسرے محلوں کی نسبت زیادہ خوشحال بھی۔

سیٹھ عبداللہ ہارون کا شیعہ مسلمان خاندان بھی لیاری میں رہا کرتا تھا۔ وہ خود ایک تاجر اور مخیر شخص تھے۔ ان کے والد مہاراشٹر کے شہر پونا سے ۱۸۵۸ میں کراچی ایک مختصر تجارتی دورے کے لیے آئے تھے لیکن پھر انھوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ عبداللہ ہارون نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور اس کے بعد انھیں اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کیا گیا، لیکن انھیں ۱۸۸۷ میں روزی کمانے کے لیے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک اخبار فروش کی حیثیت سے کیا، پھر کھارادر کے جوڑیا بازار میں دکان کھولی، اور ۱۹۰۴ تک وہ ایک کامیاب تاجر بن چکے تھے۔ ۱۹۱۰ میں انھوں رنچھوڑ لائن میں جائیداد خریدی اور علاقے میں چند اسکول قائم کیے۔ بعد میں انھوں نے ایک کالج اور ایک یتیم خانے کی بھی بنیاد رکھی۔ ان کی طرف سے ضرورت مند طالب علموں کو تعلیمی وظائف بھی دیے جاتے تھے۔

عبداللہ ہارون کراچی کے شہری معاملات میں شامل تھے اور ۱۹۱۳ میں کراچی میونسپلٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ سیاسی طور پر ہارون خاندان ہمیشہ مسلم لیگ سے وابستہ رہا۔ اس خاندان کے متعدد افراد پاکستان کے قیام کے بعد مختلف حکومتوں میں اہم عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور یہ روایت آج بھی قائم ہے۔ ہارون خاندان ۱۹۷۷ تک لیاری کے علاقے میں مقیم رہا۔

۱۹۵۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں، جب ملک میں پہلی مارشل لا حکومت قائم ہوئی، لیاری سے — جو اب مادی انفراسٹرکچر کے نہ ہونے کے باعث ایک نہایت پسماندہ علاقہ بن چکا تھا — یہاں کے باشندوں کو اٹھا کر نیو کراچی منتقل کرنے کی ایک بار کوشش کی گئی تاکہ شہر کے تجارتی مرکز کے نزدیک واقع اس علاقے کو متمول لوگوں کے رہائشی محلے میں تبدیل کیا جا سکے۔ لیاری کو جائیداد کے اعتبار سے بہت قیمتی علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کوشش کی غلام محمد نورالدین جیسے لوگوں نے مزاحمت کی۔

غلام محمد نورالدین نے، جو لیاری کے چند پڑھے لکھے لوگوں میں سے تھے، اپنی عملی زندگی کراچی میونسپل کارپوریشن (KMC) میں شروع کی تھی۔ بعد میں وہ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA) کے ڈائرکٹر اور بورڈ کے رکن بھی بنے۔ غلام محمد نورالدین لیاری میں اربن ڈویلپمنٹ پروجیکٹ کے قیام کے بھی ذمہ دار تھے۔ انھوں نے نوکر شاہی اور منصوبہ سازوں کے، جو لیاری کو ایک پسماندہ محلّہ اور شہر کے چہرے پر ایک بدنما داغ سمجھتے تھے، اس فیصلے کو منسوخ کرانے میں اہم کردار ادا کیا جس کے تحت لیاری کے باشندوں کو شہر کے مضافات میں منتقل کیا جانا تھا۔ ان دنوں شہر کے کمشنر روئیداد خان بھی کے ڈی اے بورڈ کے رکن تھے۔ جب حکومت نے لیاری کے باشندوں کو یہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تو غلام محمد نورالدین نے اس فیصلے کی مزاحمت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ لیاری کوئی بے ضابطہ پس ماندہ آبادی نہیں بلکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بسا ہوا محلّہ ہے جسے ریگولرائز بھی کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے کھڈہ میں شاہ ولی اللہ روڈ کے آس پاس واقع میمن سوسائٹی کی مثال پیش کی۔ کمشنر نے انھیں اپنی بات کا ثبوت دینے کو کہا۔ کہا جاتا ہے کہ غلام محمد نورالدین نے اس منصوبہ بند علاقے کی ۵۴ تصویریں کھینچیں جہاں بیشتر مکانات کنکریٹ کے بنے

ہوئے تھے، اور اس کے علاوہ جھونپڑیوں کی بھی تصویریں کھینچیں۔ انھوں نے متعدد ایسے پلاٹوں کی نشاندہی کی جو ڈپٹی کمشنر نے لیاری کے باشندوں کو الاٹ کیے تھے اور جہاں مستقل عمارتیں تعمیر کی جاچکی تھیں۔ انھوں نے کمشنر کے علاقے کے دورے کا بھی بندوبست کیا اور آخرکار کمشنر نے اس بات سے اتفاق کیا کہ لیاری کو کوئی پسماندہ آبادی نہیں کہا جاسکتا۔

انھی دنوں بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں - بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (BSO) اور نیشنل عوامی پارٹی (NAP) - کے کارکنوں نے بھی لیاری کے باشندوں کو یہاں سے منتقل کیے جانے کے فیصلے کے خلاف احتجاجی جلسے منعقد کرنا شروع کردیے اور ان جلسوں کی خبریں مقامی اخباروں میں شائع بھی ہوئیں۔ اس سے حکومت پر اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے کافی دباؤ پڑا۔

نوالین کی ایک گلی

غلام محمد نورالدین نے فیصلہ کرنے والوں کے سامنے تصاویر اور اعداد و شمار پیش کیے تاکہ ان کو علم ہو سکے کہ لیاری کے باشندے شہر کی معیشت میں کیا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیاری کے باشندوں نے اپنے بلدیاتی نمائندوں کے ذریعے بھی حکومت پر دباؤ ڈالا اور اسے فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کردیا۔

۱۹۵۰ کی دہائی کے آخری اور ۱۹۶۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شہر میں بہت تیز رفتاری سے صنعتی ترقی ہوئی۔ پنجاب کے میانوالی اور ہری پور ہزارہ ضلعوں کے باشندے اور صوبہ سرحد کے پٹھان بڑی تعداد میں کراچی منتقل ہوئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ دریائے لیاری کے مغربی کنارے پر مرزا آدم خان روڈ اور دھوبی گھاٹ کے علاقے میں رہائش پذیر ہوئے۔

۱۹۶۰ کی دہائی میں جب نئی بستیاں قائم ہوئیں تو تعمیری کام کے زیادہ تر ٹھیکے صوبہ سرحد اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو دیے گئے کیونکہ اس وقت کی حکومت پر ان کا غلبہ تھا۔ ٹھیکیدار اپنے ساتھ پٹھان مزدور یہاں لائے جو جسمانی لحاظ سے طاقتور ہوتے ہیں اور زمین کھودنے کا کام کرنے کے لیے معروف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کم اجرت پر کام کرنے کو تیار تھے اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ٹرانسپورٹ کا شعبہ بھی تیزی سے پٹھانوں کے غلبے میں آتا جا رہا تھا کیونکہ ان میں روایتی طور پر سود خور قرض دہندہ موجود تھے جو ٹیکسیاں اور بسیں خریدنے کے لیے پٹھانوں کو قرض فراہم کرتے تھے۔

اس کے علاوہ پہلے بہار سے اور بعد میں بنگلہ دیش سے آنے والے باشندوں نے ان محلوں میں سکونت اختیار کی جنھیں اب بہار کالونی اور آگرہ تاج کالونی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے تعلیمی پس منظر اور عملی تجربے کی بدولت عموماً سفید کالر والی ملازمتیں حاصل کرلیتے تھے۔ اب ان محلوں میں ملی جلی آبادی نسبتاً امن و امان کے ساتھ رہ رہی ہے۔ بہار کالونی کے اردو بولنے والے تعلیم یافتہ اور نسبتاً خوشحال لوگ، جن میں مشہور جج نورالعارفین اور وکیل قدوس بہاری بھی شامل تھے، اب اس علاقے سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان منتقل ہونے والوں کی جگہ افغانوں، پٹھانوں، پنجابیوں، کچھیوں، میمنوں اور بلوچوں نے لے لی ہے۔

یہ دونوں محلے (بہار کالونی اور آگرہ تاج کالونی) دوسرے محلوں کی نسبت زیادہ مہنگے ہیں کیونکہ ان کی منصوبہ بندی حکومت نے ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی آبادکاری کی غرض سے ۱۹۵۰ کی دہائی میں کی تھی۔ یہاں کی سڑکیں چوڑی ہیں اور یہاں تجارتی سرگرمی بھی زیادہ ہے۔ اب دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کی طبعی حالت بھی خراب ہو چکی ہے، لیکن یہ محلے لسانی اور نسلی بنیاد پر ہونے والے تشدد کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ شیعہ سنی فرقہ وارانہ جھگڑوں کی اطلاعات ملی ہیں۔

۱۹۶۰ کی دہائی تک لیاری میں کوئی بنیادی شہری سہولت موجود نہ تھی۔ اس دہائی کے آخر تک ایوب خان کی مارشل لا حکومت ڈانواڈول ہوچکی تھی۔ ایوب خان کی کابینہ کے سندھ سے تعلق رکھنے والے ایک سابق وزیر ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) قائم کی اور عوام سے "روٹی، کپڑا اور مکان" فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ کراچی میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں کی اکثریت تھی۔ چنانچہ یہاں آباد اصل سندھی باشندوں میں علیحدگی کا احساس تھا اور لیاری کے باشندوں کا خیال تھا کہ حکومت کی ترقیاتی اسکیموں

میں انھیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ کراچی میں اپنا ووٹ بینک قائم کرنے کی غرض سے بھٹو نے لیاری کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار لیاری کے علاقے سے بھاری اکثریت سے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد سے یہ علاقہ مستقل پی پی پی کا گڑھ رہا ہے اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں یہی پارٹی لیاری کے باشندوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

زمین کی قانونی ملکیت کی تاریخ

۱۹۷۶ میں کے ایم سی میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں کہا گیا کہ لیاری کے باشندوں کو ۹۹ سالہ لیز کے ذریعے زمین کی قانونی ملکیت کا حق دیا جائے۔ اس عمل کو کچی آبادیوں کی ریگولرائزیشن کا نام دیا جاتا ہے۔ علاقے کے بیشتر لوگوں نے لیز حاصل کر لی حالانکہ زمین کی قانونی ملکیت کا سوال ان دنوں ان کے لیے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں حکومت سے کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا۔ پی پی پی حکومت نے علاقے میں اپنی سیاسی گرفت مضبوط کرنے کی غرض سے وہاں کے باشندوں کو لیز دی۔

رہائشی سہولتوں اور آبادی کے اعداد و شمار

غیر سرکاری تخمینوں کے مطابق لیاری کی موجودہ آبادی ۱۶ لاکھ ہے جو تقریباً ۴۷ مربع میل رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔

علاقے میں قائم چھوٹی صنعتوں میں پلاسٹک کی مصنوعات، ربڑ کی چپلیں، غبارے اور دستانے بنانے کے کارخانے شامل ہیں۔ یہاں چمڑا رنگنے کے متعدد کارخانے اور مسالے اور دالیں پیک کرنے کے یونٹ، تیل نکالنے کے کارخانے اور مٹی کے برتن بنانے کی کارگاہیں بھی موجود ہیں۔ علاقے کے مرد بیشتر موٹر گراجوں میں کام کرتے ہیں یا بندرگاہ پر سامان ڈھوتے ہیں۔ مقامی باشندوں کی ایک بڑی تعداد اونٹ گاڑیاں اور گدھا گاڑیاں چلاتی ہے جو لیاری کے رہنے والوں کی ملکیت ہیں۔

نوالین

نوالین لیاری کے شمالی حصے میں ضلع شرقی کی سرحد کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہ محلہ کے ایم سی کے یونٹ ۱۷ میں شامل ہے۔ اس کے شمال مغرب میں بکرا پیڑھی (کے ایم سی یونٹ ۱۸)، جنوب مغرب میں کلاکوٹ (کے ایم سی یونٹ ۱۵)، مشرق میں پرانا حاجی کیمپ (کے ایم سی یونٹ ۱۹) اور شمال مشرق میں عثمان آباد (کے ایم سی یونٹ ۳۲) واقع ہیں۔

ضلع جنوبی ۷۴ بلدیاتی انتخابی حلقوں میں منقسم ہے۔ کے ایم سی یونٹ ۱۷ میں نیو کمہار واڑا، عثمان آباد اور کلاکوٹ کا کچھ حصہ، دھوبی گھاٹ، لاسی محلہ اور جت محلہ بھی شامل ہیں۔ ابراہیم چوک سے آزاد ہسپتال چوک تک ۵۰ فٹ چوڑی ایک سڑک ہے جسے محراب خان عیسیٰ خان روڈ کہا جاتا ہے، اور جو نوالین کو کچھی کمہاروں کے محلے کمہار واڑا سے جدا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے نوالین کا نام غریب آباد تھا۔ یہ اس سڑک کے کنارے جسے اب محراب خان عیسیٰ خان روڈ کہا جاتا ہے، جھونپڑیوں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ اس محلے میں ایرانی بلوچستان کے ساحلی علاقوں سے نقل مکانی کر کے آنے والے لوگ آباد ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق گوادر یا دشتیار سے ہے اور یہ جدگل بلوچ کہلاتے ہیں۔ ان کے نمایاں خاندانوں میں واجہ آچر اور واجہ جل بخش کے خاندان شامل ہیں۔ ان خاندانوں کی تیسری اور چوتھی نسلیں اب بھی یہاں رہتی ہیں۔

اس محلے کا نام تبدیل کر کے نوالین اس وقت رکھا گیا جب ایک حادثاتی آگ میں تباہ ہو جانے کے بعد انگریزوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ اب اسے نوالین کہا جاتا ہے ("نوا" بلوچی زبان میں نئے کو کہتے ہیں)۔ غریب آباد سے نوالین کی یہ نام کی تبدیلی ۱۹۷۳ میں سرکاری دستاویزات کا حصہ بنی۔

نوالین میں ۲۴ گلیاں ہیں جن میں سے ہر ایک تقریباً ۶ فٹ چوڑی ہے اور ہر گلی میں اوسطاً ۳۶ مکان ہیں اور پلاٹ کا اوسط سائز ۸۰ مربع گز ہے۔ محلے میں مکانوں کی کل تعداد ۸۸۰ ہے اور آبادی تقریباً دس ہزار ہے۔ علاقے کا اصل رقبہ معلوم نہیں ہے۔

رہائش: نوالین کے بیشتر مکانات دو منزلہ یا سہ منزلہ ہیں۔ ایک مکان میں عموماً چھ یا سات خاندان مشترکہ گھرانے کے اصول پر رہتے ہیں۔ اس طرح ایک مکان میں رہنے والوں میں دادا دادی، ماں باپ، چچا تایا، چچیاں پھوپھیاں اور ان سب کے خاندان شامل ہو سکتے ہیں۔ ۳۵ سے ۸۰ مربع گز تک رقبے کے مکان میں تیس سے چالیس تک افراد کا مقیم ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ چند ایک مکان ۱۲۰ مربع گز کے پلاٹ پر بنے ہوئے ہیں۔ مکانوں میں سے تقریباً نصف باہری حصے پر سیمنٹ یا پلاسٹر سے مبرا ہیں۔

پانی: زیادہ تر باشندوں کے گھروں میں پانی کی براہ راست لائن موجود ہے۔ ۱۹۹۴ کے اختتام کے قریب علاقے میں پانی کی شدید قلت ہوئی۔ ۱۹۹۳ کے آخر اور

نوالین کے اعدادوشمار

- آبادی ۱۰،۰۰۰
- مکانوں کی تعداد ۸۸۰
- مسجدیں ۷
- اسکول کی عمارتیں ۴
- کھیل کی سہولتیں ۸
  - گبول پارک
  - فٹ بال گراؤنڈ
  - لیاری اسپورٹس کمپلیکس
- خاندانوں کی تعداد ۷۰۷
- ۳تا۲۰سال کی عمر کے بچے ۳،۱۵۱
- اسکول جانے والے لڑکے ۱،۲۸۷
- کالج جانے والے لڑکے ۵۷
- اسکول جانے والی لڑکیاں ۸۳۷
- کالج جانے والی لڑکیاں ۱۲
- کل اسکولوں کے طلبا (لڑکے اور لڑکیاں) ۷۰۵
- اسکول نہ جانے والے بچے ۱،۹۵۴
- لڑکوں کے اسکول نہ جانے کی وجوہ:
  - خراب مالی حالات
  - تعلیم میں عدم دلچسپی
  - ہنر سیکھنے کو ترجیح
- لڑکیوں کے اسکول نہ جانے کی وجوہ:
  - خراب مالی حالات
  - پردہ

فراہم کردہ: انجمن اتحاد نوجوانان نوالین

۱۹۹۵ کے شروع تک کے عرصے میں ۳ ملین گیلن یومیہ (MGD) پانی کی فراہمی کی اسکیم تیار کی گئی اور ۳۶ لاکھ روپے کے خرچ سے تعمیر کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت پپری سے آنے والی ۲۴ انچ قطر کی بڑی لائن سے جڑی ہوئی پرانی ۱۸ انچ قطر کی لائن کو تبدیل کر کے اس کی جگہ ۱۸ انچ قطر ہی کی ایک نئی لائن ڈالی گئی جسے ۲۴ انچ قطر کی لائن کے ساتھ جوڑا گیا تاکہ زیادہ پریشر کے ساتھ پانی فراہم کیا جا سکے۔ نوالین کی ۲۴ گلیوں میں پانی کی فراہمی کی اندرونی لائن ڈالنے کا بھی منصوبہ تھا لیکن کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ (KWSB) کو ۲۱ گلیوں میں پانی کے کنکشن فراہم کرنے میں تقریباً دو سال لگے۔ ۱۸ انچ قطر کی لائن کو ڈھائی فٹ گہرائی میں ڈالا گیا جو علاقے کے باشندوں کے خیال سے موزوں گہرائی سے کم ہے اور اس سے مطلوبہ پریشر حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاہم، نئی لائن اب بھی کافی مقدار میں پانی فراہم کر رہی ہے۔

۱۹۹۳ میں کنسرنڈ سٹیزنز ایسوسی ایشن (CCA) کے عوامی مفاد کی چارہ جوئی کے تحت دائر کردہ انسانی حقوق کے مقدمہ نمبر ۹ کے کی سماعت کے دوران پاکستان کی سپریم کورٹ نے حکم جاری کیا کہ لیاری میں فراہم کیے جانے والے پانی کے نمونے حاصل کر کے لیبارٹری میں ان کی آزمائش کی جائے۔ سی سی اے کراچی کے بعض متمول شہریوں کی ایک انجمن ہے جو شہری مسائل پر پورے شہر کے باشندوں کی جانب سے آواز اٹھاتی ہے۔ پانی کی ان آزمائشوں سے معلوم ہوا کہ اس میں ای کولی بیکٹیریا کی آلائش موجود ہے۔ (یہ بیکٹیریا انسانی فضلے میں پایا جاتا ہے۔) سپریم کورٹ کی طرف سے جس کمیشن کو پانی کے نمونے جمع کرنے کا کام سونپا گیا تھا اسے علاقے کا تین بار چکر لگانا پڑا کیونکہ پانی کی لائنیں بالکل خشک پڑی تھیں۔ لیاری کی بیشتر گلیوں کو گندے پانی اور کیچڑ سے آلودہ پایا گیا، اور کہا جاتا ہے کہ یہی پینے کے پانی میں پائی جانے والی آلودگی کی اصل وجہ ہے۔

کمیشن کے ساتھ کے ڈبلیو ایس بی کے جو اہلکار آئے تھے، لیاری کے باشندوں نے ان پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا اور اگر کمیشن میں عام شہری شامل نہ ہوتے اور وہ اپنے دورے کا اصل مقصد واضح نہ کرتے تو اس کا نتیجہ مار پیٹ کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔ انسانی حقوق کا یہ مقدمہ اب بھی زیرِ سماعت ہے۔ تاہم پانی کی آزمائشوں سے حاصل ہونے والی اس معلومات کو نوالین کے باشندوں نے جو انجمن نوجوانانِ نوالین (AINNL) کے رکن ہیں، اس وقت کی نگراں حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کیا تاکہ پانی کی آلودگی کے اصل سبب کو دور کیا جائے جو نکاس کے ازکار رفتہ نظام اور ۱۸ انچ قطر کی پانی کی لائن پر مشتمل ہے۔

ٹرانسپورٹ: پبلک ٹرانسپورٹ، جس میں بسیں، منی بسیں، ٹیکسیاں، رکشا، تانگے، گدھا گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں شامل ہیں، لیاری میں دستیاب ہیں۔ زیادہ تر جوان مردوں کے پاس سائیکلیں ہیں۔ جو لوگ ان سے زیادہ استطاعت رکھتے ہیں ان کے پاس موٹر سائیکلیں اور چند ایک کے پاس کاریں بھی ہیں۔

سڑکیں: عمومی طور پر سڑکوں کی حالت خاصی خراب ہے اور ان میں چھوٹے بڑے گڑھے اور اسپیڈ بریکر پائے جاتے ہیں۔ سڑکوں کی خستہ حالت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گٹر کا پانی اکثر ابل کر سڑکوں پر آ جاتا ہے جس سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ نکاس کے تباہ شدہ نظام کے باعث گندا پانی رس رس

کر سڑک کی کولتار کی تہہ کو اکھاڑ دیتا ہے۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن (KESC)، پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن کارپوریشن (PTC) اور اس قسم کے دوسرے محکموں کا عملہ مرمت اور تبدیلی کے کام کے سلسلے میں سڑکوں کو مسلسل کھودتا رہتا ہے۔ اپنا کام کرنے کے بعد ان محکموں کے لوگ سڑک کو جوں کا توں ٹوٹا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور سڑک کے کھودے ہوئے حصے کی مرمت کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ سڑکوں کی مرمت کا معیار بہت خراب ہے اور اس قسم کی مرمت کا اثر چھ ماہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ بیشتر پتلی سڑکیں ناہموار ہیں۔

محراب خان عیسیٰ خان روڈ پر بارش کے پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں

دائیں ہاتھ پر نوالین کی محراب خان عیسیٰ خان روڈ، بائیں ہاتھ پر نیو کمہار واڑہ

کھلی جگہیں: نوالین میں کھلی جگہیں تقریباً مفقود ہیں، سوائے ۴۰۰ مربع گز کے چھوٹے سے میدان کے جو انجمن نوجوانان نوالین کے دفتر کی عمارت کے اندر واقع ہے۔ انجمن نے حال ہی میں اپنے دفتر سے متصل ایک عوامی استعمال کے لیے مختص کے ایم سی کا پلاٹ (جس کا رقبہ بھی ۴۰۰ مربع گز ہے) اپنی تحویل میں لیا ہے اور دونوں پلاٹوں کے بیچ کی دیوار سرکاری اجازت حاصل کیے بغیر گرا دی ہے۔ انجمن کا ارادہ یہاں ایک لائبریری قائم کرنے کا ہے اور وہ کے ایم سی سے اس پلاٹ کو انجمن کے نام لیز کے ذریعے منتقل کرانا چاہتی ہے۔ انجمن کے عہدے داروں کا دعویٰ ہے کہ یہ پلاٹ عدم توجہی کا شکار تھا اور سماج دشمن عناصر (ہیروئن کے عادی اور جرائم پیشہ افراد) رات کے وقت وہاں جمع ہونے لگے تھے۔ اسے رات کے وقت گدھا گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ انجمن نے یہ مناسب سمجھا کہ اسے اپنی تحویل میں لے لے۔

تفریح اور اجتماعی سہولتیں: نوالین کے قریب گول پارک نامی ایک پارک واقع ہے۔ اس کے برابر میں حکومت کی جانب سے ایک جمنازیم قائم کیا گیا تھا جس میں باکسنگ رنگ، اور ورزش اور جمناسٹک کی نہایت جدید سہولتیں موجود ہیں۔ اسے لیاری کامپلیکس کا نام دیا گیا ہے۔ یہ سہولتیں صرف مردوں کے استعمال کے لیے ہیں کیونکہ مقامی کلچر عورتوں کو اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سہولتیں کے ایم سی نے ۱۹۸۸ء میں اس وقت کی حکومت کے بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے پانچ نکاتی پروگرام کے تحت مہیا کی تھیں۔ ضلع جنوبی کی زونل میونسپل کمیٹی کے چیئرمین اس وقت جمشید احمد خان تھے۔ وہ ایک پٹھان تھے جو غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے جانے والے بلدیاتی انتخابات میں آزاد امیدوار کے طور پر پہلے کونسلر اور پھر چیئرمین منتخب ہوئے تھے۔ علاقے میں عورتوں کے لیے کوئی تفریحی سہولت موجود نہیں ہے۔

مسجدیں: نوالین کے باشندوں نے اپنے علاقے میں سات مسجدیں خود اپنے خرچ پر تعمیر کرائی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ پورے لیاری میں خوبصورت ترین مسجدیں ہیں۔ ان کو اس بات پر بھی فخر ہے کہ انھیں ان مسجدوں کی تعمیر کے سلسلے میں گھر گھر جا کر چندہ اکٹھا نہیں کرنا پڑا بلکہ نوالین کے باشندوں نے نقد عطیات

مسجدوں کی تعمیر کے منتظمین کو خود پہنچائے۔ نوالین میں دو عیدگاہیں بھی ہیں، جو دراصل کھلے میدان ہیں جہاں لوگ عید کی نماز پڑھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست: ضلعی میونسپل آفس جنوبی کا صفائی کا عملہ دن میں ایک بار سڑکوں پر جھاڑو دے کر اور بعض گھروں کے سامنے رکھی لکڑی کی چھوٹی چھوٹی بالٹیوں سے کچرا جمع کر کے ٹوکریوں یا ایک پہیے والی ٹرالیوں میں بھر کر لے جاتا ہے۔ کوڑا فوراً ہی دوبارہ اکٹھا ہو جاتا ہے کیونکہ میونسپلٹی نے گلیوں میں کچرا ڈالنے کے ڈبے نہیں رکھے ہیں۔ یہ سارا کچرا جمع کر کے نوالین کے قریب ہی ایک کچرا گھر میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں سے میونسپلٹی کی گاڑیاں اسے اٹھا کر کچرا پھینکنے کے آخری مقام پر لے جاتی ہیں جو شہر کی حدود کے اندر ہی واقع ہے۔ صفائی کے عملے اور گاڑیوں کی کارکردگی بے قاعدہ ہے۔ گلیوں میں باورچی خانے کے کوڑے کرکٹ، پولی تھین کی تھیلیاں اور گتے کے ڈبے پڑے ہوئے عام دکھائی دیتے ہیں۔ اجتماعی استعمال کے کوڑے دان کہیں نظر نہیں آتے۔

انجمن کے ارکان اور واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے اہلکار پانی کے نمونے پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے

گندے پانی کا نکاس: اکثر گھروں میں فلش سسٹم موجود ہے جو کے ڈبلیو ایس بی کے نکاس کے نظام سے منسلک ہے۔ تاہم نکاس کا بڑا نالہ بہت زیادہ بھر چکا ہے، اس کا کچھ حصہ ٹوٹ پھوٹ بھی چکا ہے اور گلیوں میں نکاس کا پانی کھڑا ہونا ۱۹۹۴ کے آخر تک ایک عام منظر تھا۔ علاقے میں پینے کے پانی کے آلودہ ہونے کا بھی بڑا سبب یہی نکاس کا ناقص نظام تھا۔ جب کے ڈبلیو ایس بی نے نکاس کے نالے سے ابلنے والے گندے پانی کو نکالنے کے لیے ۱۲ انچ قطر کی لائن ڈالی اور ایک علیحدہ ۱۸ انچ کی نکاس کی لائن بھی ڈالی گئی تو صورت حال کچھ بہتر ہو گئی۔ انجمن نوجوانان نوالین کے مطابق یہ ایک وقتی اور ناکافی حل ہے۔ چونکہ لیاری کا پورا علاقہ سطح سمندر سے نیچے واقع ہے، اس لیے گندا پانی محض کشش ثقل کے اثر سے دریائے لیاری میں نہیں گرتا۔ اس کے علاوہ موجودہ پمپ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ پورے لیاری، جوبلی سینما اور لارنس روڈ کے علاقے کے علاوہ عثمان آباد اور گاندھی نگر سے جمع ہونے والے گندے پانی کو سمیٹ سکے۔ اس مسئلے کے مستقل حل کے لیے انجمن نے کے ڈبلیو ایس بی کو تجویز پیش کی ہے کہ نوالین کے لیے ۳۳ انچ قطر کا ایک رائزنگ مین بچھایا جائے اور ایک علیحدہ پمپنگ اسٹیشن قائم کیا جائے۔

گندے پانی اور سوکھے کچرے کے ہر طرف پھیلے ہونے کے باعث لیاری بھر میں مضر صحت ماحول ہے۔ ٹیچرز ریسورس سنٹر (TRC) کی جانب سے کیے گئے ایک سروے میں پتا چلا کہ ۹۶ فیصد مکانوں میں فلش سسٹم موجود ہے لیکن ان میں سے صرف ۷۹ فیصد نکاس کے نظام سے منسلک ہیں۔

گٹر سے ابلتے پانی سے تباہ شدہ سڑک

۱۹۹۳ میں کراچی میں کے ڈبلیو ایس بی، کے ای ایس سی اور پی ٹی سی کی عدم توجہی، بدانتظامی اور شہری سہولتوں کی شکست و ریخت کے خلاف دائر کیے گئے انسانی حقوق کے مقدمے کے سلسلے میں سپریم کورٹ کی طرف سے مقرر کیے جانے والے کمیشن نے لیاری کے بیشتر علاقے کو نکاس کے ٹوٹے پھوٹے نظام سے ابلنے والے پانی میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ اس مقدمے میں اظہار وجوہ کے ایک نوٹس کے جواب میں کے ڈبلیو ایس بی نے بیان دیا: "لیاری کے گنجان آباد اور عدم توجہی کے شکار علاقے کی تاریخ بہت پرانی ہے، اور جب کے ڈبلیو ایس بی نے اپنے قیام کے بعد گندے پانی کے نکاس کی ذمہ داری لی تو اس کے کچھ علاقے میں اجیکٹر کا قدیم نظام رائج تھا۔ غلاظت کی اس صورت حال کے باعث کے ڈبلیو ایس بی نے حکومت پاکستان کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے تحت لیاری کو نکاس کا نظام فراہم کرنے کے لیے ایک اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم میں بڑے اور ثانوی نالے کے علاوہ تین پمپنگ اسٹیشنوں کی تعمیر بھی شامل تھی۔ ان میں

سے دو مکمل ہو چکے ہیں اور چاکی واڑا اور میٹرنی روڈ پر کام کر رہے ہیں اور لیاری کے علاقے کو راحت پہنچا رہے ہیں۔ تاہم یونین کونسل ۳۶ کے علاقے میں قائم لفٹ پمپنگ اسٹیشن جو اسکیم کی تسلی بخش کارکردگی اور گندے پانی کے حتمی نکاس کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے، ابھی تعمیر کیا جانا باقی ہے کیونکہ ناجائز قبضہ کرنے والوں کی عدالتی چارہ جوئی کے باعث اس کا کام رکا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لیاری کا علاقہ بدترین طور پر متاثر ہوتا ہے اور وہاں گٹر ابلتے رہتے ہیں کیونکہ یہ سطح سمندر سے نیچے واقع ہے اور گندا پانی کشش ثقل کے زور پر علاقے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لفٹ اسٹیشن کی تعمیر کے بغیر گندے پانی کے حتمی نکاس میں موثر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کی تعمیر کا کام ۱۹۹۴ کے آخر تک متوقع ہے جس سے علاقے کو نمایاں راحت حاصل ہو گی۔"
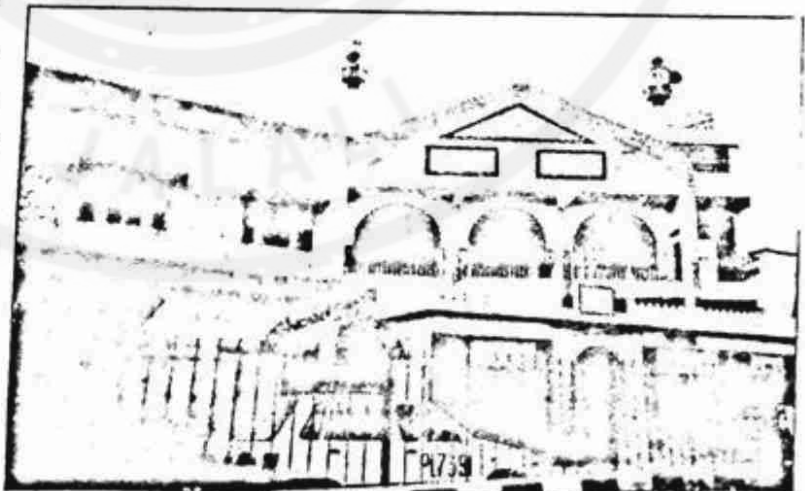
اوپر: لیاری جنرل ہسپتال اور راگی واڑہ کے قریب واقع پارک
درمیان: نوالین کے قریب واقع عید گاہ
نیچے: علاقے کے باشندوں کے چندے سے تعمیر شدہ صادق مسجد

چارے کا گودام

کے ڈبلیو ایس بی نے پانی کی فراہمی اور گندے پانی کے نکاس کی ذمہ داری کے ایم سی سے ۱۹۸۳ میں حاصل کی تھی۔ کے ڈبلیو ایس بی نے عدالت کے سامنے یہ بیان بھی دیا کہ لیاری کے نشیبی علاقے میں نکاس کے پرانے نظام کی بھی نئے سرے سے مرمت کر کے اس میں بہتری پیدا کی جا رہی ہے کیونکہ علاقے کا گندا پانی پوری طرح ٹریٹمنٹ پلانٹ تک نہیں پہنچ پا رہا ہے۔ یہ کام علاقے کے نکاس کے مسائل کا وسط مدتی حل تلاش کرنے کی غرض سے کیا جا رہا ہے۔

اپنے طویل مدتی اقدامات کے پہلے مرحلے میں کے ڈبلیو ایس بی نے لیاری ندی کی تہہ میں نکاس کی بڑی لائن بچھانے کی پیش کش کی جس میں لیاری اور شہر کے دوسرے علاقوں سے گندا پانی جمع کیا جا سکے۔

ماحولیاتی تجزیہ: مکانوں کے اندر اور باہر کی ماحولیاتی حالت خاصی خراب ہے۔ ہر مکان میں اوسطاً ۱۱۵ افراد مشترکہ خاندانی نظام کے تحت رہتے ہیں۔ کمرے چھوٹے چھوٹے ہیں اور ہوا کی آمد و رفت اور کھلی جگہوں کا انتظام نہیں ہے۔

مکانوں کے باہر گلیاں پختہ نہیں ہیں، بڑی سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے فٹ پاتھ خوانچہ فروشوں کے ٹھیلوں اور کھانے پینے کی دکانوں کے علاوہ عام دکانوں کے آگے کو نکلے ہوئے حصوں نے گھیر رکھے ہیں۔ ان دکانوں میں گاڑیاں مرمت کرنے کی چھوٹی دکانیں، ریفریجریٹر مرمت کرنے کی دکانیں، حماموں کی دکانیں، پرچون فروش اور میڈیکل اسٹور، جائیداد کی خرید و فروخت کے ایجنٹ، وڈیو کیسٹوں کی دکانیں اور مٹھائی کی دکانیں شامل ہیں۔ چلنے کے راستے پر گندے پانی کے جمع ہونے کا منظر بہت عام ہے۔

پورا علاقہ عمارتوں اور ٹریفک سے بری طرح بھرا ہوا ہے۔ یہاں نہ کوئی پارک ہے اور نہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے درخت۔ میونسپلٹی کا کہنا ہے کہ اس کے پاس بنیادی سہولتوں یعنی پانی کی فراہمی، گندے پانی کے نکاس اور سوکھے کچرے کے بندوبست وغیرہ کے لیے بھی فنڈز نہیں ہیں۔ لیکن دوسری طرف کے ایم سی نے چوراہوں پر بڑی بڑی یادگاری تعمیرات کرائی ہیں۔ حال ہی میں کے ایم سی کے ضلع جنوبی کے میونسپل آفس کی طرف سے محراب خان عیسیٰ خان روڈ کے شروع میں چوراہے پر کنکریٹ کا بڑا سا ستون اور اس پر عقاب کا مجسمہ تعمیر کرایا جس نے کنکریٹ کے جنگل میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ فضا خصوصاً دن کے وقت دھوئیں اور دوسری آلودگیوں سے بھری رہتی ہے۔

اگر علاقے کے موجودہ پسماندہ رہائشی حالات، مادی انفرا اسٹرکچر اور سہولتوں کی خستہ حالت اور خراب اقتصادی حالات میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحان کو بھی شامل کر لیا جائے تو نہایت مایوس کن تصویر ابھرتی ہے۔ ۱۹۹۵ میں جرائم کے سہ ماہی اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ کلاکوٹ پولیس اسٹیشن کی حدود میں، جن میں نوالین بھی شامل ہے، جرائم کی شرح کراچی بھر میں بغدادی تھانے کے بعد

لیاری میں ایک ٹرک اسٹینڈ

ٹرانسپورٹ کے شعبے میں کام کرنے والے بلوچ

دوسرے نمبر پر رہی۔ پورے لیاری میں چار پولیس اسٹیشن ہیں۔ چوری اور گاڑیاں چھیننے کی وارداتوں کے بعد سب سے زیادہ جرائم منشیات کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جرائم کی اصل شرح رپورٹ کیے ہوئے جرائم سے کم از کم دگنی ہوتی ہے، کیونکہ پولیس کے عمومی دھمکی آمیز اور زور زبردستی کے رویے کے پیش نظرعام لوگ جرائم کی اطلاع دینے میں ہچکچاتے ہیں۔ جرائم کے یہ اعداد وشمار غیر سرکاری طور پر سندھ پولیس سے حاصل کیے گئے ہیں۔

خراب طبعی ماحول اور سماجی اور معاشی حالات کو بہتر بنانے کے مواقع کی عدم موجودگی نے یہاں کے باشندوں کی جسمانی اور ذہنی صحت پر گمبھیر اثرات مرتب کیے ہیں۔ تاہم جسمانی اور ذہنی امراض کی اصل نوعیت اور تعداد اور ہر ہسپتال یا کلینک میں علاج کے لیے آنے والے مریضوں کی تعداد کا تخمینہ لگانا موجودہ تحقیق کے دائرے سے باہر ہے۔

باشندے

لیاری میں رہنے والی برادریوں کا نسلی پس منظر

پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے لوگ لیاری میں اکثریت میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر مکران، قلات اور لس بیلہ ضلعوں کے رہنے والے ہیں۔ دوسری برادریوں میں ایرانی بلوچ، لسبیلہ کے لاسی اور افریقی غلاموں کی نسل سے تعلق رکھنے والے شیدی شامل ہیں۔ مکران کے شیدیوں کو دشتیاری کہا جاتا ہے اور ان لوگوں کی اکثریت بغدادی اور شاہ بیگ لین میں رہتی ہے۔ باقی لوگ پورے لیاری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض ذرائع کے مطابق بلوچوں کا اصل تعلق شام سے ہے۔ ان کی زبان میں بعض عبرانی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ بروہی بلوچوں کی زبان براہوی کی جنوبی ہندوستان اور سری لنکا کی غیر آریائی نسلوں کی دراوڑی زبانوں سے بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

پٹھان ہوٹل کے پہلو میں واقع ایک بلوچ پان شاپ

لاسیوں میں بہت سے قبیلے ہیں مثلاً انگاریہ، بورا، باردیا، مودرا، میڈ، چھٹو، جاموٹ، خاص خیلی، ڈوڈا، سید اور پیر۔ ہر خاندان کے پاس اپنے غلام ہوتے تھے جنھیں گدا کہا جاتا تھا جو یا تو افریقی نسل کے یا ذات باہر لوگ ہوتے تھے۔ یہ ان لوگوں کی اولادیں تھیں جنھوں نے اپنے خاندانوں سے باہر شادیاں کیں اور "درزدگ" کہلائے اور لسبیلہ میں اپنی اصل بستیاں چھوڑ کر لیاری چلے آئے تاکہ سماجی تنہائی اور علیحدگی سے چھٹکارا پا سکیں۔ لاسی یا تو سپاہیوں کے طور پر ملازمت کرتے تھے یا کاریگر یا گلہ بان کے طور پر کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ آج بھی لاسی قبیلے کے لوگ مویشی پالنے اور دودھ دہی وغیرہ بیچنے کے کام میں معروف ہیں۔ میر بحر قبیلہ تقریباً ناپید ہو چکا ہے، صرف چند خاندان کھڈہ مارکیٹ کے پیچھے کے علاقے میں ماری پور

اور کراچی کے ضلع شرقی میں ابراہیم حیدری کی ماہی گیر بستیوں میں پائے جاتے ہیں۔ جو کھیو قبیلہ زیادہ تر ہاکس بے کے قریب اور ضلع شرقی کے علاقے ملیر میں مرکوز ہیں۔ چونکہ شیدی غلام تھے اس لیے اپنے آبائی علاقے سے کوئی رابطہ قائم نہ رکھ سکتے تھے اور ہمیشہ کے لیے یہیں بس گئے۔

لیاری میں رہنے اور بندرگاہ پر کام کرنے والے مزدوروں کی اکثریت پنجابیوں اور پٹھانوں پر مشتمل ہے جبکہ کچھی میمن اور خوجے اب علاقے میں تجارت وغیرہ سنبھالتے ہیں۔ انھوں نے ہندو تاجروں کی جگہ لی ہے جو تقسیم کے وقت لیاری سے چلے گئے تھے۔ بعد میں علاقے میں آنے والی برادریوں کا نسلی پس منظر ذیل کے باکس میں واضح کیا گیا ہے۔

پچھلے برسوں میں کراچی کے دوسرے علاقوں میں بار بار پیش آنے والے نسلی مناقشوں اور ہلاکتوں کے باوجود لیاری میں مختلف نسلی پس منظر رکھنے والے لوگ امن وسکون سے رہتے آئے ہیں۔ یہاں بہت سے ایسے افغانی اور پٹھان ہیں جو روانی سے سندھی اور بلوچی بولتے ہیں؛ اس کے باوجود انھوں نے اپنی الگ نسلی شناخت قائم رکھی ہے۔ مختلف برادریوں کے مابین شادیاں بہت کم ہوتی ہیں۔

بہت کم سماجی تعلقات ہیں۔ مثال کے طور پر مٹی کے برتن بنانے والے کمہاروں اور چٹزار تنگنے والوں کو نچلی ذات کا سمجھا جاتا ہے اور وہ اسی طبقے کی حدود میں رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی بڑی سماجی تبدیلی نہیں آئی۔

ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں

فٹ بال، باکسنگ اور گدھا گاڑیوں کی دوڑ لیاری کے کلچر کا ایک مضبوط حصہ ہے۔ کے ایم سی کے ڈائرکٹر سماجی بہبود کے مطابق قومی فٹ بال ٹیم کے تقریباً ۴۰ فیصد کھلاڑی لیاری ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیاری کی ہر گلی میں کم از کم ایک فٹ بال کلب موجود ہے۔

کیرم اور وڈیو گیمز سڑک کنارے کی تفریحی سرگرمیوں کے طور پر مقبول ہیں۔ فٹ بال کے چند میدانوں کو چھوڑ کر لیاری میں حکومت کی طرف سے فراہم کردہ کوئی تفریحی سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ البتہ حال ہی میں کے ایم سی نے پہلی بار اونٹ گاڑیوں کی دوڑ کا اہتمام کیا جس میں حصہ لینے والے گاڑی بانوں کی بڑی تعداد لیاری سے تعلق رکھتی تھی۔

-	شمالی علاقہ جات	پٹھان اور افغان
-	پنجاب	میانوالی اور ہزارہ سے آنے والے پنجابی۔ یہ لوگ تجارت اور سامان کی نقل وحمل کے کام سے وابستہ ہیں۔
-	ہندوستان	کچھ، جوناگڑھ، پونا اور کاٹھیاواڑ سے آنے والے گجراتی، اور یوپی اور بہار سے اردو بولنے والے لوگ۔ یہ تاجر، کاریگر اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔
-	بنگلہ دیش	بنگالی، جو ماہی گیری کا کام کرتے ہیں۔

نوالین کا محلہ بڑی حد تک ایرانی اور پاکستانی بلوچستان سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہے جو یہاں ۱۸۹۵ سے رہ رہے ہیں۔ دوسری بڑی تعداد (تین سے چار ہزار) کچھی کمہاروں کی ہے۔ اب یہاں کی آبادی مختلف نسلی برادریوں کا آمیزہ ہے۔

گروہوں کے درمیان تعلقات

لیاری میں رہنے والی قدیم برادریاں قبائلی کلچر رکھتی ہیں۔ ان میں تعلیم اور روزگار کے مواقع کی کمی ہے۔ اس علاقے کے آباد ہونے کے بعد سے انھوں نے سماجی اور معاشی اعتبار سے بہت کم ترقی کی ہے۔ یہاں کے بیشتر باشندے لیاری کے باہر کے معاشرے سے کوئی سماجی ربط نہیں رکھتے۔ ان میں اپنی شناخت کا احساس بہت مضبوط ہے اور وہ عموماً اپنے قبیلے اور خاندان ہی میں شادیاں کرتے ہیں۔

لیاری کی حدود کے اندر بھی مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان

عورتیں اکثر اپنے گھروں کی چار دیواری میں رہتی ہیں۔ گھر کے کام کاج کے علاوہ کڑھائی اور سلائی ان کی بڑی سرگرمیاں ہیں۔ ٹی وی اور فلمیں گھروں میں تفریح فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن یہ تعیشات سارے خاندانوں کے پاس نہیں ہیں۔ وہ سرگرمیاں جن میں عورتیں بڑی تعداد میں ایک دوسرے سے مل سکیں شادیاں، جنازے اور کبھی کبھار اجتماعی پکنک یا سیر کے پروگرام ہوتے ہیں۔ موخرالذکر سرگرمیاں کراچی کی خراب امن وامان کی صورت حال کے باعث اب بہت کم رہ گئی ہیں۔

لیاری کا علاقہ اپنے شوخ رنگوں کے باعث ممتاز نظر آتا ہے۔ یہ رنگ مثال کے طور پر عورتوں کے خوب کڑھائی والے لباسوں میں دکھائی دیتے ہیں اور ان گدھا گاڑیوں کی سجاوٹ میں بھی جنھیں لیاری کے مرد چلاتے ہیں۔ گدھا گاڑیوں اور اونٹ گاڑیوں کو بھڑکیلے رنگوں کے نقش و نگار سے سجایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ

اسکوٹروں کو بھی رنگ برنگے بلب اور روشنیاں لگا کر رونق دی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے شہری کلچر کے زور پکڑنے کے باعث عورتوں کی مقامی کپڑے پر ہاتھ کی کڑھائی کی جگہ اب مصنوعی کپڑے پر مشینوں کی کڑھائی لیتی جا رہی ہے۔

تحریری بلوچی زبان لیاری سے مفقود ہو چکی ہے۔ اکثر نوعمر لوگ بلوچی لکھ پڑھ نہیں سکتے اگرچہ وہ اسے بول ضرور سکتے ہیں۔ سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں قومی زبان اردو اور انگریزی پڑھائی جاتی ہیں۔ اگرچہ مقامی زبانوں کی تدریس پر کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن مقامی بولیوں اور زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کو روزگار حاصل کرنے کے سلسلے میں کارآمد نہیں سمجھا جاتا۔

لیاری سیاسی اعتبار سے شہر کے سب سے زیادہ بیدار علاقوں میں سے ایک ہے۔ ۱۹۵۰ اور ۱۹۶۰ کے عشروں میں چلنے والی بائیں بازو کی تحریکوں نے اس علاقے پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ جب روسی ادبی اور سیاسی کتابوں کے اردو ترجمے کراچی میں عام دستیاب ہونے لگے اور نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) اور اس کی طلبا تنظیم کی طرف سے مارکسی نظریے کے بارے میں بحث مباحثے منعقد کیے جانے لگے تو لیاری کے نوجوانوں کو سوشلسٹ فلسفے کی تعلیم پانے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۰ میں جب پیپلز پارٹی نے اپنا سوشلسٹ پروگرام متعارف کرایا تو اسے یہاں زرخیز زمین ملی جسے دوسری پارٹیوں نے تیار کیا تھا۔

حال ہی میں دو کمیونٹی تنظیموں (CBOs) نے ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کی ہے جہاں نوجوان مقامی اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ کرنے جاتے ہیں۔

اقتصادی حالات

روزگار

نوالین میں روزگار کی صورت حال کے بارے میں کوئی حالیہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم غیر رسمی سوال جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ۷۵ فیصد نوجوان بے روزگار ہیں۔ مقامی کمیونٹی تنظیم انجمن نوجوانان نوالین کے کارکنوں میں بھی ۲۰ سے ۴۵ سال تک کی عمر کے بیشتر لوگ روزگار سے محروم ہیں۔ علاقے کی بقیہ مرد آبادی اپنا چھوٹا موٹا کام کرتی ہے۔ جو لوگ ملازم پیشہ ہیں وہ ٹرانسپورٹ کے شعبے میں منی بسیں یا گدھا گاڑیاں وغیرہ چلانے کا کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی پرچون کی دکانیں یا میڈیکل اسٹور وغیرہ ہیں اور کچھ لوگ علاقے کے چھوٹے کارخانوں یا گوداموں میں غیر ہنرمند یا نیم ہنرمند مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ درزیوں کی بھی خاصی تعداد ہے جو زیادہ تر مردوں پر مشتمل ہے۔

سڑک — ہمارے ہیرو کا کھیل

نوعمر لڑکوں میں مقبول ویڈیو گیمز

بلوچی اب رفتہ رفتہ دکانیں، کھانے پینے کی جگہیں، چائے خانے اور چھوٹے ہوٹل کھولنے اور چلانے کی طرف

آرہے ہیں۔ ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط میں، مارشل لا نافذ ہونے سے پہلے، عموماً بلوچی ہی ٹیکسیاں اور بسیں چلاتے تھے۔ لیکن حکومت میں شامل بااثر پنجابی اور پٹھان افراد کی جانب سے سرکاری حوصلہ افزائی کے نتیجے میں پٹھانوں کی بڑی تعداد کے کراچی منتقل ہونے کے بعد بلوچیوں کو اس پیشے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ پٹھان سود خوروں نے ٹیکسیاں اور بسیں خریدنے کے لیے اپنے لوگوں کو قرض فراہم کیا جبکہ بلوچیوں کو اس طرح کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ یہاں کے چند ایک باشندے عمارتوں اور دکانوں کے مالک ہیں جن کو انھوں نے کرائے پر دے رکھا ہے۔ ایک تہائی خاندان ایسے ہیں جن کا کوئی فرد مشرق وسطیٰ یا خلیج کے علاقے میں کام کر رہا ہے اور پورے خاندان کا کفیل ہے۔ عورتیں گھروں سے باہر کام نہیں کرتیں۔

آمدنی

آمدنی کے بارے میں کوئی حالیہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ لوگ عموماً اپنی آمدنی ظاہر کرنے سے ہچکچاتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی سماجی حیثیت کا پتا چل جاتا ہے۔ کسی غیر ہنر مند مزدور کی کم سے کم آمدنی تین ہزار روپے ماہانہ ہے۔

حکومت پاکستان کے لیاری امپرومنٹ پروجیکٹ کے ایک جائزے کے مطابق، جسے ۱۹۷۵ میں ورلڈ بینک کے مشن نے مرتب کیا تھا، "لیاری کی آبادی پندرہ لاکھ سے زیادہ ہے اور بہت سے مختلف آمدنی رکھنے والے طبقوں پر مشتمل ہے لیکن ۷۰ فیصد سے زیادہ گھرانے آمدنی کے اعتبار سے کراچی کے سب سے نچلے ۴۵ فیصد حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔" لیاری میں مقیم ایک ماہر معاشیات عمر لاسی کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۵ کے بعد بھی حالات میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔

صحت

صحت کے مسائل

صحت کے سلسلے میں بھی لیاری کے کوئی حالیہ اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ تاہم لوگوں کا کہنا ہے کہ ۹۴-۱۹۹۰ کے عرصے میں یہاں کے بچوں میں پانی سے پھیلنے والی بیماریاں عام تھیں جس کی وجہ پانی کا آلودہ ہونا تھا۔ ۱۹۹۴ کے آخر میں یہاں پانی کی نئی لائن ڈالی گئی اور تب سے اس قسم کی بیماریوں میں کوئی غیر معمولی اضافہ واقع نہیں ہوا ہے۔ اس سے ملحقہ علاقے مل ایریا میں، جہاں چاول چھڑنے اور پکانے کا تیل اور صابن تیار کرنے کے کارخانے، لوہے اور فولاد کی فیکٹریاں، کپڑے کی چھپائی کے کارخانے اور گودام واقع ہیں، لوگوں میں جلدی بیماریوں اور سانس کی تکلیفوں کا پتا چلا ہے۔

صحت کی سہولتیں

لیاری کے علاقے میں حکومت کی جانب سے فراہم کی گئی صحت کی سہولتوں میں کے ایم سی کے زیر انتظام دو ہسپتال شامل ہیں۔ یہ لیاری جنرل ہسپتال اور سرفراز رفیقی ہسپتال (نیو چالی) ہیں۔ اس کے علاوہ دو زچہ خانے، جان بائی میٹرنٹی ہوم (کھارادر) اور لیاری میٹرنٹی ہوم، بھی کام کر رہے ہیں۔ کھارادر اور موسیٰ لین میں دو ہیلتھ سنٹر ہیں جن کو ایدھی ٹرسٹ چلاتا ہے۔

نوالین میں کوئی سرکاری ہسپتال یا کلینک موجود نہیں ہے۔ تاہم یہاں دو پرائیویٹ ہسپتال، مکران ہسپتال اور ماروی ہسپتال، واقع ہیں۔ ان دونوں ہسپتالوں میں، اور ان کے علاوہ دو پرائیویٹ شفاخانوں میں بھی، خاتون گائنوکولوجسٹ موجود ہیں۔ یہاں تین مقامی ہڈیاں جوڑنے والے اور ہومیوپیتھک شفاخانے بھی موجود ہیں۔

مقامی کیمونٹی تنظیم نے چند سال پہلے یہاں ایک ہیلتھ کلینک شروع کیا تھا لیکن اسے مالی طور پر کامیاب نہ ہونے کے باعث جاری نہ رکھا جا سکا کیونکہ مریضوں سے برائے نام فیس لی جاتی تھی۔ اس

پانی کی آلودگی سے پیدا ہونے والی بیماریاں بچوں میں عام ہیں

فیس سے حاصل ہونے والی رقم ڈاکٹر کو معقول تنخواہ دینے کے لیے کافی نہ تھی (جو کلینک میں باقاعدگی سے نہیں آتا تھا) اور نہ اس رقم سے کلینک کے لیے دوائیں خریدی جاسکتی تھیں۔ اس طرح مریض اکثر ناکام لوٹتے تھے۔

تعلیم

خواندگی کی سطح

ٹیچرز ریسورس سنٹر کی جانب سے ۱۹۹۰ کے عشرے کے شروع میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ لیاری میں ۵ سے ۱۴ برس تک کی عمر کے ۲۷ فیصد بچے باقاعدہ سرکاری اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ نوالین کے بارے میں الگ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ بہت سے بچوں کو اسکول کے اوقات میں گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

لیاری میں رضاکار کمیونٹی تنظیموں اور این جی اوز کی طرف سے بارہ "گلی اسکول" چلائے جارہے ہیں۔ مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بہت سے گھرانے جو اپنے بچوں کو، خاص کر لڑکیوں کو، باقاعدہ اسکولوں میں داخل کرانے کی استطاعت نہیں رکھتے یا اس پر آمادہ نہیں ہیں، انھیں ان غیر رسمی گلی اسکولوں میں بھیج رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی کل تعداد ۲۶۴۶ ہے، یعنی اوسطاً ان میں سے ہر اسکول میں ۲۲۰ بچے داخل ہیں۔ ان میں دی جانے والی تعلیم کی سطح پرائمری سے انٹرمیڈیٹ تک ہے۔ شاگردوں کی سب سے زیادہ تعداد پہلی اور دوسری جماعتوں میں ہے۔ اس سے اوپر کی کلاسوں میں شاگردوں کی تعداد ایک دم کم ہو جاتی ہے۔ ان اسکولوں میں داخل طلبا میں تقریباً ۴۰ فیصد لڑکیاں ہیں۔ یہ تناسب پورے کراچی ڈویژن میں اسکول میں داخل طلبا میں لڑکیوں کے تناسب یعنی ۴۵ فیصد کے مقابلے میں تھوڑا سا کم ہے۔ (دفتر شماریات، حکومت سندھ، ۱۹۸۹)۔

دستیاب سہولتیں

نوالین میں چار سرکاری اسکول ہیں جن میں سے ہر ایک میں دو شفٹوں میں پڑھائی ہوتی ہے۔ دو پرائمری اور دو سیکنڈری شفٹیں لڑکیوں کے لیے ہیں اور دو پرائمری اور ایک سیکنڈری شفٹ لڑکوں کے لیے۔ نوالین میں کوئی کالج یا ہائر سیکنڈری اسکول نہیں ہے۔

لڑکوں کے سیکنڈری اسکول کا درجہ حال ہی میں انٹرمیڈیٹ تک بڑھا دیا گیا۔ انجمن نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ لڑکیوں کے سیکنڈری اسکول کو بھی انٹرمیڈیٹ سائنس کالج بنا دیا جائے۔ پرائیویٹ اسکول علاقے میں موجود نہیں ہیں۔ کے ایم سی نے یہاں دو لائبریریاں قائم کی ہیں۔ نوالین میں خواندگی کے تناسب کے بارے میں حالیہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔

علاقے کے باشندوں کے ترقیاتی اقدامات

لیاری کی کمیونٹی تنظیمیں

لیاری شہر کے سیاسی طور پر سب سے زیادہ باشعور اور بیدار علاقوں میں سے ایک ہے اور یہاں بہت سی کمیونٹی تنظیمیں ہیں۔ ان میں سے تقریباً تمام تنظیموں کی ابتدا اور نشو و نما کے حالات ملتے جلتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے تین یا چار عشرے قبل اسپورٹس اور سماجی سرگرمیوں سے آغاز کیا تھا اور رفتہ رفتہ ترقیاتی سرگرمیوں مثلاً تعلیم، صحت، سینی ٹیشن، پانی کی فراہمی، نکاس، سڑکوں کی تعمیر اور شہری سہولتوں کے بنیادی معاملات میں کل وقتی طور پر حصہ لینے لگیں۔ ان میں سے ایک نمائندہ تنظیم نوالین میں بھی موجود ہے۔ اس تنظیم نے بھی اسپورٹس کی سرگرمیوں سے آغاز کیا او

محراب خان عیسیٰ خان روڈ پر واقع ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول

بعد میں شہری ترقیات سے منسلک معاملات میں دلچسپی لینا شروع کیا۔

انجمن اتحاد نوجوانان نوالین، لیاری

فٹ بال لیاری کا ایک مقبول کھیل ہے اور علاقے میں متعدد فٹ بال کلب موجود ہیں۔ نوالین کے باشندوں نے بھی ۱۹۶۰ کے عشرے کے وسط میں ایک فٹ بال کلب قائم کیا تھا۔ کھلاڑیوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنا اور ثالثی کرانا علاقے کے مردوں کی ایک پسندیدہ اور اہم سرگرمی تھی۔ جس جگہ اب انجمن کا دفتر قائم ہے،

اس کے قریب فٹ پاتھ پر لوگوں کی میٹنگ ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ جگہ معلومات کے تبادلے اور مقامی مسائل مثلاً جوئے کے اڈوں وغیرہ کے بارے میں غیر رسمی گفتگو کا مرکز بن گئی۔ اس کے علاوہ اس سرگرمی میں شامل لوگ شادیوں اور جنازوں کے موقعے پر برتنوں، فرنیچر اور دریوں وغیرہ کا انتظام بھی کرنے لگے۔ ان سرگرمیوں کو علاقے میں "سماجی کام" کا نام دیا جاتا تھا۔

جوں جوں آبادی بڑھی اور مسائل (اسکولوں کی کمی، صحت کی سہولتوں کی نایابی، سڑکوں اور گندے پانی کے نکاس کے مناسب نظام کی غیر موجودگی) میں اضافہ ہوا، یہ میٹنگیں زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کرتی گئیں اور ۱۹۶۸ میں علاقے کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ اس کا انتظام چلانے کے لیے

اوپر: لیاری کے سابق فٹ بال کھلاڑی: عمر اصغر اور عثمان بلوچ
دائیں: انجمن کی مجلس عاملہ: لعل بخش (صدر)، اور الٰہی بخش (جنرل سیکرٹری)
نیچے: نیو کمہار واڑا میں محراب خان عیسیٰ خان روڈ پر واقع انجمن کا دفتر

ایک باقاعدہ ایگزیکٹو کمیٹی قائم ہوئی جس کے عہدے داروں میں وہ لوگ شامل تھے جو فٹ بال کلب میں سرگرم رہے تھے اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے اور جن کو علاقے کے باشندے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

تنظیم کی رکنیت علاقے میں مقیم تمام مردوں کے لیے کھلی تھی۔ ۷۴-۱۹۷۲ کے عرصے میں رکنیت کی فیس دو روپے ماہانہ تھی۔ اس وقت یہ فیس پانچ روپے ماہانہ ہے۔ کسی بھی نسل یا مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص تنظیم کا رکن بن سکتا ہے۔ اس وقت علاقے کے ۳۲۶ خاندان تنظیم کے رکن ہیں۔ شادیوں اور جنازوں وغیرہ میں کھانے اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کے لیے غیر رکن افراد سے زیادہ معاوضہ لیا جاتا ہے۔

تنظیم کی آمدنی کے ذرائع میں رکنیت کی فیس کے علاوہ ہر سال بقر عید کے موقعے پر قربانی کی کھالوں کے ذریعے حاصل ہونے والی دس سے بارہ ہزار روپے کی رقم بھی شامل ہے۔ تنظیم تقریبات کے لیے اپنے دفتر کے ساتھ کی خالی جگہ کرائے پر دیتی ہے (ارکان سے ۱۰۰ روپے اور غیر رکن افراد سے ۳۰۰ روپے کرایہ وصول کیا جاتا ہے)۔ برتنوں کا کرایہ بھی جمع کیا جاتا ہے۔ عورتوں کے لیے ہنر سکھانے کا ایک انڈسٹریل ہوم بھی چلایا جاتا ہے جس میں تربیت حاصل کرنے والی عورتوں سے سلائی اور کڑھائی سکھانے کی ۳۵ روپے ماہانہ فیس وصول کی جاتی ہے۔ ایک ٹیوشن سنٹر بھی طالب علموں سے دس روپے ماہانہ فیس حاصل کر کے چلایا جاتا ہے۔

تنظیم کے ۹۵-۱۹۹۴ کے آڈٹ شدہ حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال اس کی کل آمدنی ۱۹۲،۴۰۷ روپے ہوئی۔ اس میں سے ۸۹،۶۷۵ روپے تنظیم نے ان مدوں کے ذریعے حاصل کیے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، جبکہ ۱۰۲،۷۵۰ روپے یونی سیف نے اعانت کے طور پر فراہم کیے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ آمدنی ٹیوشن سنٹر کی فیسوں سے ہوئی اور اس کے بعد عورتوں کے انڈسٹریل ہوم اور صحت کے مرکز سے۔

اس سال کے کل اخراجات ۱۳۹،۴۴۵ روپے ہوئے۔ سب سے بڑا خرچ ٹیوشن سنٹر کو چلانے اور اس کے استادوں کی تنخواہیں دینے پر ہوا جو ۲۹،۵۰۰ روپے تھا، جبکہ انڈسٹریل ہوم کے انتظام پر ۵،۸۵۴ روپے اور صحت کا مرکز چلانے پر ۳،۸۷۴ روپے کا خرچ آیا۔ باقی رقم انتظامی اخراجات کی مد میں خرچ ہوئی۔ تنظیم کے غیر منقولہ اثاثوں کی کل مالیت ۵،۶۲۹،۷۳۰ روپے ہے جس میں زمین، عمارت، دفتری آلات اور انڈسٹریل ہوم کی مشینیں شامل ہیں۔

وقت کے ساتھ آنے والی تبدیلیاں

تنظیم کو ۱۹۸۸ تک وہی ورکنگ کمیٹی چلاتی رہی جسے شروع میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس عرصے میں تنظیم کے صدر اور جنرل سیکرٹری کے علاقے کی دوسری مقامی تنظیموں سے کے ایم سی کے ایک پلاٹ کے سلسلے میں تنازعہ ہو گیا۔ (اس بارے میں مزید تفصیل سابق صدر محمد یونس کے خاکے میں دی گئی ہے۔) علاقے میں جو سیاسی جماعتیں سرگرم تھیں ان میں سے تنظیم کے عہدے داروں نے خود کو پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ کر لیا اور تنظیم کو پیپلز پارٹی کی حامی تنظیم کے طور پر جانا جانے لگا۔

علاقے کے نوعمر افراد، جن میں سے کچھ کالج میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، کھیل کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تنظیم کے دوسرے پہلوؤں، مثلاً اس کے دائرۂ کار، انتظامی طریق کار اور دوسرے معاملوں میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ تنظیم کے عہدے دار اب ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے اور تنظیم غیر فعال اور علاقے کے حقیقی مسائل سے بے پروا ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تنظیم کو اپنی سرگرمیوں کا دائرہ بڑھانا چاہیے اور علاقے کے باشندوں کو شہری ترقیات سے متعلق جو مسائل در پیش ہیں ان پر توجہ دینی چاہیے۔ ان

بیس برس کے عرصے میں انجمن کی حکمت عملی اور کام میں آنے والی تبدیلیاں

موضوع	۱۹۶۸-۸۸ کا طرز عمل	۱۹۸۸ سے اب تک کا طرز عمل
سرکاری محکموں سے رابطہ	ایک یا دو ارکان فیصلہ کرتے تھے۔	ایگزیکٹو کمیٹی فیصلہ کرتی ہے۔
دوسری تنظیموں سے رابطہ	کچھ نہیں۔	رابطہ قائم ہوا، بحال کیا گیا اور اس میں اضافہ ہوا۔
تعلیم	مختلف کلاسوں کے بچوں کی ایک ساتھ تدریس۔	ہر کلاس کے بچوں کی الگ تدریس۔
مختلف منصوبوں کی ذمہ داری	صدر / جنرل سیکرٹری	مختلف ارکان
دفتر	اکثر بند رہتا تھا۔	ہر روز کھلتا ہے۔
ایگزیکٹو کمیٹی	۱۹۶۸ سے ۱۹۸۸ تک ایک ہی رہی۔	ہر دو سال بعد نئی قیادت۔

نوجوانوں نے تنظیم میں انتخابات کرانے اور ایک نئی ورکنگ کمیٹی کو سامنے لانے کی مہم چلائی۔ اس مہم کی پرانی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور انھوں نے انتخابات کرانے پر آمادگی ظاہر کی۔ ۱۹۸۸ میں انتخابات کرانے کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کی گئی۔ (تنظیم کی قیادت میں تبدیلی کے بارے میں معلومات کے لیے لعل بخش کا خاکہ دیکھیے۔)

انجمن کے کارکن واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے کام کی نگرانی کرتے ہوئے

۱۹۸۸ کے بعد تنظیم کی انتظامی ساخت

۱۹۸۸ کے بعد سے تنظیم کو ایسے افراد چلا رہے ہیں جن کی عمریں ۳۵ اور ۴۰ برس کے درمیان ہیں۔ انتخابات ہر دو سال بعد منعقد ہوتے ہیں۔ فیصلے کرنے کا اختیار ایگزیکٹو کمیٹی کے پاس ہے۔ اس سے علاقے میں سرگرم دوسری مقامی تنظیموں کے بارے میں انجمن کے رویے میں بھی نمایاں تبدیلی آئی ہے اور اب تنازعات کے بجائے یہ تنظیمیں بقائے باہمی اور اچھے تعلقات کے رجحانات رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ منتخب نمائندوں اور شہری محکموں سے بھی بہتر طور پر رابطہ رکھا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۸ کے بعد آنے والی انجمن کی قیادت نے ہر جمعے کو نوالین اور اس کے اردگرد کے علاقے کا دورہ کر کے وہاں کام کرنے والی دوسری تنظیموں کے ساتھ رابطے قائم کرنے کی کوشش کی۔ انجمن کی رکنیت بھی سب کے لیے کھول دی گئی۔

موجودہ ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔ تعلیم، صحت اور آمدنی پیدا کرنے کے مختلف منصوبوں کے انتظام کے لیے انجمن نے تین الگ الگ کمیٹیاں قائم کر رکھی ہیں۔

صدر: غلام اکبر حسین (عمر ۳۸ سال، جدگل بلوچ، نوالین میں ایک ہوٹل چلاتے ہیں۔)

نائب صدر: شاہد حسین (عمر ۲۳ سال، بے روزگار۔ انجمن کے انڈسٹریل ہوم کا انتظام رضاکارانہ طور پر چلاتے ہیں۔ ماضی میں دکان دار اور مزدور کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔)

جنرل سیکرٹری: محمد سلیم (عمر ۲۲ سال۔ دو سال تک نوالین میں یونی سیف کی امداد سے چلنے والے بچہ مزدوری کے انسداد کے ایک پروجیکٹ میں رابطہ کار کی حیثیت سے کام کرتے اور اس کی تنخواہ وصول کرتے رہے۔ فی الحال بے روزگار ہیں۔)

جوائنٹ سیکرٹری: ارشد امین بخش (عمر ۲۰ سال، یونائیٹڈ بینک میں عارضی ملازمت کرتے ہیں۔)

فائنانس سیکرٹری: رسول بخش بجورو (عمر ۲۰ سال، سندھی، ۱۹۷۶ سے پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن میں کام کر رہے ہیں۔ انجمن کی انتخابات، صحت، سینی ٹیشن اور بجلی کی سب کمیٹیوں کے سربراہ ہیں۔)

سوشل سیکرٹری: الٰہی بخش (عمر ۳۳ سال، پاکستان بیڈ ویئر ایسوسی

انجمن کے غیر رسمی اسکول کے چند بچے

ایشن کے دفتر میں بطور کلرک کام کر چکے ہیں۔ پچھلے ایک سال سے بے روزگار ہیں۔)

پریس سیکرٹری: محمد رفیق (عمر ۲۲ سال۔ ڈیکوریشن اور کرائے کے برتنوں کی ایک دکان میں کام کرتے ہیں۔)

اندرونی اور بیرونی امور کے سیکرٹری: محمد امین (حال ہی میں مستعفی ہو کر ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔)

آفس سیکرٹری: عبدالرزاق درویش (عمر ۲۸ سال، بلوچستان وہیلز میں کام کرتے ہیں جو حب انڈسٹریل اسٹیٹ میں قائم ایک فیکٹری ہے۔)

ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان: سرفراز خان، سہیل احمد، جاوید، امان اللہ۔

ایجوکیشن کمیٹی: اللہ بخش بھٹو (عمر ۲۳ سال۔ بلوچ۔ بے روزگار۔)

طریق کار، انتظامی صلاحیتیں، عملی رویے

انجمن کی حکمت عملی کی بنیاد منتخب نمائندوں اور شہری محکموں پر دباؤ ڈال کر انھیں متحرک کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعی مسائل پر علاقے کے باشندوں کا شعور بیدار کرنا اور ان کو مختلف مسائل اور ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کر کے ان کو اجتماعی عمل میں شریک ہونے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ سرکاری محکموں کی جانب سے کیے جانے والے ترقیاتی کام کی نگرانی کی جاتی ہے اور اپنے گروپ اور دوسری تنظیموں یا اداروں کی جانب سے کی جانے والی تحقیق کے نتائج کو علاقے کے اور علاقے سے باہر کے باشندوں تک پہنچایا جاتا ہے۔

۱۹۹۳ کے قومی انتخابات سے پہلے انجمن نے علاقے کے تمام امیدواروں کو ان کی جماعتی وابستگیوں سے بے نیاز ہو کر مدعو کیا تاکہ وہ اپنا پروگرام انجمن کے پلیٹ فارم سے عوام کے سامنے رکھیں۔ تاہم انجمن نے یہ بات امیدواروں پر واضح کر دی کہ انھیں مدعو کرنے کا مطلب ان کی پارٹی یا پروگرام کی تائید کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد صرف علاقے کے لوگوں کو مختلف امیدواروں اور ان کے پروگراموں سے آگاہ کرنا ہے۔ یہ غالباً اس علاقے کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ مقامی تنظیموں نے سیاسی پارٹیوں میں سے کسی کا ساتھ دینے سے انکار کیا اور اس طرح اپنی تنظیم کو غیر سیاسی بنانے کے رجحان کی ابتدا کی۔

انجمن نے شہر کے مختلف اداروں مثلاً ٹیچرز ریسورس سنٹر، آغا خان فاؤنڈیشن کے این جی او ریسورس سنٹر (این جی او آر سی)، اربن ریسورس سنٹر (یو آر سی) اور او پی پی آر ٹی آئی کے ساتھ رابطہ قائم کیا ہے۔ کسی بین الاقوامی ادارے نے ابھی تک انجمن کو براہ راست امداد نہیں دی ہے، سوائے یونی سیف کے ورکنگ چائلڈ لیبر پروگرام کے جس کے تحت انجمن کو دو سال کے لیے اعانت فراہم کی گئی۔

تنظیم کی سرگرمیاں

انجمن علاقے کے باشندوں کو لیاری کے مختلف حصوں سے جمع کیے گئے پینے کے پانی کے نمونوں کی آزمائش کے نتائج سے آگاہ کرنے کے کام میں بہت سرگرم رہی ہے، اور اسی طرح اس نے لیاری ایکسپریس وے اور کراچی ماس ٹرانزٹ پروگرام جیسے منصوبوں پر ہونے والی پیش رفت سے بھی لوگوں کو باخبر رکھا ہے۔ پچھلے سال کے اواخر میں اس نے علاقے کی دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر ایک فورم منعقد کیا جس میں علاقے کے منتخب نمائندوں اور ماہرین کو دعوت دی گئی کہ وہ ماس ٹرانزٹ پروگرام کے منفی اثرات کے بارے میں گفتگو کریں جس پر پی پی پی حکومت کی جانب سے جلد ہی عمل درآمد شروع ہونے والا تھا۔

انجمن آج کل سڑکوں، نکاس کے نالوں اور پانی کی فراہمی کے نظام کی تعمیر کے سلسلے میں اپنی تکنیکی صلاحیت کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ کے ایم سی اور کے ڈبلیو ایس بی کے تکنیکی عملے کے ساتھ برابری کی بنیاد پر بات کر سکے اور ان محکموں کے کیے ہوئے ترقیاتی کام کی موثر نگرانی کر سکے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انجمن نے چند سال پہلے ایک ہیلتھ کلینک بھی شروع کیا تھا لیکن اسے جاری نہ رکھ سکی کیونکہ یہ مالی طور پر قابل عمل نہیں تھا۔ مریضوں سے صرف برائے نام فیس وصول کی جاتی تھی اور اس طرح جمع ہونے والی رقم ڈاکٹر کی تنخواہ ادا کرنے کے لیے ناکافی تھی جو کلینک میں باقاعدگی سے نہیں آتا تھا، اور اس رقم سے کلینک کے لیے دوائیں بھی نہیں خریدی جا سکتی تھیں۔

انجمن کی دوسری سرگرمیوں کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

تعلیمی مرکز: انجمن اپنے دفتر کی عمارت میں ایک غیر رسمی پرائمری اسکول بھی چلاتی ہے۔ یہ دراصل ایک ٹیوشن یا کوچنگ سنٹر ہے جس کا مقصد سرکاری اسکول کی تعلیم میں پائی جانے والی کمی کو پورا کرنا ہے نہ کہ اس کی جگہ لینا۔ سرکاری اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ کمتر معیار کی ہوتی ہے، وہاں پڑھانے والے استاد تربیت یافتہ نہیں ہوتے، ان میں بچوں کے لیے کھیل کود اور تفریح کی سہولتیں نہیں ہوتیں اور پڑھانے کے طریقے فرسودہ ہوتے ہیں۔

انجمن نے نوالین ایجوکیشن پروموشن سنٹر اکتوبر ۱۹۹۲ میں پہلی اور دوسری

جماعت کے ۵۵ طالب علموں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اب ۴ سے ۱۴ سال تک عمر کے ۲۱۰ طالب علم انجمن کے دفتر میں دو شفٹوں میں مونٹیسوری سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ۱۴۲ لڑکیاں اور ۵۹ لڑکے ہیں۔ وہاں چھٹی سے آٹھویں جماعت تک کے طالب علموں کو ٹیوشن بھی دی جاتی ہے۔

انجمن کی پہلی چند سرگرمیوں میں سے ایک یہ تھی کہ حاصل کردہ خالی پلاٹ میں نرسری سے پانچویں جماعت تک کے طالب علموں کے لیے کلاسیں شروع کی گئیں۔ خالی پلاٹ میں پارٹیشن لگا کر مختلف کلاسیں بنائی گئیں۔ ان کلاسوں کا مقصد علاقے کے سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم کی کمی پوری کرنا تھا۔ خاص طور پر سرکاری اسکولوں کے استاد میں اعلیٰ تعلیم اور باقاعدگی کی کمی تھی۔

انجمن کے تعلیمی مرکز میں گیارہ سینئر طلبا اور بے روزگار نوجوان ۲۰۰ طالب علموں کو پڑھاتے ہیں جو سرکاری اسکولوں کے پرائمری اور سیکنڈری درجوں میں داخل ہیں۔ یہ استاد شام پانچ بجے سے پونے سات بجے تک رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ ہر طالب علم سے دس روپے ماہانہ فیس لی جاتی ہے۔ ابتدا میں والدین اپنی لڑکیوں کو تعلیمی مرکز میں بھیجنے میں متذبذب تھے، لیکن اب اسکول کی انتظامیہ پر ان کا اعتماد قائم ہو چکا ہے۔ اس تعلیمی مرکز کے کوآرڈی نیٹر عبدالرحیم ہیں۔

انجمن کے ارکان نے ابتدا میں علاقے کی ایک اور کمیونٹی تنظیم لیاری ایجوکیشن ایڈوائزرز (لیڈز) سے نئے تدریسی طریقوں کی تربیت حاصل کی۔ ان کے مرکز میں پڑھنے والے بچے امتحانوں میں دوسرے بچوں کے مقابلے میں بہتر نتائج حاصل کرتے ہیں۔ تاہم اسکولوں میں مرکز کے اس کردار کو تسلیم نہیں کیا جاتا اگرچہ انجمن نے اس سلسلے میں اسکولوں کے پرنسپلوں سے بات چیت بھی کی ہے۔ انجمن کے ایک سینئر رکن اسلم حیات کہتے ہیں کہ ان کے مرکز میں تین سے پانچ سال تک پڑھنے کے بعد بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ طالب علموں کو مزید تعلیم کے لیے سرکاری اسکولوں میں داخلہ مل جائے گا۔

اپریل ۱۹۹۵ میں انجمن نے لیڈز کی درخواست پر ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن سندھ انوار احمد زئی کے ساتھ ایک میٹنگ کا اہتمام کیا جس میں ان غیر رسمی اسکولوں سے متعلق مسائل پر گفتگو کی گئی۔ انجمن کو اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ ان کے استاد زیادہ عرصے تک رضاکارانہ طور پر پڑھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے کیونکہ انھیں آخر اپنی روزی بھی کمانی ہے۔

انجمن کے مستقبل کے منصوبوں میں اپنی موجودہ دفتر کی جگہ پر ایک ماڈل پرائمری اسکول کا قیام بھی شامل ہے۔ اس اسکول کو مرحلہ وار پری پرائمری سے سیکنڈری اسکول تک ترقی دی جائے گی اور فیسوں کا ایک معقول گوشوارہ مقرر کر کے ہر طالب علم سے ۶۰ تا ۷۰ روپے ماہانہ وصول کیے جائیں گے اور اسکول میں لائبریری، کھیل کی جگہ اور بیت الخلا جیسی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ انجمن کا یہ اسکول سرکاری اسکولوں کو تربیت یافتہ اساتذہ بھی مہیا کرے گا۔ تاہم یہ منصوبہ ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہے۔

نکاس کا نظام: ۱۹۸۷ سے لے کر نوالین کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ نکاس کے تباہ شدہ نظام کے باعث گندا پانی ابل کر گلیوں میں پھیل جاتا ہے۔ اب تک علاقے کے باشندوں اور انجمن نے اس مسئلے کو مقامی شہری محکموں (کے ایم سی اور کے ڈبلیو ایس بی) یا مقامی کونسلر بابو غلام حسین کی صوابدید پر چھوڑے رکھا تھا۔

محراب خان عیسیٰ خان روڈ پر ۸۳-۱۹۸۲ میں نکاس کی لائن ڈالی گئی تھی لیکن یہ ٹھیک طرح کام نہیں کرتی تھی۔ مین ہولوں سے گندا پانی ابل کر گلیوں میں پھیل جاتا تھا۔ جو مین ہول ٹھیک کام نہیں کر رہے تھے ان کے لیے کونسلر نے ایک اوور فلو سسٹم قائم کرادیا تھا۔ یہ معاملہ ۸۶-۱۹۸۵ تک اسی طرح چلتا رہا۔

۸۷-۱۹۸۵ کے دوران بابو غلام حسین کی کوششوں کے نتیجے میں علاقے کو عارضی سہولت حاصل ہوئی۔ یہ کام سیاسی بنیادوں پر کیا گیا کیونکہ بابو غلام حسین مقامی ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم، ترقیاتی کام گھٹیا معیار کا ہوا اور اس کی منصوبہ بندی بھی مناسب طور سے نہیں کی گئی تھی۔ اس نظام نے ۱۹۸۷ میں کام کرنا بند کر دیا۔

انجمن نے خط لکھ کر اور کبھی کبھار میٹنگوں کے ذریعے اس مسئلے کی طرف متعلقہ محکموں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ لیکن ۱۹۹۱ کے آتے آتے انجمن کو احساس ہو گیا کہ پیروکاری کے ان رسمی طریقوں سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو گا۔ سات ماہ تک سرکاری اداروں کے پیچھے متواتر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد ۱۸ انچ کی نکاس کی لائن کی منظوری حاصل ہوئی جس یک لاگت ۳ سے ۴ لاکھ روپے تک تھی۔ اس منصوبے پر دو مرحلوں میں عمل درآمد کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں ۷۵۰ فٹ لمبی پائپ لائن ڈالی گئی اور دوسرے مرحلے میں ۹۵۰ فٹ لمبی۔ یہ منصوبہ اکتوبر ۱۹۹۳ سے جنوری ۱۹۹۴ تک کے عرصے میں مکمل ہوا۔

انجمن کو اس منصوبے کی تکمیل پر بہت فخر ہے کیونکہ یہ کام علاقے میں سرگرم سیاسی پارٹیوں میں سے کسی کی مدد یا شمولیت، یا بیوروکریسی میں کسی قسم کے

تعلقات کے بغیر انجام دیا گیا۔ ایک موقعے پر چیف سیکرٹری کے پی اے نے ان کی ملاقات کرانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بار بار چکر لگانے اور درخواست کرنے پر اس نے ان کی ملاقات کرادی۔

جہاں ایک طرف انجمن نے سرکاری محکموں پر ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے دباؤ ڈالا وہیں اس نے غیر سرکاری شعبے سے اس مقصد سے رابطہ قائم کیا کہ اس بار کام کا معیار تکنیکی طور پر بہتر ہو اور مسئلے کو پائیدار طور پر حل کر سکے۔ تکنیکی رہنمائی کے لیے انجمن نے او پی پی آر ٹی آئی سے رجوع کیا جس نے علاقے کے نکاس کے نظام کا سروے کیا، اس میں درستی کی کچھ سفارشات پیش کیں اور بجٹ کا تخمینہ تیار کیا۔ اس سے انجمن کو مدد ملی کہ وہ سرکاری محکموں سے بات چیت کر سکے اور ان کے کیے ہوئے ترقیاتی کام کی نگرانی کر سکے۔ اس طرح انجمن کے ارکان اس تکنیکی زبان سے بھی واقف ہو گئے جو انجینئر استعمال کرتے تھے۔ اس سے پہلے یہی انجینئر علاقے کے باشندوں کی دی ہوئی عملی تجویزوں کو یہ کہہ کر رد کر دیتے تھے کہ وہ لوگ ان تکنیکی معاملوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس سے ترقیاتی کام میں لوگوں کی شمولیت کی حوصلہ شکنی ہوتی اور پورے تعمیراتی عمل پر اور محکمے کے عملے کی نااہلی پر پردہ پڑا رہتا۔

لیکن اس بار مقامی تنظیم کے عہدہ داروں نے تفصیلی میٹنگیں کیں اور کے ڈبلیو ایس بی کے ایگزیکٹو انجینئروں اور تعمیراتی کام کے ٹھیکے داروں سے متواتر رابطہ قائم رکھا اور اس کام کی نگرانی کے کام میں مقامی کارکنوں کو شریک کیا۔ کے ڈبلیو ایس بی کے اس وقت کے چیف انجینئر آپریشن اینڈ مینٹے ننس اورنگی میں ایشیائی ترقیاتی بینک کی مالی اعانت سے چلنے والے ایک منصوبے کے دوران او پی پی آر ٹی آئی کے کام سے واقف رہے تھے۔ او پی پی آر ٹی آئی کی مدد سے اورنگی کے باشندوں نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر ۷ ہزار گلیوں میں نکاس کا نظام خود تعمیر کیا ہے۔ اس لیے چیف انجینئر نوالین کے کارکنوں کے اپنائے ہوئے طریقے سے ہمدردی رکھتے تھے۔

انجمن نے او پی پی آر ٹی آئی کی تکنیکی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعمیراتی کام کی نگرانی کی۔ کارکنوں نے کھدائی کی گہرائی ناپی، اور مین ہول کے فرش اور پلاسٹر کے معیار کا جائزہ لیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے کے ڈبلیو ایس بی کے انجینئر ڈھلان، گریڈیئنٹ اور کشش ثقل جیسی تکنیکی اصطلاحات استعمال کر کے ان کو کنفیوز کر دیتے تھے۔

پانی کی فراہمی: ۱۹۹۳ میں صورت حال یہ تھی کہ نصف سے زیادہ لیاری پانی سے محروم تھا۔ پینے کے پانی کی فراہمی اور گندے پانی کے نکاس کے دوہرے مسئلے سے نمٹنے کے لیے لیاری میں کام کرنے والی تمام مقامی تنظیموں کی ایک ایکشن کمیٹی قائم کی گئی۔ انجمن نے اس کمیٹی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ سیاسی عناصر ہڑتالیں اور مظاہرے کرنے پر زور دے رہے تھے لیکن مقامی تنظیموں کے سماجی کارکنوں نے انھیں محاذ آرائی سے گریز کر کے مسئلے کو متعلقہ محکموں سے بات چیت اور نگرانی کے ذریعے سلجھانے پر قائل کر لیا۔

ایکشن کمیٹی نے لیاری کے مختلف علاقوں میں مسائل کی نوعیت اور شدت کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ انھیں معلوم ہوا کہ بغدادی، کلری اور آٹھ چوک میں پینے کے پانی کی قلت اور سنگھولین، نوالین اور میوہ شاہ میں نکاس کا ٹوٹا ہوا انتظام بڑا مسئلہ ہے۔ کمیٹی نے ضلع کے ڈپٹی کمشنر واجد رانا کے ساتھ ایک میٹنگ کا بندوبست کیا تاکہ ان کو صورت حال سے آگاہ کیا جا سکے۔ تقریباً اسی وقت انجمن نے لیاری سے باہر کی این جی اوز، مثلاً یو آر سی اور این جی او آر سی، سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا۔ یو آر سی کے ذریعے ان کو علاقے کے پینے کے نمونوں کی آزمائش کی رپورٹ حاصل ہوئی۔ اس آزمائش کے نتائج سے پتا چلا کہ لیاری کے پینے کے پانی میں انسانی فضلے کی آمیزش ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، شہر کے تمام علاقوں سے پینے کے پانی کے نمونے لے کر ان کی آزمائش کرانے کا کام شہریوں کے ایک کمیشن نے سپریم کورٹ کی ہدایت پر کرایا تھا جہاں ۱۹۹۳ کے اوائل میں سی سی اے کی جانب سے عوامی حقوق کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ انجمن نے صوبائی حکومت کے چیف سیکرٹری کو خط لکھا جس میں انھیں اطلاع دی کہ وہ پینے کے پانی میں اس آمیزش کے سلسلے میں سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس خط کے دباؤ سے مجبور ہو کر چیف سیکرٹری نے فوراً علاقے کا دورہ کیا۔ انھوں نے کے ڈبلیو ایس بی کو نکاس کی لائن تبدیل کرنے کے لیے سروے کرنے اور تخمینہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ کے ڈبلیو ایس بی نے اس حکم پر عمل کیا۔

انجمن کی سات ماہ کی جدوجہد کے بعد پینے کے پانی کی فراہمی کی ایک اسکیم کی منظوری حاصل ہوئی جس کی لاگت ۲ء۳ ملین روپے تھی۔ ایک ۱۸ انچ قطر کی لائن مرزا آدم خان روڈ سے نوالین تک بچھائی گئی۔ اس لائن نے اب (اگست ۱۹۹۴) تک کام شروع نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی چیف سیکرٹری کے نام یادداشتیں لکھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا اور انھیں بار بار یاددہانی کرائی گئی کہ علاقے میں پینے کا خراب پانی مہیا کیا جا رہا ہے۔ چیف سیکرٹری کے حکم پر کے ڈبلیو ایس بی کی جانب سے اسکیم کی منظوری کو حکومت کی غیر جانبداری پر محمول کیا جا سکتا ہے جس کے تحت علاقے کے

باشندوں کی درخواست کو ان کی سیاسی وابستگی سے قطع نظر ان کے بنیادی حق کے طور پر دیکھا گیا۔

سڑکوں کی تعمیر: نگرانی کی عدم موجودگی میں ہونے والے ترقیاتی کام کے ناقص معیار اور عوامی سرمائے کے ضیاع کا شعور رکھنے کے باعث انجمن نے حال ہی میں ہونے والے محراب خان عیسیٰ خان روڈ کی تعمیر کے کام کی موثر نگرانی کی۔ اس بات کو بھانپ کر کہ سڑک کی تعمیر کے ڈیزائن میں بارش کے پانی کے نکاس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی، انجمن نے مداخلت کر کے کام رکوادیا۔ اس وقت تک ٹھیکیدار پوری سڑک پر روڑی بچھوا چکا تھا۔ کارکنوں نے سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور لیاری سے منتخب ہونے والے رکن نبیل گبول سے رجوع کیا جن سے انجمن کا خاصا اچھا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ گبول نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے کے ڈبلیو ایس بی کی انتظامیہ کو اس بات پر قائل کر لیا کہ سڑک کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے بارش کے پانی کے نکاس کے نظام کی منظوری دی جائے۔ یہ مداخلت گاڑیاں چلانے والے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے لیے زحمت کا سبب بنی اور وہ انجمن پر زور ڈالنے لگے کہ کام جلد مکمل کیا جائے۔ انجمن نے کے ایم سی کے ٹھیکیدار سے بات کر کے سڑک پر سے روڑی ہٹوادی تاکہ بارش کے پانی کے نکاس کا نظام پہلے مکمل کیا جاسکے۔ یہ کام ابھی ہونا باقی ہے۔ انجمن کے کارکن او پی پی آر ٹی آئی سے بھی رابطے میں ہیں اور ان سے سڑک کی تعمیر کے تکنیکی پہلوؤں کی واقفیت حاصل کر رہے ہیں تاکہ تعمیر کے کام کی موثر نگرانی کر سکیں۔

رکن قومی اسمبلی نبیل گبول نے کارکنوں کے ساتھ ایک میٹنگ کے دوران یہ تبصرہ کیا کہ عموماً کمیونٹی تنظیمیں ان کے پاس اس وقت آتی ہیں جب انھیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے، لیکن انجمن پہلی تنظیم ہے جو نہ صرف مسائل کا حل سامنے لاتی ہے بلکہ سرکاری کام میں پائے جانے والے نقائص کی نشان دہی بھی کرتی ہے۔

لیاری گرلز کالج: انجمن نے لیاری میں لڑکیوں کے لیے ایک کالج کے قیام کے لیے کوششیں شروع کیں۔ انھوں نے صوبائی حکومت کو درخواستیں بھیجیں اور ایک مقامی رکن صوبائی اسمبلی حنیف سولجر کے توسط سے وزیر اعلیٰ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ وزیر اعلیٰ نے رکن اسمبلی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ اگر انجمن صوبائی حکومت کی حمایت میں علاقے کے کم از کم دس ہزار افراد کا جلسہ منعقد کرے تو انھیں گرلز کالج کے لیے اس سے زیادہ امداد ملے گی جتنی وہ مانگ رہے ہیں۔ انجمن اس

لیاری کا ایک سرکاری کالج

پر رضامند نہ ہوئی اور اس خیال سے کہ کہیں وزیر اعلیٰ، جو اپنی منتقم مزاجی کے لیے معروف تھا، مشتعل نہ ہو جائے، اس نے اس مسئلے پر اپنی کوششیں ترک کر دیں۔

لیاری ڈگری کالج میں کمرشل انسٹی ٹیوٹ: انجمن نے سوچا کہ علاقے کے نوجوان افراد کو روزگار کے بہتر مواقع حاصل کرنے کے لیے تازہ ترین ٹیکنالوجی، مثلاً کمپیوٹر اور جدید کاروباری طریقوں میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ انجمن کی خواہش تھی کہ لیاری ڈگری کالج میں کامرس اور کمپیوٹر کا ایک ڈپلوما کورس شروع کیا جائے۔ ۱۹۹۰ میں اس نے رکن صوبائی اسمبلی حنیف سولجر سے رابطہ قائم کر کے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کالج کے پرنسپل سے ایک خط پر دستخط کرائے جس کا متن انجمن نے تیار کیا تھا اور جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کالج میں یہ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی اجازت دے۔ پرنسپل کو اس خط پر دستخط کرنے میں کئی وجوہ سے تامل تھا۔ کالج کے پرنسپل یہ اختیار نہیں رکھتے کہ اپنے طور پر اس قسم کا فیصلہ کر سکیں، اور سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے وہ وزارت تعلیم کے اعلیٰ اہلکاروں یا وزیر اعلیٰ کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ تاہم صوبائی حکومت نے کالج میں ڈپلوما کلاسیں شروع کرنے پر آمادگی کا اعلان کیا لیکن چیف سیکرٹری نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

رکن صوبائی اسمبلی حنیف سولجر نے ایک بار پھر مدد کی اور صوبائی کابینہ میں حکومت کی برتر شراکت دار پارٹی ایم کیو ایم کے نمائندہ وزیر افضال منیف سے سفارش کی۔ افضال منیف نے اس بنا پر آمادگی کا اظہار کیا کہ انسٹی ٹیوٹ کے لیے آلات کی

فراہمی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری حکومت کی ہوگی جبکہ باقی تمام انتظامات انجمن کو کرنے ہوں گے۔ اب ان مضامین کی ڈپلوما کلاسیں کالج میں شروع ہو چکی ہیں۔

انجمن کی جانب سے انجام دی جانے والی دیگر سرگرمیوں میں عورتوں کے لیے ایک انڈسٹریل ہوم کا انتظام اور تعلیمی پروگرام کے تحت بچوں کے لیے ایک ٹیوشن سنٹر کا بندوبست شامل ہیں۔ ان کے ایجنڈا میں لیاری ڈگری کالج کا درجہ بڑھوانا بھی شامل ہے۔

بیرونی مداخلت

گزشتہ چھ برسوں میں انجمن نے ایک جانب سیاست دانوں، سرکاری افسروں اور شہر محکموں کے ساتھ رابطے برقرار رکھے ہیں اور دوسری طرف غیر سرکاری تنظیموں سے بھی اپنا تعلق قائم کیا ہے۔

صوبائی حکومت

سیاست دانوں میں خاص طور پر لیاری سے منتخب ہونے والے نوجوان رکن صوبائی اسمبلی نبیل گبول کے ساتھ انجمن نے خاصے اچھے تعلقات قائم کیے ہیں۔ انجمن کو ان تک بخوبی رسائی حاصل ہے اور انھوں نے انجمن کی نشان دہی پر شہری محکموں میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سرکاری ترقیاتی منصوبوں میں تبدیلیاں بھی کرائی ہیں۔ اس مداخلت کے نتیجے میں کے ڈبلیو ایس بی نے نوالین میں بارش کے پانی کے نکاس کے نظام کی منظوری دی۔ نبیل گبول نے کے ڈبلیو ایس بی کو اس پر بھی مجبور کیا کہ وہ علاقے کے لیے اپنی تمام موجودہ اور مستقبل کے منصوبوں کی نگرانی کے کام میں انجمن کو شامل رکھے۔ سابق اسمبلی کے ایک اور رکن حنیف سولجر نے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، لیاری ڈگری کالج میں ڈپلوما کلاسیں شروع کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ترقیاتی اسکیمیں: ترقیاتی اسکیموں کے سلسلے میں حکومت اور علاقے کے باشندوں کے درمیان براہ راست صلاح مشورے، رابطے اور شراکت کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ تمام ترقیاتی کام، تصور اور ڈیزائن سے لے کر منصوبہ بندی اور عمل درآمد تک، کے ایم سی کے اہلکاروں اور کونسل کے ارکان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ کام کو ٹھیکے پر دینے کے فیصلے بھی کونسلروں اور افسروں پر مشتمل کمیٹیاں کرتی ہیں۔ عموماً کسی مخصوص ٹھیکے دار کو کام سونپنے کے فیصلے اقربا پروری اور رشوت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ مروجہ طریق کار یہ ہے کہ کونسلر اپنے علاقے کی بنیادی ترقیاتی ضروریات کے ایم سی کے ایڈمنسٹریٹر کے سامنے پیش کرتے ہیں جو کسی اسکیم کو منظور کرنے کا مجاز ہے۔ کے ایم سی کونسل ترقیاتی اسکیموں کے لیے بجٹ کی منظوری دیتی ہے۔

۱۹۷۰ کے عشرے سے پہلے یہ علاقہ نکاس کے زیرزمین نظام سے محروم تھا۔ سوک پٹ، مشترکہ بیت الخلا اور پھر مکانوں کے اندر الگ الگ بیت الخلا لوگوں نے اپنے طور پر تعمیر کرائے۔ گندگی کے نکاس کے لیے کھلے نالے استعمال کیے جاتے تھے۔ پانی کی فراہمی دو اجتماعی نلکوں سے ہوتی تھی جو حکومت نے لیاری سے گزرنے والی پانی کی لائن میں نصب کیے تھے۔

۱۹۷۰ کے عشرے میں لیاری کی تاریخ میں پہلی بار یہاں بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام انجام دیے گئے۔ پیپلز پارٹی کے پہلے دور حکومت میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لیاری کے ترقیاتی منصوبوں میں ذاتی دلچسپی لی کیونکہ یہ علاقہ پی پی پی کا مضبوط گڑھ تھا۔ ۷۴-۱۹۷۳ میں حکومت نے پانی کی فراہمی، زیرزمین نکاس کے نظام کی تعمیر، اور لیاری ڈگری کالج اور لیاری جنرل ہسپتال جیسے قیام کے منصوبوں کی منظوری دی اور ان کے لیے رقم فراہم کی، اگرچہ علاقے کے باشندوں کی طرف سے ان سہولتوں کے حصول کے لیے کوئی مطالبہ موجود نہ تھا۔

ان منصوبوں پر عمل درآمد کا کام ریپڈ ڈویلپمنٹ اسٹریٹجی کے تحت شروع کیا گیا اور نتیجے کے طور پر لیاری میں پہلی بار بڑے پیمانے پر طبعی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تاہم ان منصوبوں کے تحت کیا جانے والا کام گھٹیا معیار کا تھا، عجلت میں کیا گیا تھا اور اس کی مناسب طور پر تکنیکی نگرانی نہیں کی گئی تھی۔ نگرانی کے کام میں علاقے کے باشندوں کو بالکل شامل نہیں کیا گیا کیونکہ یہ تمام منصوبے براہ راست وزیراعظم کے احکامات کے تحت تعمیر کیے جا رہے تھے۔ مسائل ۱۹۸۰ کے عشرے میں ظاہر ہونا شروع ہوئے جب نکاس کی لائنیں چوک ہو گئیں، پانی کی لائنوں میں دباؤ کم ہو گیا اور سڑکوں کی سطح اکھڑ گئی۔

پی پی پی کی پہلی حکومت کی برطرفی اور ۱۹۷۷ کے مارشل لا کے نفاذ کے بعد لیاری میں کوئی بڑا ترقیاتی کام نہیں کیا گیا۔ کسی نئی ترقیاتی اسکیم کی منظوری نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ معمول کے دیکھ بھال کے کاموں، مثلاً بند گٹر لائنوں کو کھولنے، میں بھی غفلت برتی گئی۔ اس علاقے کو اس وقت کی حکومت کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔

۱۹۸۵ کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد علاقے کے کونسلر حاجی غلام حسین نے بعض چھوٹے چھوٹے ترقیاتی کام کرائے جن میں سڑکوں کی مرمت، نکاس کی

بند لائنوں کی صفائی، بڑی سڑکوں پر سے کچھ تجاوزات کا خاتمہ اور محراب خان عیسیٰ خان روڈ کی تعمیر کا کام شامل تھا۔ ان کاموں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ علاقے میں مذہبی تنظیم جماعت اسلامی کی جڑیں قائم کی جائیں کیونکہ اس وقت کے میئر عبدالستار افغانی کا تعلق جماعت سے تھا اور مقامی کونسلر نے بھی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

حاجی غلام حسین نے علاقے میں درکار ترقیاتی کاموں کی نشان دہی کی۔ ان کاموں کے لیے رقم اس فنڈ سے خرچ کی گئی جو ہر کونسلر کو اپنے علاقے میں ترقیاتی کام کے لیے دیا جاتا ہے۔ منصوبوں کا ڈیزائن کے ایم سی اور اس کے ذیلی ادارے کے ڈبلیو ایس بی نے تیار کیا۔ کام کے معیار کی منظوری کونسلر نے خود دی۔ ان منصوبوں کی نشان دہی یا عمل درآمد میں علاقے کے باشندوں کو کوئی کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ مقامی تنظیموں نے اس وقت تک اس قسم کے ترقیاتی کاموں میں حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا۔ ان کی توجہ کا مرکز سماجی تقریبات کے لیے برتنوں وغیرہ کی فراہمی، فٹ بال میچ کرانے اور تعمیراتی کام کے لیے چندہ جمع کرنے تک محدود تھا۔

سڑکوں، نکاس کے نظام اور پانی کی فراہمی کے بندوبست کی خراب حالت کو بہتر بنانے کے لیے علاقے کے باشندوں کی کوششیں عموماً اپنے محلے تک محدود رہتی تھیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ محلے کے افراد علاقے کے کونسلر یا اس کے نمائندے سے رجوع کرتے اور سرکاری محکموں کے نام درخواستیں تحریر کرتے۔ ۱۹۸۶ تک سڑکیں فضلے سے بری طرح اٹ گئیں اور غیر صاف شدہ کچرا علاقے کا ایک عام منظر بن گیا۔ اسی طرح پینے کے پانی کی کمی بھی لیاری کا ایک مستقل مسئلہ بن گئی۔

۱۹۸۸ میں پی پی پی دوبارہ اقتدار میں آئی۔ اس نے لیاری کے لیے تین ملین گیلن یومیہ کی ایک اسکیم منظور کی۔ اس اسکیم کے تحت محراب خان عیسیٰ خان روڈ کے ساتھ ساتھ ۱۸ انچ قطر کی ایک پانی کی لائن ڈالی جانی تھی اور اس میں سے نوالین کی ۲۴ گلیوں کو ذیلی کنکشن دیے جانے تھے۔ ۱۹۹۰ میں پی پی پی حکومت کی برطرفی تک اس اسکیم پر عمل درآمد نہیں ہو سکا تھا۔ ۱۹۹۳ تک کے ڈبلیو ایس بی نے ۶ء۳ ملین روپے کے خرچ سے اس اسکیم کو جزوی طور پر مکمل کیا تھا لیکن لائن میں پانی کا دباؤ بہت کم تھا۔

وفاقی حکومت نے ۸۰ ملین روپے کے خرچ سے لیاری ڈویلپمنٹ اسکیم کا اعلان کیا جس پر عمل درآمد کے ایم سی کو کرنا تھا۔ اس میں ۲۶۹ء۱۴ ملین روپے کی لاگت سے آتمارام پریتم داس روڈ، چاکیواڑہ روڈ، نیو کمہارواڑہ روڈ اور ڈینسو روڈ کی تعمیر اور مرمت کا کام بھی شامل تھا۔ مولانا محمد علی جوہر پارک (گگری گراؤنڈ)، گبول پارک اور مولوی محمد عثمان پارک کو بہتر بنانے کے لیے بھی اسکیم میں ۶۹۵ء۱۱ روپے مختص کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ پیپلز پلے گراؤنڈ میں اسپورٹس کمپلیکس کی تعمیر (۸۵۰ء۳۹ ملین روپے) اور لیاری میٹرنٹی ہوم (غریب شاہ) کے درجے میں اضافہ (۵۴ء۴ ملین روپے) بھی اس اسکیم کا حصہ تھا۔

۱۹۹۵ تک صورت حال میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ ۱۹۹۳ میں انجمن اتحاد نوجوانان نوالین نے نامکمل مین لائن کا مسئلہ بھی پینے کے پانی کی آلودگی کے مسئلے کے ساتھ اٹھایا تھا اور اس سلسلے میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ اور کے ڈبلیو ایس بی کے مینیجنگ ڈائرکٹر کے علاوہ علاقے کے منتخب رکن صوبائی اسمبلی سے رجوع کیا تھا۔ تین سال کی متواتر کوششوں کے بعد آخر کار ۱۹۹۵ میں انجمن کے ڈبلیو ایس بی سے باقی ماندہ کام مکمل کرانے میں کامیاب ہوئی۔ (۱۹۹۴ میں پی پی پی ایک بار پھر اقتدار میں واپس آچکی تھی۔) اب نوالین کی ۲۱ گلیوں میں مناسب مقدار میں پانی دستیاب ہے۔ صرف تین گلیاں اب تک پانی کے کنکشن سے محروم ہیں اور انھیں کنکشن دلوانے کے لیے انجمن کی کوششیں جاری ہیں۔ پانی کے سلسلے میں نوالین کے باشندوں نے صرف ایک مسئلے کا ذکر کیا جو یہ ہے کہ پانی آنے کے اوقات بے قاعدہ ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں کو پانی کی فراہمی ایک نظام الاوقات کے تحت کی جاتی ہے۔ لیکن والو مین اس کی پابندی نہیں کرتے اور علاقے کے باشندوں کو بتائے بغیر پانی کی فراہمی کے اوقات اور اس کی میعاد تبدیل کر دیتے ہیں۔

بڑی سڑکوں پر سے تجاوزات ۱۹۸۸ میں ہٹائی گئی تھیں۔ ان تجاوزات میں سڑکوں کے کنارے بنی ہوئی کئی منزلہ عمارتیں بھی شامل تھیں۔

روزگار کے شعبے میں حکومت نے پلیسمنٹ بیورو کے توسط سے لیاری کے لیے بے روزگار نوجوانوں کو ۱۰۰۰ نوکریاں دیں۔ اس سلسلے میں واحد معیار یہ رکھا گیا تھا کہ درخواست گزار لیاری کا رہنے والا ہو۔ تقررنامے ان کے گھروں پر بھجوا دیے گئے۔ ان میں ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک کو کے پی ٹی میں ملازمت ملی اور باقی کو کے ایم سی اور کے ڈبلیو ایس بی میں کھپایا گیا۔

۱۹۹۰ کے عشرے تک آتے آتے انجمن کو احساس ہوا کہ محض درخواستیں گزارنا یا علاقے کے صوبائی یا قومی اسمبلی کے رکن کے پیچھے پھرنا مسئلے کا حل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے منظم انداز سے متعلقہ محکموں میں پیروکاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک پی پی پی بھی ایک بار پھر اقتدار میں آچکی تھی اور وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو لیاری کے مسائل حل کرنے سے خاص دلچسپی تھی۔ لیکن ۱۹۹۰ میں پی پی پی کی

حکومت کو برطرف کر دیا گیا اور ۹۲-۱۹۹۰ کے عرصے میں لیاری میں کوئی ترقیاتی کام نہ کیا گیا۔ اس وقت تک انجمن سیاسی پارٹیوں کا سہارا لیے بغیر شہری محکموں کو متحرک کرنے کا سبق سیکھ چکی تھی اور اس نے دوسری این جی اوز سے بھی تعلقات قائم کر لیے تھے۔

انجمن نے ۱۹۹۱ میں حکومت سندھ کے ڈائرکٹریٹ آف سوشل ویلفیئر سے رضاکار تنظیم کے طور پر رجسٹریشن حاصل کی۔ شعبے کی ڈائرکٹر رخسانہ سلیم نے انجمن کو این جی اور یسورس سنٹر سے متعارف کرایا جو ان ہی دنوں آغا خان فاؤنڈیشن کے تحت قائم ہوئی تھی۔ این جی او آر سی کے زیر اہتمام منعقد کی گئی مختلف مینجمنٹ ورکشاپس میں شرکت کے دوران انجمن کے ارکان دوسری این جی اوز اور مقامی تنظیموں سے متعارف ہوئے۔ اسی زمانے میں انجمن کی قیادت میں تبدیلی آئی۔

۱۹۹۳ میں لیاری میں کام کرنے والی مختلف تنظیموں نے لیاری ایکشن کمیٹی بنائی جس کا مقصد بغدادی، کلری اور آٹھ چوک کے علاقوں میں پانی کی فراہمی، اور نوالین، سنگھولین اور میوہ شاہ میں نکاس کے نظام کی بہتری کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔

معین قریشی کی قیادت میں قائم ہونے والی نگراں حکومت نے لیاری کے لیے ۳۲ ملین روپے کی لاگت سے پانی کی فراہمی کی ایک اسکیم منظور کی۔ مرزا آدم خان روڈ سے نوالین تک ۸ انچ قطر کی لائن ڈالی گئی۔ تاہم یہ اب تک استعمال کے قابل نہیں ہوئی ہے۔ انجمن نے اس کی دو وجوہ بتائیں: کے ڈبلیو ایس بی نے آٹھ انچ کی لائن جان بوجھ کر کم گہرائی میں ڈالی کیونکہ وہ لیاری کو پانی فراہم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس کے اہلکاروں کو صرف ۳۲ ملین روپے میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے سے دلچسپی ہے۔ دوسرے یہ کہ زیادہ گہرائی میں لائن ڈالنے کے لیے کے ڈبلیو ایس بی کو کھدائی پر زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی۔ نتیجہ یہ کہ پانی اس لائن میں اتنے دباؤ کے ساتھ داخل نہیں ہوتا کہ ان گلیوں تک پہنچ سکے جہاں پانی فراہم کرنا اس کا مقصد تھا۔

مقامی کونسلر، قومی اور صوبائی اسمبلی کے رکن، یا کے ڈبلیو ایس بی کے اہلکاروں نے منصوبے کے ڈیزائن، منظوری اور عمل درآمد کے مرحلوں میں علاقے کے باشندوں کو بالکل شریک نہیں کیا۔ انھیں اس منصوبے کا علم اس وقت ہوا جب کے ڈبلیو ایس بی کے لوگ سڑک کھودنے کے لیے آ پہنچے۔ کھدائی کے مرحلے میں انجمن کوئی مداخلت نہ کر سکی کیونکہ اس وقت تک اسے منصوبے کے ڈیزائن اور نقشوں تک رسائی حاصل نہ تھی۔ انجمن کے ارکان کو وہ تکنیکی معلومات اور مہارت بھی حاصل نہ تھی جو ترقیاتی کام کی نگرانی کے لیے درکار ہے۔ پھر بعض ارکان اپنے روزگار کے سلسلے میں دن بھر معروف رہتے تھے اس لیے نگرانی کے لیے وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ اس عرصے کے دوران کے ڈبلیو ایس بی نے نکاس کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے ۱۸ انچ قطر کے ۹۵۰ فٹ لمبے پائپ بچھا دیے تھے۔ اس کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے۔

۱۲ انچ قطر کی ایک نکاس کی لائن نوالین کی ۲۴ گلیوں سے گندا پانی جمع کر کے جیلہ اسٹریٹ کے پمپنگ اسٹیشن میں واقع ۲۲ فٹ گہرے دو کنووں میں سے ایک میں لے جاتی تھی۔ یہاں ایک اجیکٹر پمپ اس کو دھکیل کر ۳۳ فٹ کے رائزنگ مین میں پہنچاتا تھا جس کے ذریعے یہ شیر شاہ میں واقع ٹریٹمنٹ پلان (ٹی پی ۱) تک لے جایا جاتا تھا۔ چونکہ لیاری سطح سمندر سے نیچے واقع ہے، اس لیے گندا پانی کشش ثقل کے زور سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پمپنگ اسٹیشن میں واقع دوسرے کنویں میں ۱۵ انچ قطر کی لائن کے ذریعے گاندھی نگر اور عثمان آباد کے علاقوں سے، ۱۳۳ انچ قطر کی لائن کے ذریعے جوبلی سنیما اور لارنس روڈ کے علاقوں سے اور ۱۳۳ انچ لائن کے ذریعے لیاری سے گندا پانی پہنچتا تھا۔ سولجر بازار، گارڈن، صدر، اور کمی مسجد کے علاقوں سے گندا پانی ۱۳۳ انچ قطر کی لائن سے پہلے کنویں میں پہنچتا تھا۔ ۱۴۸ انچ قطر کی لائن ضلع شرقی میں واقع پیر کالونی کے گندے پانی کو اسی کنویں میں پہنچاتی تھی۔ ان دونوں کنووں کی کارکردگی میں فرق یہ تھا کہ پہلے کنویں سے گندا پانی براہ راست پمپ میں پہنچتا تھا جبکہ دوسرے کنویں سے ایک اور لائن سے گزر کر۔ چنانچہ دوسرے کنویں میں گرنے والی لائنوں کا سکشن کا نظام زیادہ موثر نہیں تھا۔ اگر بجلی فیل ہو جاتی تو پمپ کام کرنا چھوڑ دیتے، اور چونکہ لیاری کی ۱۲۴ انچ والی لائن زیادہ گہرائی میں نہیں بچھائی گئی تھی، اس لیے سارا گندا پانی الٹی سمت بہہ کر نوالین اور لیاری کے دوسرے علاقوں میں جمع ہو جاتا۔

۱۹۹۰ میں نوالین کی ۱۲ انچ کی لائن میں اس وقت مسائل پیدا ہو گئے جب پڑوس کے محلوں نورانی کالونی اور بکرا پیڑی (کے ایم سی وارڈ ۱۸) کا گندا پانی نوالین کی مین لائن میں چھوڑ دیا گیا۔ یہ عمل کے ڈبلیو ایس بی نے ہنگامی بنیادوں پر کیا تھا کیونکہ ان دونوں محلوں کی نکاس کی لائن شکستہ ہو گئی تھیں اور گندا پانی ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ صورت حال اس وقت اور بھی سنگین ہو گئی جب کے ڈبلیو ایس بی نے ملحقہ مل ایریا کا گندا پانی بھی نوالین کی نکاس کی لائن میں داخل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں نوالین کی لائن کئی مقامات پر ٹوٹ پھوٹ گئی اور اس نے اضافی نکاس کا بوجھ برداشت نہ کرتے ہوئے کام کرنا چھوڑ دیا۔

پینے کے پانی میں آلودگی کی آمیزش کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ گندا پانی نکاس کی

لائنوں سے رس کر زیرِ زمین پھیل جاتا ہے اور چھنتی ہوئی پانی کی لائن میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مسئلے کے عارضی حل کے لیے کے ڈبلیو ایس بی نے نوالین کی شکستہ نکاس کی لائن پر دباؤ کم کرنے کے لیے ۱۲ انچ قطر کی ایک اوور فلو لائن بچھا دی۔ تاہم اضافی پانی کے دباؤ کو سہارنے کے لیے یہ لائن بھی ناکافی ثابت ہوئی۔

واٹر بورڈ کے اہلکار اور علاقے کے شہری پانی کے نمونے جمع کرتے ہوئے

۱۹۹۳ میں کے ڈبلیو ایس بی نے لیاری سے آنے والی ۲۴ انچ کی لائن کے اوپر ۴۸ انچ قطر کی لائن ڈالنے کی تجویز پیش کی جس پر ۱۰ ملین روپے کی لاگت آنی تھی۔ ۱۹۹۴ میں پی پی پی کے دوبارہ اقتدار سنبھالنے پر وزیرِ بلدیات نادر مگسی نے ایک کم لاگت اور کم میعاد کا منصوبہ منظور کیا جس کے تحت دوسرے کنوئیں سے رائزنگ مین تک ۱۶ انچ کی ایک الگ لائن ۲۵۰ ہارس پاور کے پمپ کے ساتھ ڈالی جانی تھی۔ اس کی لاگت صرف ۰۵ء۰ ملین روپے تھی۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کے اب تک کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ اگرچہ انجمن کے ارکان کا دعویٰ ہے کہ حکومت نے قومی اسمبلی کے ہر رکن کو اپنے علاقے میں ترقیاتی کام کرانے کے لیے ۵ ملین روپے کی رقم دی ہے، لیکن یہ رقم چھوٹے منصوبوں پر خرچ نہیں کی جا رہی ہے۔

بلدیاتی ادارے

شہر کے بلدیاتی اداروں کے سلسلے میں انجمن عام طور پر سیاست دانوں یا سرکاری اہلکاروں کا اثر و رسوخ استعمال کرتی ہے۔ بعض اہلکار اس لیے انجمن سے ہمدردی رکھتے ہیں کہ وہ خود بھی لیاری کے باشندے ہیں اور انجمن کی کوششوں کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر اداروں کی سطح پر انجمن کے کردار کو باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

کے ڈبلیو ایس بی: انجمن کو زیادہ تر کے ایم سی اور اس کے ذیلی ادارے کے ڈبلیو ایس بی کے ساتھ معاملہ کرنا پڑا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ان سرگرمیوں پر مشتمل ہے: محکموں کے نام درخواستیں لکھنا، دستخطی مہم چلانا اور محکموں کے نام یادداشتیں جمع کرانا، کسی مسئلے کے بارے بیرونی ذرائع مثلاً این جی اوز سے متعلقہ معلومات جمع کرنا، حمایت کے لیے سیاسی نمائندوں سے رجوع کرنا اور انھیں مسئلے سے متعلق دستاویزات اور تکنیکی تفصیلات پیش کرنا، اور اس کے ساتھ متعلقہ وزارتوں میں اعلیٰ سرکاری اہلکاروں سے رابطہ قائم کرنا۔ پیروکاری کے ذیل میں آنے والی یہ تمام سرگرمیاں بنیادی شہری حقوق حاصل کرنے کے مقصد سے کی جاتی ہیں۔

کے ڈبلیو ایس بی کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق لیاری میں ایک منصوبے پر کام جاری ہے جس کے تحت پانی کی فراہمی کے نظام کو حب کے ذخیرۂ آب سے لیاری تک توسیع دی جائے گی اور اس کے لیے ۵ء۱۲ ملین روپے کی رقم وفاقی حکومت مہیا کرے گی۔ اس منصوبے کے مکمل ہونے سے لیاری کو یومیہ ایک ملین گیلن پانی زیادہ ملنے لگے گا۔ کے ڈبلیو ایس بی کا کہنا ہے کہ اس منصوبے پر ۸۰ فیصد کام مکمل ہو چکا ہے۔

جہاں تک لیاری کے نکاس کے نظام کو مجموعی طور پر بہتر بنانے کا تعلق ہے، کے ڈبلیو ایس بی کی ۱۹۹۵ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایک اضافی پمپنگ اسٹیشن کی تعمیر کے ۶ء۱۵ ملین روپے کے منصوبے پر کام جاری ہے۔ کے ڈبلیو ایس بی کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے ۵ پمپنگ سیٹ، ۵ موبائل ڈی واٹرنگ پمپ، ۷ زیرِ زمین نکاس کے پمپ، اور ۱۵ اسٹینڈ بائی پاور جنریشن سیٹ خرید لیے ہیں۔ پمپنگ سسٹم کو اپ گریڈ کرنے کے علاوہ صوبائی حکومت رِی ڈویلپمنٹ پر مزید ۹۵ ملین روپے خرچ کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں ۶ء۸۳ ملین روپے لیاری کے نکاس کے نظام کی بحالی پر اور ۱۳ ملین روپے اس کی کارکردگی اور دیکھ بھال پر خرچ کیے گئے ہیں۔

لیاری کی مقامی تنظیموں کے مطابق کامیابی کی کلید یہ ہے کہ کے ڈبلیو ایس بی کو بار بار یاددہانی کرائی جاتی رہے۔ مسلسل رابطہ رکھنے سے مقامی بلدیاتی اداروں کے

ترقیاتی منصوبوں اور تعمیراتی کام کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ اپنی ابتدائی کامیابی کے بعد انجمن نے تمام جاری ترقیاتی کام کی نگرانی کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ انھوں نے اپنے علاقے کے رکن صوبائی اسمبلی کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ کے ڈبلیو ایس بی پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے انجمن کو ادارے کے ترقیاتی منصوبوں کی نگرانی کے کام میں شریک کرنے پر آمادہ کریں۔

کے ایم سی: نئی کمیٹی نے جو کام سب سے پہلے اپنے ذمے لیا وہ ایک پلاٹ حاصل کرنا تھا جس پر انجمن کا دفتر تعمیر کیا جا سکے۔ یہ دفتر مختلف تقریبات اور اجتماعات کے لیے کیونٹی سنٹر کا کام دے سکتا تھا، اور یہاں بچوں کے لیے کلاسیں اور عورتوں کے لیے مختلف ہنروں کی تربیت کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔

انجمن نے ایک پلاٹ کا پتا لگایا جس کا رقبہ تقریباً ۵۲۵ مربع گز تھا اور جو ایک عوامی استعمال کے پلاٹ کے طور پر کے ایم سی کی ملکیت میں تھا۔ کے ایم سی نے ۱۹۷۰ کے عشرے کے اوائل میں اس پلاٹ کے پچھلے حصے پر ایک کمرہ اور چند عوامی بیت الخلا تعمیر کر دیے تھے جو ۷۶-۱۹۷۵ تک استعمال میں رہے۔ ۱۹۸۳ میں ان کو مسمار کر دیا گیا۔ انجمن نے استعمال نہ ہونے والا یہ پلاٹ اپنے قبضے میں لے لیا۔ کئی منتخب کونسلروں اور صوبائی اسمبلی کے ارکان نے اس پلاٹ کو انجمن کے نام لیز کرانے کا وعدہ کیا لیکن یہ وعدہ کبھی پورا نہ ہوا۔ انجمن نے کے ایم سی میں کچی آبادی بیورو کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رمضان بلوچ سے رابطہ قائم کیا جو خود بھی لیاری کے باشندے تھے اور ان سے درخواست کی کہ یہ پلاٹ انجمن کے نام منتقل کر دیا جائے۔ اگرچہ رمضان بلوچ اچھی شہرت کے مالک تھے اور انجمن سے ہمدردی بھی رکھتے تھے، اس کے باوجود سرخ فیتے کے باعث کے ایم سی اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔

علاقے کے کونسلر بابو غلام حسین نے اس پلاٹ کو تجارتی پلاٹ قرار دلوا دیا۔ کونسلر کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا جو پیپلز پارٹی کا گڑھ سمجھے جانے والے لیاری کے علاقے میں اپنے قدم جمانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ جولائی ۱۹۹۱ میں کے ایم سی کے لینڈ ڈپارٹمنٹ نے مقامی اخبارات کے ذریعے لیاری کے ۳۹ عوامی استعمال کے پلاٹوں کو رہائشی زمین قرار دینے کے سلسلے میں اعتراضات طلب کیے۔ انجمن نے اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کیونٹی سنٹر کے لیے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت انھوں نے ڈپٹی ڈائرکٹر لینڈ ڈپارٹمنٹ سہیل صدیقی کو ایک عمدہ خط لکھا جس میں کے ایم سی کی ان کوششوں کو سراہا جو وہ علاقے کے ایسے باشندوں کو زمین کے مالکانہ حقوق دینے کے لیے کر رہی تھی جو کئی عشروں سے اپنے پلاٹوں پر بغیر مالکانہ حقوق کے رہ رہے تھے۔ تاہم، انھوں نے لکھا، انھیں ان پلاٹوں کے رہائشی زمین میں تبدیل کرنے کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بشرطیکہ مذکورہ خالی پلاٹ کو عوامی استعمال کے لیے انجمن کے نام منتقل کر دیا جائے۔ یہ دفتر کے لیے پلاٹ حاصل کرنے کی انجمن کی کوششوں میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔

اس اثنا میں رمضان بلوچ کے ایم سی میں ترقی پا کر ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچ چکے تھے اور ان کی سابق جگہ الطاف کو مل چکی تھی اور وہ بھی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوئے۔ کے ایم سی کے ضوابط کے مطابق اس قسم کی لیز کے لیے پہلے ۲۵۰ ارکان پر مشتمل کے ایم سی کونسل سے منظوری حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کونسل کے سامنے جو مسودہ پیش کیا جانا تھا اس میں لینڈ ڈپارٹمنٹ کے ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے لیز کی شرح ۶۰۰ روپے فی مربع گز دکھائی تھی۔ خوش قسمتی سے ڈپٹی ڈائرکٹر نے اسے بروقت دیکھ لیا اور اسے کم کر کے ۱۴۰ روپے فی مربع گز کر دیا۔ اس وقت کی شرح کے مطابق تجارتی پلاٹوں کی قیمت ۶ روپے اور رہائشی پلاٹوں کی قیمت ۳ روپے فی مربع گز تھی۔ مسودے میں لیز کی غیر معمولی شرح ظاہر کرنے کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ کونسل کی منظوری کے بعد بھی انجمن اتنی بڑی رقم ادا نہ کر سکے اور پلاٹ سے محروم رہ جائے، کیونکہ علاقے کا کونسلر اور کے ایم سی کے بعض اہلکار انجمن کو یہ پلاٹ دینے کے مخالف تھے۔ آخر کار جس کونسلر نے اس سلسلے میں انجمن کے لیے مشکلات پیدا کی تھیں، اسی نے لیز کی دستاویزات پر بطور گواہ دستخط کیے اور ۱۹۹۱ میں اس پلاٹ کے ایک کمرے میں انجمن کا دفتر قائم ہو گیا۔

عوام اور حکومت کے درمیان تعلق

علاقے کے باشندے سرکاری محکموں کے ساتھ بنیادی طور پر علاقے کے کونسلر کے ذریعے رابطہ کرتے ہیں۔ صوبائی حکومت کی سطح پر وہ لیاری سے منتخب ہونے والے رکن صوبائی اسمبلی کے توسط سے بات چیت کرتے ہیں اور وفاقی حکومت کے ساتھ یہاں کے رکن قومی اسمبلی کی وساطت سے۔ لیاری کے باشندے پی پی پی کو اس بنا پر بہت سراہتے ہیں کہ اس نے اپنے دور حکومت میں یہاں انفراسٹرکچر اور شہری سہولیات کے سلسلے میں بہت کام کیا، حالانکہ اس کام کا معیار بہت گھٹیا تھا۔

بنیادی سہولتوں کی فراہمی سیاسی وفاداری کے ساتھ قریبی طور پر منسلک ہے، نہ کہ اس اصول سے کہ شہریوں کو ان کی سیاسی وابستگی سے قطع نظر یہ سہولتیں فراہم کی جانی چاہییں۔ تاہم، لوگ اب سیاسی نمائندوں سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں اور ان کو یقین ہو چلا ہے کہ یہ لوگ سیاست میں محض اس لیے آتے ہیں کہ ترقیاتی فنڈز

کے ڈبلیو ایس بی کے سب انجینئر ریاض احمد سے انٹرویو

ریاض احمد، جنھوں نے الیکٹریکل سسٹم میں بی ٹیک کیا ہے، ۱۹۹۲ سے جیلہ سیورج پمپنگ اسٹیشن کو چلانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ فی الوقت وہ گریڈ ۱۶ کے افسر ہیں۔ ریاض احمد نے ۱۹۸۳ میں کے ڈبلیو ایس بی کی ملازمت اختیار کی۔ انھیں نارتھ ناظم آباد میں تعینات کیا گیا جہاں وہ علاقے میں پانی کی لائن اور ٹرنک سیورج کے نظام کی منصوبہ بندی میں شامل رہے۔ تاہم منصوبے پر عمل درآمد کے وقت ان کا تبادلہ دوسرے علاقے میں کر دیا گیا۔ ریاض کا کہنا ہے کہ ڈیزائن اور منصوبہ بندی میں جو افسر شامل ہوتے ہیں، منصوبے پر عمل درآمد کے وقت ان میں سے بہت سوں کو ہٹا کر ان کی جگہ ایسے افسروں کو لے آیا جاتا ہے جو ایگزیکٹو انجینئروں کے بھروسے کے ہوتے ہیں تاکہ ٹھیکے داروں سے بات چیت اور کمیشن کی وصولی میں آسانی رہے۔ ریاض کی تجویز ہے کہ ہر تین سال بعد انجینئروں کے تبادلے کے رواج پر نظر ثانی کر کے اس مدت میں اضافہ کیا جائے، کیونکہ کسی نئے افسر کو علاقے کے نظام، اس کے نقائص اور ان کے حل وغیرہ سے پوری طرح واقف ہونے میں کم از کم تین سال لگتے ہیں۔ کے ڈبلیو ایس بی کے عملی ضابطوں میں مضمر مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ۵۰ فٹ سے زیادہ لمبائی کی سیورج لائن کی دیکھ بھال اور مرمت کے لیے محکمے کی منظوری حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، جو ایک پیچیدہ اور طویل مرحلہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک پروپوزل تیار کرنا پڑتا ہے، اور سب انجینئر، اسسٹنٹ انجینئر، ایگزیکٹو انجینئر، سپرنٹنڈنگ انجینئر اور پھر چیف انجینئر کی منظوری لینا اور ان سے دستخط کرانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ اور پھر ڈیزائن ڈپارٹمنٹ کی منظوری کی باری آتی ہے۔ پھر ٹینڈر، اور اس کے بعد ورک آرڈر جاری کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ مرحلہ آنے سے پہلے اگر ڈیزائن ڈپارٹمنٹ کو کوئی اعتراض ہو تو چیف انجینئر پروپوزل کو نظر ثانی کے لیے واپس بھیج دیتا ہے جس کے بعد ساری منظوریاں پھر سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ ان تمام مرحلوں کے درمیان فائل کہیں بھی اٹک سکتی ہے اور پھر دلچسپی رکھنے والے فریق کو اسے ایک میز سے دوسری میز تک پہنچانے کے لیے ۱۵۰۰ روپے تک رشوت دینی پڑتی ہے۔ اس دوران میں مہینوں گزر جاتے ہیں، گلیوں میں گندا پانی کھڑا رہتا ہے اور پینے کے پانی میں شامل ہوتا رہتا ہے جس سے عوام کی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ایسی صورت حال میں جہاں نکاس کی لائن پھٹ گئی ہو یا بند ہو گئی ہو، تو ایک اور مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ گٹر لائنوں کے ذمہ دار عملے اور پمپنگ اسٹیشن پر تعینات عملے کے درمیان تعاون کی کمی ہے۔ "عوامی دباؤ سے بچنے کے لیے گٹر لائن کا عملہ لوگوں کو غلط اطلاع فراہم کر کے سارا قصور پمپنگ اسٹیشن پر ڈال دیتا ہے کہ اس کے کام نہ کرنے کی وجہ سے گندا پانی لائن میں نہیں جا رہا۔ لوگ میرے عملے سے جھگڑتے ہیں۔ اس کے لیے لوگوں کو قصوروار بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ انھیں تکنیکی معلومات نہیں ہوتیں۔ تب مجھے مداخلت کرنی پڑتی ہے۔ مجھے مین ہولوں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر انھیں بتانا پڑتا ہے کہ گندا پانی پمپنگ اسٹیشن تک پہنچ ہی نہیں رہا کیونکہ لائن کہیں راستے میں بند ہو چکی ہے، اور یہ کہ پمپ بخوبی کام کر رہے ہیں۔"

تعمیراتی کام کا معیار بہتر بنانے کے لیے ریاض کی تجویز یہ ہے کہ بڑی کمپنیوں کو کام کے ٹھیکے دیے جائیں۔ فی الوقت چھوٹے ٹھیکے داروں کو اپنے ٹھیکے کی رقم کا ۵۰ فیصد حصہ کے ڈبلیو ایس بی کے مختلف سطح کے اہلکاروں کو بطور رشوت دینا پڑتا ہے۔ اگر وہ کم از کم ۲۵ فیصد اپنا منافع رکھیں تو منصوبے پر خرچ کرنے کے لیے صرف ۲۵ فیصد رقم بچتی ہے۔ بڑے ٹھیکے دار اپنے بہتر انتظام اور تعلیمی اہلیت کی بدولت رشوت کے کئی مرحلوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

کمیونٹی تنظیموں اور خاص طور پر انجمن اتحاد نوجوانان لوالین کے بارے میں ریاض کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ تنظیمیں منصوبوں میں شروع سے شامل ہوں اور عمل درآمد کی بھی نگرانی کریں تو کام کا معیار بہت بہتر ہو سکتا ہے۔ چونکہ کمیونٹی تنظیمیں سرکاری محکموں سے کام نکلوانے میں بہت ماہر ہوتی ہیں، اس لیے یہ کسی پروپوزل کو کم وقت میں منظور کرا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ کام کی نگرانی بھی کریں تو اس کا معیار بہتر ہوگا۔ تاہم کے ڈبلیو ایس بی کمیونٹی تنظیموں کے اس کردار کو تسلیم نہیں کرے گی کیونکہ اس سے اہلکاروں کی کارگزاریاں سامنے آ جائیں گی اور کمیونٹی تنظیمیں رشوت لینے اور گھٹیا کام کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گی۔ ریاض نے اس سلسلے میں انجمن کے کام کا مثبت انداز میں ذکر کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس تنظیم نے ان سے رابطہ مسلسل قائم رکھا ہے، اور مسئلے کو عوام اور نظام کو چلانے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے عملے، دونوں کے نقطۂ نظر سے پوری طرح سمجھ کر تجاویز دی ہیں۔ پھر یہ تنظیم اپنی درخواستوں کی موثر انداز میں پیروی بھی کرتی ہے۔

کو خرد برد کر سکیں۔ باشندوں میں اس حقیقت کا خاصا احساس موجود ہے کہ ان کے علاقے میں ترقیاتی اسکیموں کے لیے مختص کی جانے والی رقوم میں بڑا حصہ بدعنوانی کی نذر ہو جاتا ہے۔ لوگ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ سیاست دان انھیں محض ووٹ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود لیاری کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اب بھی پی پی پی کو ووٹ دیں گے کیونکہ ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔ کوئی دوسری سیاسی جماعت کراچی کی بلوچی اور سندھی آبادی کے حقوق کے لیے اپنی آواز بلند کرے۔

۱۹۷۰ کے عشرے میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے لیے، اور بعد کے دو عشروں میں ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو کے لیے ایک اہم سیاسی حلقہ ہونے کے باوجود علاقے کی مقامی تنظیموں اور سرکاری محکموں کے درمیان کوئی تحریری معاہدہ موجود نہیں جس میں شہریوں کو ترقیاتی کام اور بلدیاتی فرائض کے سلسلے میں شریک کار کا درجہ دیا گیا ہو، حالانکہ گزشتہ کئی حکومتوں کے دور میں اس تصور کی خاصی تشہیر کی جاتی رہی ہے۔ شہریوں کے گروپ اور مقامی تنظیمیں سرکاری افسروں اور اپنے منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے نام بے شمار درخواستیں لکھتے اور ان کے دفتروں کے چکر لگاتے ہیں تاکہ ان کو بے حد بنیادی نوعیت کی جائز سہولتیں فراہم کرنے پر غور کیا جائے۔

سیورج لائن (پمپنگ اسٹیشن) کے سپروائزر ولیم سے بات چیت

ولیم جیلیہ پمپنگ اسٹیشن کے ساتھ جڑی ہوئی سیورج لائن کی دیکھ بھال کے لیے ۱۹۸۵ سے ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے مسائل کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے ہمیں بتایا کہ ۱۹۷۳-۷۴ میں یہ سیورج لائن بچھاتے وقت مناسب ڈھلان نہیں رکھی گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ زیر زمین پانی رس رس کر کھدائی کیے ہوئے گڑھوں میں بھر گیا تھا جس سے مٹی کا کام مشکل ہو گیا، اس لیے بعض ضروری کام چھوڑ دیے گئے۔ ۱۹۸۳-۸۴ تک لائن چوک ہونے لگی۔ اسی زمانے میں بکرا پیڑی اور جوکی محلّہ کے علاقوں کے گندے پانی کا رخ بھی نوالین کی سیورج لائن کی طرف موڑ دیا گیا جس سے اس لائن پر بہت دباؤ پڑا اور لائن بیٹھ گئی۔ جب لائن کا یہ حصہ تبدیل کیا گیا تو نیا پائپ دس فٹ کی گہرائی میں بچھا دیا گیا جب کہ پوری لائن ۱۵ فٹ کی گہرائی میں بچھی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے، اس سے مسئلہ کیسے حل ہو سکتا تھا۔ گندا پانی نوالین اور ارد گرد کے علاقے میں کھڑا ہونے لگا۔ جب عید اور بقر عید کے موقعوں پر لوگوں کی طرف سے دباؤ پڑتا تو بانس ڈال کر لائن کو صاف کر دیا جاتا لیکن کچھ دن بعد وہ پھر بند ہو جاتی۔ اصل مسئلہ غلط گہرائی میں بچھایا گیا پائپ تھا۔ اس کے علاوہ مین ہولوں کے ڈھکنے نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان میں کچرا، پھٹے پرانے کپڑے، لکڑی کے ٹکڑے اور پتھر وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ کے ڈبلیو ایس بی کے مقامی عملے نے چیف انجینئر کی توجہ اس طرف دلائی لیکن اسے یہ مسئلہ حل کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے اس کے بعد آنے والے چیف انجینئر نے اس طرف توجہ دی اور مسئلہ حل کیا۔

ولیم کی رائے ہے کہ جب بھی کے ڈبلیو ایس بی کی طرف سے مقامی تنظیموں کو شامل کیے بغیر کوئی مرمت کا کام کیا جاتا ہے تو ہر شخص اس پر تنقید کرتا ہے۔ اگر مقامی تنظیم بھی پروگرام میں شامل ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ مقامی تنظیم کم وقت میں منظوری بھی حاصل کر سکتی ہے کیونکہ اس کی اعلیٰ افسروں تک پہنچ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انجمن اتحاد نوجوانان نوالین نے نوالین کے لیے ۱۸ انچ کی سیورج لائن کی منظوری لینے میں اہم کردار ادا کیا۔

چونکہ ولیم اس سیورج لائن کو چلانے اور اس کی دیکھ بھال کے کام سے براہ راست متعلق ہیں، اس لیے ان کے مطابق ان کو اس کے مسائل اور ان کے درست حل کی اچھی سمجھ بوجھ ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اعلیٰ افسر نظام کی بحالی اور مرمت کے بڑے بڑے منصوبے بناتے وقت ان کی یا ان کے ساتھی کارکنوں کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔

لوگوں کے پاس وہ تکنیکی مہارت اور مالی استطاعت نہیں ہے کہ وہ پانی کی فراہمی اور نکاس کے نظام کے سلسلے میں کوئی ترقیاتی کام اپنے ذمے لے سکیں، کیونکہ یہ بہت بڑے علاقے پر پھیلا ہوا ایک پیچیدہ نظام ہے۔ علاوہ ازیں علاقے میں کام کرنے والی بڑی این جی اوز کا کام صرف انتظامی تربیت دینے، دوسری این جی اوز اور مقامی تنظیموں کے ساتھ تعلقات قائم کرانے اور مختلف ورک شاپس منعقد کرانے تک محدود ہے اور اس سے علاقے کے طبعی مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ عدالتی نظام جو اسی قدر سست رفتار اور مہنگا ہے، باشندوں کو اس بات سے باز رکھتا ہے کہ وہ بد عنوان اور نااہل سرکاری اہلکاروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔ بار بار کے توڑے ہوئے وعدوں، بد عنوان حکومتوں اور احتساب کی عدم موجودگی کا سلسلہ پہلے کی طرح جاری رہتا ہے اور علاقے میں پھیلی ہوئی ناخواندگی اور بے روزگاری اس عمل کو اور زیادہ مہمیز کرتی ہے۔

بین الاقوامی ادارے

یونیسیف: یونی سیف واحد بین الاقوامی ادارہ ہے جس نے نوالین میں انجمن کے تعلیمی پروگرام کو مدد دی ہے اور اس میں مثبت مداخلت کی ہے۔ یونی سیف نے تین سال تک اپنے ورکنگ چلڈرن پروگرام کے تحت لیاری کے تین اسکولوں کو مالی مدد فراہم کی۔ یہ اسکول انجمن اتحاد نوجوانان نوالین، لیاری کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروجیکٹ اور ینگ بلوچ ویلفیئر سوسائٹی کی طرف سے چلائے جا رہے تھے۔ یونی سیف نے اپنے اسٹریٹ اسکول سپورٹ پروجیکٹ کے تحت لیاری کی ۹ کمیونٹی تنظیموں کو کتابیں، بلیک بورڈ، چال اور دریاں، اور تفریحی سامان مثلاً باکسنگ کے دستانے، فٹ بال اور ٹیبل ٹینس کا سامان خریدنے اور ایک پروجیکٹ کو آرڈی نیٹر کی تنخواہ ادا کرنے کے لیے مالی مدد فراہم کی۔ اسکولوں کے استادوں کی تربیت کا بھی بندوبست کیا گیا۔ اس پروگرام میں یونی سیف کی توجہ کا مرکز ان بچوں کی تعلیم تھی جو قریب کے کارخانوں میں کام کر رہے تھے۔ یونی سیف اب لیاری میں ورکنگ چلڈرن پروجیکٹ کو دستاویز اور بروشر کی شکل دینے، اور اس پر ایک وڈیو فلم تیار کرنے میں مصروف ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں میں اس قسم کے اقدامات کو فروغ دینے کے لیے یونی سیف نے لیاری کے اسٹریٹ اسکولوں کے بارے میں بھی ایک وڈیو فلم تیار کی ہے۔

یونی سیف سندھ کے اہلکاروں کے مطابق اس پروجیکٹ سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ آجروں کو اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے پاس کام کرنے والے بچوں کو تعلیم اور تفریح فراہم کرنے کا بندوبست کریں۔ اس پروجیکٹ سے اس بات کا بھی عملی مظاہرہ ہوا کہ کام سے آدھ گھنٹے کے وقفے کے دوران باکسنگ اور دوسرے کھیلوں کے نتیجے میں بچوں کی کارکردگی میں اضافہ ہوا۔ اس عمل سے یہ بھی

سردار نبیل احمد گبول، رکن صوبائی اسمبلی، سے بات چیت

ہم نے لیاری کے تین ارکان صوبائی اسمبلی میں سے ایک سردار نبیل گبول سے بات چیت کی۔ باقی دو ارکان عبدالخالق جمعہ حلقہ نمبر ۸۷ سے اور قادر پٹیل حلقہ نمبر ۸۹ سے منتخب ہوئے تھے۔ ان تینوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے۔ قومی اسمبلی میں لیاری کی نمائندگی ۱۹۹۳ میں منتخب ہونے والے دو ارکان واجہ احمد کریم داد اور عبدالعزیز میمن کرتے ہیں۔ یہ دونوں بھی پیپلز پارٹی کے ہیں۔ تیسرے رکن قومی اسمبلی (حلقہ ۱۹۱، کراچی جنوبی ۳) عبدالحلیم صدیقی ہیں جن کا تعلق حزب اختلاف کی جماعت پاکستان مسلم لیگ (نواز شریف گروپ) سے ہے۔

نبیل گبول صوبائی اسمبلی کے حلقہ ۸۸ کی نمائندگی کرتے ہیں جس میں نوالین، کلاکوٹ، بکرا پیڑی، عثمان آباد اور دھوبی گھاٹ شامل ہیں۔ گبول صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی ہیں۔ وہ ہفتے میں پانچ دن عام لوگوں سے ملتے ہیں ـ سنیچر کو اپنے گھر پر اور باقی چار دن صوبائی اسمبلی میں واقع اپنے دفتر میں۔ ہماری ملاقات انجمن کی وساطت سے ایک دن کی پیشگی اطلاع پر طے ہوئی۔ پہلا انٹرویو ان کی آرام دہ ہائش گاہ پر ہوا جو شہر کے ایک پر تعیش علاقے ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع ہے۔ وہاں کوئی رسمی تکلفات یا پروٹوکول نہیں تھا۔ لوگ، جو بیشتر لیاری کے باشندے تھے، لوگوں سے ملاقات کے لیے مخصوص کمرے میں بغیر پیشگی وقت لیے داخل ہو رہے تھے۔ جب آنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی تو نئے آنے والے فرش پر بیٹھنے لگے کیونکہ کمرے میں دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے صوفوں پر تمام لوگوں کے لیے جگہ نہ تھی۔ ہماری دوسری ملاقات سندھ اسمبلی میں ڈپٹی اسپیکر کے چیمبر میں ہوئی۔

اپنے سیاسی پس منظر اور لیاری سے اپنے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے نبیل گبول نے بتایا کہ گبول قبیلے کے ۸۰ ہزار افراد سندھ کے ہر ضلعے میں آباد ہیں اور ان میں سے بیشتر کا پیشہ زراعت ہے۔ گبول بلوچ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ نبیل اس وقت گبول قبیلے کے سردار بھی ہیں۔ ان کے خاندان کا لیاری سے تعلق اس وقت سے ہے جب ان کے پردادا خداداد گبول اندرون سندھ کے مقام دادو سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے۔ انھوں نے لیاری میں ایک مکان خریدا اور بکریوں کی خرید و فروخت کا کام کرنے لگے۔ جلد ہی ان کی مالی حالت اتنی بہتر ہو گئی کہ انھوں نے لیاری میں اور اس کے آس پاس خاصی زمین خریدلی۔ گبول خاندان آج بھی کراچی ایرپورٹ کے قریب کی کچھ زمین کا مالک ہے۔ نبیل کا کہنا ہے کہ پھر ایسا وقت آیا کہ انگریزوں کو ان کے پردادا کے زمین خریدنے پر پابندی لگانی پڑی کیونکہ وہ کراچی کی تقریباً ۹۰ فیصد زمین خرید چکے تھے۔ یہ شہر اُس زمانے میں کلاچی کہلاتا تھا اور یہ نام سمندر کے کنارے آباد ماہی گیروں کے سردار کی بیوی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ نبیل کا کہنا ہے کہ کراچی اس وقت صرف لیاری پر مشتمل تھا اور گبول یہاں کے اولین آباد ہونے والوں میں سے تھے۔

گبول خاندان کے سیاست میں داخلے کا آغاز نبیل کے دادا اللہ بخش گبول سے ہوا جو لیاری میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۲۷ میں بمبئی کی لجیلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سندھ ۱۹۳۷ تک بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ رہا۔ نبیل کے مطابق ان کے دادا کا رکن منتخب ہونا ایک بڑی کامیابی تھی کیونکہ انھوں نے لیاری کے ایک مالدار تاجر اور سماجی کارکن سر عبداللہ ہارون کو شکست دی تھی۔ نبیل کے مطابق عبداللہ ہارون نے ووٹ حاصل کرنے کے لیے علاقے میں نوٹ تقسیم کیے اور مفت کھانے کھلائے تھے جبکہ اللہ بخش نے ایسی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ نبیل کے چچا عبدالستار گبول ۱۹۷۰ کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی حکومت کے دور میں وفاقی وزیر رہے۔ ان کے والد حمید گبول نے سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ نبیل کی والدہ کا تعلق عمان سے ہے۔

گبول خاندان کے کاروبار میں خلیجی ریاستوں میں واقع ہوٹل اور کراچی میں گبول موٹرز کے نام سے کاروں کی تجارت شامل ہیں۔ نبیل گبول کے خاندان والے آٹھ دس سال پہلے لیاری سے اٹھ کر ڈیفنس سوسائٹی میں آباد ہو گئے۔ ان کے اب تک لیاری کے دھوبی گھاٹ اور حسن عسکری گوٹھ میں دو آبائی مکان موجود ہیں۔ نبیل کا ایک بھائی، ایک چچا اور بہت سے رشتے دار اب بھی وہاں رہتے ہیں۔ نبیل نے ۱۹۸۶ میں سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

(بقیہ اگلے صفحے پر)

ظاہر ہوا کہ تمام آجر کام کے وقت میں بچوں کو تعلیم اور تفریح کے لیے وقفہ دینے کے سلسلے میں ناراضامندی یا عدم تعاون کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ لیاری کے اسٹریٹ اسکولوں کے بارے میں یونی سیف نے ۱۹۹۰ میں ٹیچرز ریسورس سنٹر کے ذریعے ایک تحقیق کرائی۔

یونی سیف نے محکمۂ تعلیم حکومت سندھ کے ساتھ پیروکاری کی ہے تاکہ لیاری کے اسٹریٹ اسکولوں کے کیے ہوئے کام کو تسلیم کیا جائے اور اسے سرکاری اسکولوں کے رسمی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ یونی سیف کے طارق سعید کے مطابق یونی سیف نے ڈائرکٹر اسکولز انوار احمد زئی کے ساتھ ایک میٹنگ کا بندوبست کیا جس میں ان کمیونٹی تنظیموں کو بھی دعوت دی گئی جو غیر رسمی تعلیم کے منصوبوں میں شامل ہیں کہ وہ اپنے تجربات اور مسائل بیان کریں اور حکومت کے ساتھ تعاون کے مختلف امکانات پر بات چیت کریں۔ اس کے نتیجے میں سیکرٹری تعلیم شریف بلوچ نے اپریل ۱۹۹۵ میں کمیونٹی تنظیموں کے ساتھ ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران اعلان کیا کہ سرکاری اسکولوں کی عمارتیں، اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد، تنظیموں کو دستیاب ہوں گی تاکہ وہ وہاں بچوں کی غیر رسمی تعلیم کا کام جاری رکھ سکیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسٹریٹ اسکولوں سے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو سرکاری اسکولوں میں داخلہ دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں اس بات کو اہمیت نہیں دی جائے گی کہ بچے نے کتنے سال تک تعلیم حاصل کی ہے بلکہ یہ جانچنے کی کوشش کی جائے گی کہ وہ سرکاری اسکولوں کے مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

علاقے میں چلائی جانے والی مختلف ترقیاتی اسکیموں کا پس منظر بتاتے ہوئے نبیل گبول نے کہا کہ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ کے عشرے میں پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رکن صوبائی اسمبلی کو بات کرتے وقت کمرے میں لیاری کے باشندوں کی موجودگی کا احساس ہے اور انھوں نے مرحوم وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر بہت عقیدت کے ساتھ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دور میں اس علاقے میں پہلی بار ترقیاتی کام ہوا، سڑکیں بنیں، گٹر لائن ڈالی گئی، پانی کی لائن ڈالی گئی، اور لیاری جنرل ہسپتال، لیاری ڈگری کالج اور اسٹیڈیم قائم ہوا۔

نبیل کے مطابق لیاری کا بنیادی مسئلہ زیادہ آبادی ہے جس کے باعث ہر ترقیاتی اسکیم بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کام منظم طریقے سے انجام نہیں دیا جاتا۔ "ہمیں ضرورت کے مطابق فنڈ تو ملتے ہیں لیکن بیورو کریسی اور متعلقہ عملے کی بدعنوانی کے باعث کوئی کام نہیں ہو پاتا،" ان کا کہنا تھا۔ "اب تک کروڑوں روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔ ہر رکن قومی اسمبلی کو اپنے حلقے میں ترقیاتی کام کے لیے دس لاکھ روپے سالانہ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں اپنی خاص ترقیاتی اسکیمیں بھی چلاتی ہیں۔ ہمیں تکنیکی مہارت رکھنے والے لوگوں کی اور مقامی تنظیموں کی ضرورت ہے کیونکہ رکن صوبائی اسمبلی کی حیثیت سے میرے پاس کوئی تکنیکی مہارت نہیں ہے۔ مجھے انجینئروں اور بیورو کریٹس پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ لیاری میں تقریباً دو ہزار تنظیمیں ہیں، لیکن ان میں سے ۷۰ فیصد محض کاغذی تنظیمیں ہیں یا وہ عہدے داروں کے ذاتی مفاد کے لیے کام کرتی ہیں۔ صرف ۳۰ فیصد تنظیمیں اجتماعی بھلائی کے لیے کام کرتی ہیں۔"

جب نبیل گبول سے ضروریات کا جائزہ لے کر اس کی بنیاد پر مختلف ترقیاتی اسکیمیں تیار کرنے کے عمل کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے وضاحت کی کہ وہ کئی طریقوں سے عوامی رائے سے آگہی حاصل کرتے ہیں۔ بالکل نچلی سطح پر پیپلز پارٹی اپنے "وارڈز" کے ذریعے کام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہفتے میں تین بار لیاری کا دورہ کر کے عام لوگوں سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص ان سے ڈیفنس سوسائٹی کے گھر میں واقع ان کے دفتر میں مل سکتا ہے۔ اس طرح انھوں نے زور دے کر کہا کہ انھیں مسائل اور عوام کی رائے کا بخوبی اندازہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۹۰ کے عشرے میں اپنی پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد شروع کی جانے والی کئی اسکیموں کا ذکر کیا: لیاری گرڈ اسٹیشن، ویمنز کالج، لیاری ایکسپریس وے، جبلہ پمپنگ اسٹیشن، نبیل گبول کمپلیکس کی تعمیر (جس میں ایک کمیونٹی سنٹر، میٹرنٹی ہوم اور انڈسٹریل ہوم شامل ہیں اور جسے بکرا پیڑھی کے میدان میں تعمیر کیا جا رہا ہے جو چالیس سال سے لوگوں کے لیے زحمت کا باعث تھا)، کم لاگت والے مکانوں کی اسکیم، اور لیاری کی سیوریج لائن کی تبدیلی۔ لیاری میں بڑی سڑکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ پاکستان آرمی کے ایک ذیلی ادارے فرنٹیئر ورکس آرگنائزیشن (ایف ڈبلیو او) کو دیا گیا ہے۔ ایف ڈبلیو او ان سڑکوں پر سیوریج سسٹم کی بحالی کا کام بھی کرے گا تاکہ سڑکوں کی تعمیر اور کے ڈبلیو ایس بی کے درمیان رابطے کے مسائل پیدا نہ ہوں۔ تاہم نبیل گبول کسی ایک بھی ایسے ترقیاتی منصوبے کا نام نہ بتا سکے جس کی منصوبہ بندی، ڈیزائن اور عمل درآمد کے مرحلوں میں شہریوں، مقامی تنظیموں اور حکومت کے درمیان شراکت داری کی گئی ہو اور شہریوں کو اس عمل کے دوران کسی طرح کی نمائندگی حاصل رہی ہو۔ انھوں نے کہا کہ بنیادی مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں بدعنوانی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جس سے عوام کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے خواہ وہ تعلیم کا معاملہ ہو یا بنیادی شہری سہولتوں کا۔

روزگار کے بارے میں (کمرے میں روزگار حاصل کرنے کے خواہش مند چند لوگ موجود تھے) نبیل گبول نے کہا، "ہم کسی کو روزگار نہیں دے سکتے۔ یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔"

اگرچہ یونی سیف کا تین سالہ اسٹریٹ اسکول پروجیکٹ ۱۹۹۴ میں ختم ہو گیا، لیکن بیشتر کمیونٹی تنظیمیں اب بھی اپنے تعلیمی پروگرام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یونی سیف بھی ان تنظیموں کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھے ہوئے ہے اور ان کو بچوں کے پڑھنے کے لیے ضمنی مواد فراہم کرتی اور تنظیموں کے عہدے داروں کی محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسروں سے ملاقاتوں کا انتظام کرتی ہے۔ یونی سیف کے مطابق ان اسکولوں کے جاری رہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کو چلانے کی لاگت کم ہے کیونکہ انھیں گلی میں یا تنظیم کے دفتر میں چلایا جاتا ہے۔ عمارت کے کرائے یا بجلی کے بل کی مد میں بھی بہت کم اخراجات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ان اسکولوں کی تقویت کا باعث ہے کہ یہاں پڑھانے والے افراد تنظیم کے بے روزگار عہدے دار ہیں جو رضاکارانہ طور پر خدمات انجام دیتے ہیں۔

یونی سیف نے تعلیمی اشیا کی خریداری کے لیے ۵۰۰۰ روپے سالانہ تک فراہم کرنے کے علاوہ کو آرڈی نیٹر اور استاد کی واجبی تنخواہ کا بندوبست کیا۔ مالی امداد کی رقم جان بوجھ کر کم رکھی گئی تھی تاکہ تنظیمیں امدادی اداروں پر انحصار نہ کرنے لگیں۔ یونی سیف کا فلسفہ خیرات دینے یا فلاحی کام کرنے پر مبنی نہیں بلکہ وہ صرف ایک بار کے لیے مالی مدد فراہم کر کے کمیونٹی تنظیم کے کام میں شرکت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی لگا بندھا طریق کار نہیں رکھا گیا اور تنظیموں کو اس کام میں خاصی لچک فراہم کی گئی۔ صرف بجٹ متعین تھا۔ یونی سیف نے اپنی حیثیت استعمال کر کے سرکاری اہلکاروں کو اس بات پر [illegible] کہ وہ ان تنظیموں کے کیے ہوئے کام کو تسلیم کریں اور انھیں سہولتیں فراہم کریں۔

یونی سیف کے ریذیڈنٹ پروگرام آفیسر ایم زیڈ کریم کے مطابق یونی سیف کے ساتھ کام کرنے سے کمیونٹی تنظیموں کو سرکاری محکموں کی نظر میں اعتبار حاصل ہو جاتا ہے۔ یونی سیف کا خیال ہے کہ دنیا بھر میں، خصوصاً ترقی پذیر ملکوں میں، حکومتیں این جی اوز اور کمیونٹی تنظیموں کو شک و شبے کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ دوسری طرف این جی اوز اور کمیونٹی تنظیمیں حکومت کو بدعنوان اور بے حس سمجھتی ہیں۔ سرکاری فیصلوں پر اثر انداز ہونا تو کجا، کسی اعلیٰ افسر سے ملاقات تک کرنے میں تنظیم کو مہینوں کا وقت لگ جاتا ہے، اور کریم کا کہنا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں یونی سیف موثر انداز میں اپنا کردار ادا کر کے این جی اوز اور حکومت کے درمیان اشتراک عمل قائم کرانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

یونی سیف کے کو آرڈی نیٹر طارق سعید نے اس کردار کا ذکر کیا جو یونی سیف نے سرکاری اہلکاروں کو اس بات سے آگاہ کرنے میں ادا کیا کہ نہ صرف لیاری بلکہ پورے سندھ کے غیر سرکاری شعبے کے پاس کام کرنے کے کتنے زیادہ امکانات موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یونی سیف نے اعلیٰ افسروں کے ٹھٹھہ اور سکھر کے دوروں کا اہتمام کیا تاکہ وہ وہاں کمیونٹی تنظیموں کے تعلیمی پروگراموں کا مشاہدہ کر سکیں۔

کریم کے مطابق ۱۹۷۰ کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے اسکولوں کو قومی ملکیت میں لینے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے نتائج سے ظاہر ہو گیا کہ حکومت کے لیے تمام آبادی کو تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس کے پاس اس کے لیے درکار وسائل نہیں ہیں۔ پہلی پی پی پی حکومت نے اس فیصلے کے تحت تمام پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو سرکاری ملکیت میں لے لیا تھا۔ بعد میں آنے والی حکومتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پرائیویٹ سیکٹر کو رفتہ رفتہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت دیں۔ اسی طرح، کریم کا کہنا ہے، محض پرائیویٹ سیکٹر بھی پوری قوم کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دونوں شعبوں کو اس سلسلے میں مل کر کام کرنا ہوگا۔ انھوں نے ایک مقامی این جی او "بستی" کی مثال دی جس نے کراچی کے ضلع شرقی میں ۴۰۰ ہوم اسکول قائم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے مختلف علاقوں میں ہوم اسکول ٹیچرز ویلفیئر ایسوسی ایشن نے یونی سیف کے تعاون سے ۳۰۰ مزید اسکول قائم کیے ہیں۔

اعداد و شمار بتاتے ہوئے یونی سیف کے اہلکاروں نے کہا کہ سندھ میں اس وقت ۳۷،۰۰۰ پرائمری اسکول موجود ہیں اور سن ۲۰۰۰ تک موجودہ آبادی میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر مزید ۱۳،۷۰۰۰ اسکولوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن آبادی میں اضافے کی اونچی شرح کو دیکھتے ہوئے اسکولوں کی یہ تعداد بھی ناکافی ہوگی۔

یونی سیف کا موجودہ طریق کار یہ ہے کہ ملک میں تعلیم اور صحت کی صورت حال کو بہتر بنانے کے عمل میں حکومت اور لوگوں کی مدد کی جائے۔ حکومت پاکستان نے یونی سیف سے ۱۳ اپریل ۱۹۹۴ کو پولیو کے عالمی دن کے موقعے پر پولیو کی روک تھام کی دوا کے قطرے فراہم کرنے کی درخواست کی۔ یونی سیف نے حکومت کو دوا مفت فراہم کرنے سے انکار کر دیا اور دوا اس وقت فراہم کی گئی جب حکومت نے اس کی قیمت نقد ادا کی۔

یونی سیف کے افسروں نے حکومت کے اس طرز عمل پر بھی تنقید کی کہ وہ بیرون ملک تربیت کے لیے ایسے سینیئر افسروں کو بھیجتی ہے جو ریٹائر ہونے کے قریب ہوتے ہیں یا پھر جن کا دوسرے کسی محکمے میں تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کی بیرون ملک تربیت پر خرچ ہونے والی رقم ضائع ہو جاتی ہے۔

ورکنگ چائلڈ پروجیکٹ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے یونی سیف کے اہلکاروں نے ہمیں اطلاع دی کہ حکومت پاکستان نے بچوں کے حقوق کے عالمی کنونشن پر دستخط کیے ہیں اور اس بنا پر وہ ایسا انتظام کرنے کی ذمہ دار ہے کہ بچوں کے حقوق پامال نہ کیے جا سکیں۔ اس سلسلے میں حکومت کی کارکردگی کی نگرانی کرنے کے لیے جو بین الاقوامی کمیٹی قائم کی گئی تھی اس نے گزشتہ سال حکومت کی پیش کی ہوئی رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا اور اسے اپنے تبصروں اور تجاویز کے ساتھ حکومت کو واپس بھجوا دیا تاکہ وہ ملک میں بچوں کے حقوق کی صورت حال بہتر بنانے کے لیے کوشش کرے۔

آکسفیم: آکسفیم ایک بین الاقوامی این جی او ہے جس کا صدر دفتر برطانیہ میں ہے۔ انجمن کے ارکان کے مطابق آکسفیم نے ان کی جانب سے کی جانے والی مدد کی ایک درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی تھی کہ آکسفیم اس درخواست پر صرف اس صورت میں غور کرے گا اگر این جی او آر سی انجمن کے کام میں شراکت دار ہو یا انجمن کی ضمانت دینے کو تیار ہو۔ انجمن کا کہنا ہے کہ این جی او آر سی نے شراکت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس ادارے کا مقصد مقامی تنظیموں کو پروجیکٹ پروپوزل تیار کرنے کی تربیت دینا اور این جی اوز اور دوسری کمیونٹی تنظیموں کا سرکاری محکموں کے ساتھ رابطہ قائم کرانا ہے۔ انجمن کے کارکنوں کے مطابق این جی او آر سی این جی اوز اور تنظیموں کے ساتھ مشترکہ پروجیکٹس پر کام نہیں کرتی۔ چونکہ آکسفیم کا دفتر اسلام آباد میں ہے، اور اس کے افسر جیون داس جو انجمن کے ساتھ رابطہ کاری کرتے تھے، دو سال کی چھٹی پر ہیں، اس لیے اس معاملے پر آکسفیم کا موقف معلوم نہیں کیا جا سکا۔

این جی او ریسورس سنٹر (این جی او آر سی): ۱۹۹۱ میں آغا خان فاؤنڈیشن نے این جی او سپورٹ پروگرام کے نام سے ایک آزمائشی منصوبہ کراچی کے ضلع جنوبی میں شروع کیا۔ اس زمانے میں کراچی نسلی تشدد اور سیاسی ہنگاموں کے باعث امن و امان کی خراب صورت حال کا شکار تھا۔ ضلع جنوبی کو ابتدا میں منتخب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ شہر کے دیگر تین اضلاع کے مقابلے میں یہ علاقہ نسبتاً پرامن تھا۔ این جی او ایس پی نے ضلعے کے دو حصوں میں کم آمدنی والی بستیوں پر توجہ مرکوز کی۔ یہ لیاری اور منظور کالونی کی بستیاں تھیں۔ شروع میں این جی او ایس پی نے سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ سے رجوع کیا کہ وہ ایسی تنظیموں سے رابطہ

قائم کرنے میں مدد کرے جو ڈپارٹمنٹ کے پاس رجسٹرڈ ہوں۔ ڈپارٹمنٹ نے رجسٹرڈ تنظیموں کی فہرست مہیا کی۔

حکومت پاکستان کے والنٹری سوشل ویلفیئر ایجنسیز رجسٹریشن اینڈ کنٹرول آرڈی ننس (۱۹۶۱) کی رو سے تمام رضاکارانہ فلاحی تنظیموں کا سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ کے پاس رجسٹر ہونا ضروری ہے، خواہ یہ تنظیمیں بچوں، نوجوانوں، عورتوں، ذہنی اور جسمانی معذوروں، گداگروں اور محتاجوں کی فلاح و بہبود، تفریحی پروگراموں، سماجی تعلیم، خاندانی منصوبہ بندی، یا کسی اور شعبے میں سرگرم ہوں۔

سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ کی ڈائرکٹر مسز رخسانہ سلیم نے این جی او ایس پی کے کو آرڈی نیٹر قدیر بیگ کو ایک تقریب میں مدعو کیا جو نوالین میں کام کرنے والی ایک کمیونٹی تنظیم نے منعقد کی تھی، اور جس میں وہ خود مہمان خصوصی تھیں۔ اس تقریب میں آس پاس کے علاقوں میں کام کرنے والی دوسری تنظیموں کے لوگ بھی موجود تھے۔ اس طرح این جی او ایس پی کا رابطہ لیاری کی کمیونٹی تنظیموں کے ساتھ قائم ہوا۔ گفتگو کے دوران کارکنوں نے بتایا کہ کمیونٹی تنظیموں کو جو بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ ان کے غیر مستحکم ہونے کا ہے۔ ان میں سے بیشتر رجسٹریشن کا عمل مکمل ہونے کے کچھ عرصے بعد غیر فعال ہو جاتی ہیں۔ این جی او ایس پی نے اس سلسلے میں ایک تربیتی ورکشاپ منعقد کرنے کی پیش کش کی تاکہ کمیونٹی تنظیموں کو درپیش مسائل کی نشان دہی کر کے ان کے حل تلاش کیے جا سکیں۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (نیپا) کی سربراہ کی حیثیت سے صادقہ صلاح الدین کی خدمات آغا خان فاؤنڈیشن نے ابتدا میں این جی او ایس پی کے لیے تربیت کار کے طور پر حاصل کیں۔ بعد میں وہ اس کے کل وقتی عملے میں شامل ہو گئیں۔ انھوں نے نوالین میں تین ورکشاپس منعقد کیں۔ ان ورکشاپس کے میزبان کے طور پر انجمن اتحاد نوجوانان نوالین کے علاوہ لیاری کی نو دیگر تنظیموں کے چار چار نمائندوں نے ان ورکشاپس میں شرکت کی۔ ان میں تنظیموں کی پائیداری سے متعلق جن مسائل کی نشان دہی کی گئی وہ علاقے کے باشندوں کے پاس مالی وسائل کی کمی، حکومت کی طرف سے مناسب مدد کا فقدان شامل تھے۔ اس سلسلے میں امدادی اداروں کو درمیانی سطح کی این جی اوز کے ممکنہ کردار پر بھی غور کیا گیا۔

ورکشاپس کے بعد این جی او ایس پی نے اعلان کیا کہ اب وہ لیاری کے علاقے میں اپنی سرگرمیاں بند کر رہی ہے کیونکہ اس کا یہ مقصد پورا ہو چکا ہے کہ انتظامی طریق کار کے بارے میں مقامی تنظیموں کی صلاحیت کاری کی جائے۔ تنظیموں نے کارکنوں کی مزید تربیت کی درخواست کی تاکہ وہ دوسری این جی اوز اور بلدیاتی اور ترقیاتی محکموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مقامی تنظیموں کی اعانت کے لیے کراچی میں ایک ریسورس سنٹر کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے این جی او ایس پی نے سنگھو لین میں، جہاں ایک اور مقامی تنظیم وائس (VOICE) کام کر رہی تھی، ایک سٹیلائٹ انفارمیشن سنٹر قائم کیا۔ اس سنٹر کا مقصد ایسی معلومات جمع کرنا اور فراہم کرنا تھا جن کا تعلق شہری باشندوں کے مشترکہ مسائل سے ہو، مثلاً یہ کہ پانی اور نکاس کے نظام کا مسئلہ درپیش ہو تو کے ایم سی اور دوسرے اداروں میں کس سے رجوع کیا جائے۔ اس کے علاوہ سنٹر کا کام علاقے کے باشندوں کی سرکاری محکموں، درمیانی سطح کی این جی اوز اور دوسرے امدادی اداروں کے ساتھ رابطے میں مدد کرنا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ لیاری سے چار کارکنوں کو تربیت دی جائے تاکہ وہ سماجی تنظیم کاروں کے طور پر رضاکارانہ کام کر سکیں اور اس طرح این جی او ایس پی کے کو آرڈی نیٹروں کی جگہ لے سکیں۔

تاہم شرکت کرنے والی کمیونٹی تنظیموں نے سماجی تنظیم کاروں کو دیے جانے والے معاوضے اور انفارمیشن سنٹر کے مقام کے بارے میں سخت اعتراضات کیے۔ انجمن نے خصوصاً یہ محسوس کیا کہ سنٹر کے وائس کی عمارت میں واقع ہونے سے وائس کو دوسری تنظیموں پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ خیال یہ تھا کہ وائس ایک خاص اعتبار اور وقار حاصل کر لے گی، اور اگر این جی او آر سی کی طرف سے سنٹر کو کوئی مالی امداد دی گئی تو وائس کے ارکان پروجیکٹ ٹیم کے ارکان کے طور پر سنٹر کی ملازمتیں حاصل کر لیں گے۔ ان خیالات سے شریک تنظیموں کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے۔ سماجی تنظیم کاروں نے وائس کا دفتر استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اپنے علاقوں سے کام کرنے لگے۔ نوالین سے تعلق رکھنے والے سماجی تنظیم کار نے انجمن کا دفتر استعمال کرنا شروع کر دیا۔

اس دوران ۱۹۹۲ میں این جی او ایس پی نے توسیع پا کر ایک مستقل ادارے کی شکل اختیار کر لی جسے این جی او ریسورس سنٹر کا نام دیا گیا۔ ۹۴-۱۹۹۱ کے عرصے میں این جی او آر سی کے توسط سے انجمن کے ارکان نے پروپوزل تیار کرنے، پروجیکٹ کی منصوبہ بندی کرنے، اور نگرانی اور انتظام کرنے کے شعبوں میں تربیت حاصل کی۔ اس سے انھیں رابطہ کاری میں مہارت حاصل ہوئی اور انھوں نے علاقے میں کام کرنے والی ۱۰ یا ۱۲ تنظیموں کو اکٹھا کیا جو اس تربیت سے پہلے الگ الگ اپنے طور پر ایک ہی قسم کے کام میں مصروف تھیں، اور دوسرے ان کو اپنے کیے ہوئے کام کی دستاویز سازی کے ہنر میں تربیت ملی۔

کارکنوں کا کہنا ہے کہ این جی او آر سی نے انجمن کو مشورہ دیا کہ اپنی سرگرمیوں

کے دائرے میں آنے والے تمام شعبوں، مثلاً صحت، تعلیم، بجلی اور نکاس، کے لیے الگ الگ ارکان پر مشتمل ذیلی کمیٹیاں بنائے۔ اس مشورے پر عمل کرنے سے انجمن کا انتظامی طریق کار خاصا بہتر ہوا۔ انجمن نے اس بات پر خاصی مایوسی کا اظہار کیا کہ کئی این جی اوز، جنھوں نے انجمن کے ارکان اپنے کام تربیت فراہم کی ہے، انجمن کو نمائش کی چیز سمجھتی ہیں۔ انجمن کے ارکان خود کو کسی بڑی این جی او کے کام کا نتیجہ سمجھے جانے کے خلاف ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں این جی او آر سی اور یو آر سی کے توسط سے غیر ملکیوں کے دوروں کا ذکر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان دوروں کا نتیجہ بین الاقوامی اداروں کی طرف سے کسی ٹھوس مدد یعنی تربیت یا صلاحیت کاری کی صورت میں نہیں نکلتا اور یہ دورے مقامی این جی اوز اور غیر ملکیوں کے لیے فوٹو کھنچوانے کے موقعوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

زیر نظر مطالعے کے دوران بھی انجمن کے ایک رکن نے کئی بار یہ سوال کیا کہ اس سے انجمن کو کیا فائدہ ہوگا۔

مقامی این جی اوز

اربن ریسورس سنٹر (یو آر سی): یو آر سی ایک غیر سرکاری ادارہ ہے جسے پیشہ ور ماہرین تعمیرات، انجینئروں، شہری منصوبہ سازوں، ماہرین معاشیات، شہری ترقیات کے ماہروں اور محلوں کی سطح پر سماجی کام کا تجربہ رکھنے والے کارکنوں نے مل کر قائم کیا ہے۔ یو آر سی کا کام شہری مسائل پر آزادانہ تحقیق کرنا اور این جی اوز، کمیونٹی تنظیموں، کارکنوں، قانون سازوں، پالیسی سازوں اور حکومت کو اس بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے۔

اس کا ایک اور مقصد ایسی انفرادی اور اجتماعی اقدامات اور سرگرمیوں کی نشوونما کے لیے راہیں تلاش کرنا ہے جو موزوں ترقیاتی نمونوں اور پالیسیوں کی تشکیل میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ یو آر سی کی گورننگ باڈی کے کئی ارکان اوپی پی آر ٹی آئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یو آر سی کے کوآرڈی نیٹر فضل نور نے شہری مسائل کی دستاویز سازی کی۔ یو آر سی کی سرگرمی کے ایک حصے کے طور پر لیاری کے ایک سماجی اور اقتصادی سروے کے دوران نوالین کے بعض کارکنوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا تھا۔ انجمن کے ارکان نے پہلے ۱۹۹۲ میں اپنے علاقے کے نکاس کے نظام کے بند ہو جانے کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے یو آر سی سے رجوع کیا تھا، اور پھر ۱۹۹۴ میں سڑکوں کی تعمیر کی تکنیکی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس سے رابطہ قائم کیا۔ یو آر سی نے انھیں ایک انجینئر سے ملوادیا۔

یو آر سی کے توسط سے انجمن کی ملاقات ایسی بہت سی این جی اوز اور مقامی تنظیموں سے ہوئی جو لیاری سے باہر کام کر رہی تھیں۔ یو آر سی شہری مسائل کے بارے میں باقاعدگی سے فورم منعقد کرتی ہے جن میں مقامی تنظیمیں ایک دوسرے سے اپنے مسائل کے بارے میں گفتگو اور اطلاعات کا تبادلہ کرتی ہیں۔ ایسا ہی ایک فورم اگست ستمبر ۱۹۹۳ میں پینے کے پانی کے معیار کے بارے میں منعقد کیا گیا۔ ایک این جی او نے جو پینے کے پانی کے معیار اور مقدار کے مسئلے پر مفاد عامہ کے ایک مقدمے کے سلسلے میں فعال تھی، انجمن کو اطلاع دی کہ لیاری سے بھی پانی کے نمونے جمع کیے گئے ہیں جن کی آزمائش کر کے پتا چلایا جائے گا کہ کے ڈبلیو ایس بی کی طرف سے فراہم کیا جانے والا پانی لوگوں کے پینے کے قابل ہے یا نہیں۔

یو آر سی ہی کے ذریعے انجمن کا تعارف اوپی پی آر ٹی آئی سے ہوا۔ اوپی پی آر ٹی آئی نے انجمن کو اپنے علاقے میں چلائی جانے والے نکاس کے نظام کی تعمیر کی اسکیموں کی نگرانی کے لیے جو معلومات فراہم کیں ان کو انجمن نے بہت کارآمد پایا۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (او پی پی آر ٹی آئی): اوپی پی آر ٹی آئی ایشیا میں کم آمدنی والی شہری آبادیوں کے لیے چلائے جانے والے پروگراموں میں سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا مرکز کم لاگت رہائش، سینی ٹیشن، بنیادی صحت اور خاندانی منصوبہ بندی اور چھوٹے کاروباری قرضوں کے پروگرام ہیں۔

انجمن کے ایک رکن الٰہی بخش نے اوپی پی آر ٹی آئی سے ۱۹۹۲ کے وسط میں نکاس کے نظام کے بارے میں تکنیکی معلومات حاصل کرنے کے لیے رابطہ قائم کیا تھا۔ الٰہی بخش کی ملاقات اوپی پی آر ٹی آئی کے ایک انجینئر سلیم علیم الدین سے لیاری کے سماجی اور اقتصادی سروے کے دوران ہوئی تھی جو یو آر سی کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ سلیم بھی یو آر سی کے ایک ایگزیکٹو ممبر ہیں۔ نوالین کی نکاس کی بڑی لائن کا ایک حصہ بند ہو گیا تھا اور گندا پانی سڑکوں پر پھیل رہا تھا۔ فضل نور اور سلیم علیم الدین نے اس مقام کا دورہ کیا، مسئلے کی نشان دہی کی اور پائپ کا جو حصہ ٹوٹ گیا تھا اس کو تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی۔ انجمن نے ان معلومات کے ساتھ کے ڈبلیو ایس بی کے چیف انجینئر (سیوریج ونگ) رشید خان سے رجوع کیا اور پائپ کے متعلقہ حصے کو تبدیل کرانے کی درخواست کی۔ یہ درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی گئی کہ کے ڈبلیو ایس بی کے پاس اس کے لیے درکار رقم نہیں ہے۔

یو آر سی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے نوالین کا معاملہ بھی گفتگو کے لیے

پیش ہوا۔ او پی پی آر ٹی آئی کی ڈائرکٹر اور یو آر سی کی ایگزیکٹو ممبر پروین رحمن نے اس بات کی نشان دہی کی کہ کے ڈبلیو ایس بی والے نوالین کے باشندوں کو نظر انداز کر رہے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ان لوگوں کے پاس مطلوبہ تکنیکی معلومات نہیں ہیں اور نہ انھیں کام پر آنے والی لاگت کا کچھ اندازہ ہے۔ اس لیے وہ آسانی کے ساتھ ان کی درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر سکتے ہیں کہ یہ تکنیکی طور پر ایک نہایت پیچیدہ اور لاگت کے اعتبار سے مہنگا کام ہے جس کے لیے کے ڈبلیو ایس بی کے پاس فنڈز نہیں ہیں۔ یو آر سی نے فیصلہ کیا کہ وہ او پی پی آر ٹی آئی سے نوالین کے نکاس کے نظام کی مرمت کی تکنیکی تفصیلات اور لاگت کا تخمینہ تیار کرنے کو کہے گی۔ کے ڈبلیو ایس بی کے اہلکاروں کے رویے کے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے او پی پی آر ٹی آئی نے ڈیزائن اور تخمینے کی دستاویزات پر اپنی مہریں لگائیں تاکہ ان کے مستند ہونے کا ثبوت دستیاب ہو۔

چیف انجینئر کو ایک منصوبے پر کام کرنے کے باعث او پی پی آر ٹی آئی کے کام سے واقفیت تھی۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کی مالی امداد سے چلنے والے اس پروجیکٹ کے تحت اور نگی کے ایک حصے میں نکاس کا بیرونی نظام کے ڈبلیو ایس بی کو تعمیر کرنا تھا جب کہ اندرونی نظام علاقے کے باشندوں نے او پی پی آر ٹی آئی کی تکنیکی رہنمائی میں تعمیر کیا تھا۔ جب انجمن نے نوالین کے نکاس کے نظام کی مرمت کی تجویز مکمل تکنیکی تفصیلات اور لاگت کے تخمینے کے ساتھ کے ڈبلیو ایس بی کو پیش کی تو چیف انجینئر نے اسے فوراً منظور کر لیا۔ نوالین کے کارکن تبدیل شدہ نکاس کی لائن کو اوور فلو لائن کا نام دیتے ہیں۔

انجمن نے ۱۹۹۴ کے وسط میں ایک بار پھر او پی پی آر ٹی آئی سے رابطہ قائم کیا اور کم لاگت سینی ٹیشن کے سلسلے میں تربیت فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اس تربیت میں سروے کرنے کی تکنیکیں، پانی اور نکاس کی لائنوں کی سطح ناپنے کے طریقے، مین ہولوں کی تعمیر، پائپوں کو بچھانے کا طریقہ اور ان تمام اجزا کی لاگت کا تخمینہ تیار کرنا شامل تھے۔ او پی پی آر ٹی آئی نے انجمن کے دو کارکنوں کے لیے چھ ہفتوں کی تربیت کا انتظام کیا۔ زیر تربیت کارکنوں کو او پی پی آر ٹی آئی کی طرف سے پچاس روپے روز وظیفہ دیا گیا تاکہ ان کا آنے جانے اور کھانے کا خرچ پورا ہو سکے۔ دونوں کارکنوں نے صرف تین ہفتے کی تربیت مکمل کی۔

لیاری سے منتخب ہونے والے رکن صوبائی اسمبلی اور ڈپٹی اسپیکر نبیل گبول نے بھی گزشتہ سال او پی پی آر ٹی آئی کا دورہ کیا اور کمیونٹی اور حکومت کی شراکت داری کے سلسلے میں او پی پی آر ٹی آئی کے اندرونی اور بیرونی تعمیر کے طریقے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس طریقے میں گلی کی سطح پر پانی اور نکاس کی لائنیں ڈالنے کا کام باشندے خود اپنے خرچ پر کرتے ہیں جبکہ حکومت پانی اور نکاس کی بڑی لائنیں ڈالنے کا بیرونی کام انجام دیتی ہے۔ چونکہ او پی پی آر ٹی آئی کے طریقے میں ٹھیکے دار کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اس لیے کام کی لاگت کے ڈبلیو ایس بی کے تخمینے کے مقابلے میں دسویں حصے کے برابر رہ جاتی ہے۔

او پی پی آر ٹی آئی نے لیاری کے ایسے علاقوں کی نشان دہی کرنے کی پیش کش کی جہاں اور نگی کے نمونے پر ترقیاتی کام کیا جا سکتا ہو، بشرطیکہ رکن صوبائی اسمبلی علاقے کا ماسٹر پلان مہیا کر سکیں۔ نبیل گبول نے اس پیش کش کے بارے میں لیاری کے ایک اور علاقے سنگھو لین کے باشندوں سے بات کی۔ وہ ان لوگوں کے رد عمل سے سخت مایوس ہوئے، کیونکہ ان کا کہنا تھا، "ہم نے آپ کو اس لیے ووٹ نہیں دیے تھے کہ آپ ہمیں اپنے خرچ پر اور اپنی مدد آپ کے تحت ترقیاتی کام کرنے کی تلقین کریں۔ اب آپ حکومت میں آگئے ہیں تو یہ کام آپ کو کرانا چاہیے۔" نبیل گبول نے علاقے کا ماسٹر پلان مہیا نہیں کیا اور نہ ہی دوبارہ او پی پی آر ٹی آئی سے رابطہ قائم کیا۔ نبیل گبول کا او پی پی آر ٹی آئی سے تعارف ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی کے ایک ذاتی دوست محمد نعمان نے کرایا تھا جو این ای ڈی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کے استاد ہیں اور یو آر سی کے رکن بھی ہیں۔

انجمن کے رکن الٰہی بخش نے بھی نقشہ فراہم کرنے کی پیش کش کی تاکہ او پی پی آر ٹی آئی رکن صوبائی اسمبلی کے ساتھ اس سلسلے میں پیروکاری کر سکے کہ وہ حکومت سے او پی پی آر ٹی آئی کے طریق کار کی منظوری حاصل کریں۔ تاہم انجمن نے اب تک اس سلسلے میں کوئی عملی پیش رفت نہیں کی ہے۔

اس اثنا میں او پی پی آر ٹی آئی کے رشید کھتری نے (جو پیشے کے اعتبار سے سول انجینئر ہیں) انجمن کو الٰہی بخش کی درخواست پر سڑکوں کی تعمیر کی تکنیکی تفصیلات فراہم کی ہیں تاکہ کے ایم سی کے بلڈنگ اینڈ روڈ ڈپارٹمنٹ کی جانب سے علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کے کام کی موثر نگرانی کی جا سکے۔

ٹیچرز ریسورس سنٹر (ٹی آر سی): ۱۹۹۰ میں یونی سیف نے ایک مقامی این جی او ٹی آر سی کے ذریعے لیاری کے اسٹریٹ اسکولوں کا ایک سروے کرایا تھا۔ اس سروے کا مقصد "دشوار حالات میں رہنے والے بچوں" کی نشان دہی کرنا تھا جن کو اپنے مخصوص حالات کے باعث نظر انداز یا پامال کیے جانے کا خطرہ درپیش ہو۔ ان میں وہ بچے شامل تھے جو اسکول نہیں جاتے، یا جنھیں مزدوری کرنی پڑتی ہے یا جن کے باپ یا ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس سروے کے نتیجے میں گلی

اسکولوں کے اساتذہ کے لیے ایک تربیتی کورس کا اہتمام کیا گیا۔

انجمن کو بعض تربیتی اداروں کی عائد کردہ شرائط پر اعتراضات ہیں۔ مثال کے طور پر ٹی آر سی نے اپنے ایک ٹریننگ پروگرام میں شریک ہونے والے ہر فرد سے ایک ہزار روپے جمع کرانے کو کہا جو پروگرام کے اختتام پر واپس کیے جانے تھے۔ انجمن کے ارکان اس شرط کو پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، چنانچہ انھیں اس پروگرام کے لیے نامزد نہیں کیا جاسکا۔

لیاری میں کام کرنے والی ایک اور تنظیم "لیڈ" نے بھی نئے تدریسی طریقوں کے متعلق یہی تربیت دی اور اس کے لیے صرف سو روپے فی شریک وصول کیے جو ٹریننگ میں کام آنے والی اشیا کی خریداری کے لیے تھے۔ لیڈ نے یہ تربیت ٹی آر سی سے حاصل کی تھی۔ انجمن کا خیال ہے کہ ٹی آر سی جس قسم کی تربیت دیتی ہے وہ سرکاری اسکولوں کے کل وقتی استادوں کے لیے زیادہ موزوں ہے اور رضاکارانہ اور جز وقتی طور پر پڑھانے والوں کی ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتی۔

عورتوں کا کردار

(یہ حصہ نورا فرنانڈیز نے تحریر کیا اور اس میں مزید اضافہ انٹرویوز کے ذریعے جمع کی جانے والی معلومات کی مدد سے کیا گیا۔ یہ انٹرویو زرقا آرائیں اور رشید کھتری نے کیے۔)

آمدنی پیدا کرنے والی سرگرمیاں

لیاری کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں نوالین میں عورتوں کے متحرک ہونے پر پابندیاں زیادہ شدید محسوس ہوتی ہیں۔ لیاری کے دوسرے محلوں میں بلوچ عورتیں گھروں میں کام کاج کرتی ہیں، کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنے اور بیچنے کی سرگرمیاں انجام دیتی ہیں جن کے لیے انھیں دن کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے گھروں اور محلوں سے باہر گزارنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ عورتیں عموماً ٹولیاں بنا کر باہر نکلتی ہیں، البتہ عمر رسیدہ عورتیں تنہا بھی آتی جاتی ہیں۔ عورتوں کے گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کا یہ رجحان بڑھتی ہوئی مہنگائی اور کساد بازاری کے باعث بڑھ رہا ہے۔ تاہم نوالین میں گھر سے باہر نکل کر کام کرنے میں عورتوں کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

تاہم بڑھتے ہوئے اقتصادی دباؤ کے باعث ان میں سے بعض عورتوں نے اپنے گھروں میں، یا گھر سے باہر (لیکن اپنی ہی گلی میں)، چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر دیے ہیں۔ یہاں وہ بیکری کی چیزیں یا دوسری کھانے کی اشیا فروخت کرتی ہیں، سلائی اور کڑھائی کا کام کرتی ہیں، بچوں کے کھانے کے لیے سورج مکھی کے بیج پیک کر کے بیچتی ہیں، بکریوں کے لیے مالائیں بناتی ہیں یا بکریاں اور مرغیاں پالتی ہیں۔ اس طرح وہ دن میں ۵ روپے سے ۴۰ روپے تک کما لیتی ہیں۔ بہت کم عورتیں ایسی ہوں گی جو اس پیداوار یا فروخت کے کام کو "کاروبار" کا نام دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ یہ چیزیں محض مہنگائی کا مقابلہ کرنے کے لیے فروخت کرتی ہیں۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ اپنے کاروبار کو توسیع دینے کے لیے قرض لینا پسند کریں گی تو انھوں نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ اس قرض کو لوٹا سکیں گی۔

ایک اور طریقہ جس کے ذریعے نوالین کی عورتیں نقد رقم تک رسائی حاصل کرتی ہیں، "بیسی" ہے۔ یہ بچت کا ایک روایتی طریقہ ہے جس میں چند لوگ ہر ہفتے یا ہر مہینے ایک مخصوص رقم آپس میں جمع کرتے ہیں۔ یہ جمع شدہ رقم ہر مہینے یا ہر ہفتے باری باری گروپ کے ہر رکن کو دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ہر رکن کو ایک بار یہ رقم نہ مل جائے۔ عموماً یہ سلسلہ ایک چھوٹی مدت کے لیے ہوتا ہے اور ایک بار کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر مثال کے طور پر گروپ دس ارکان پر مشتمل ہو اور ہر رکن ۵۰۰ روپے جمع کراتا ہو تو اسے بیسی کی معیاد کے دوران کسی نہ کسی موقعے پر ۵۰۰۰ روپے یک مشت مل جاتے ہیں۔ اس طرح اسے ایک بڑی رقم ایک ساتھ دستیاب ہو جاتی ہے جسے وہ اپنی کسی فوری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

عورتوں کا کہنا ہے کہ بیسی کے طریقے کو جاری رکھنے میں ایک دقت یہ پیش آتی ہے کہ لوگ باقاعدگی سے اپنا حصہ ادا نہیں کر پاتے۔ چھوٹی بیسی (جس میں لوگ ۲۰ سے ۱۵۰ روپے تک ڈالتے ہیں) کی اکٹھی رقم عموماً ڈاکٹر کی فیس، دواؤں، کپڑوں یا زیورات کی مد میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً بلوچی کڑھائی والا سوٹ ۵۰۰ سے ۱۵۰۰ روپے تک میں آتا ہے اور کئی سال تک پہنا جاتا ہے۔ بڑی بیسی (جس میں ۲۰۰ سے ۱۵۰۰ روپے تک ڈالے جاتے ہیں) سے حاصل ہونے والی رقم (جو بیس ہزار سے پچاس روپے تک ہوتی ہے) مکان کو بہتر بنانے یا وسیع کرنے میں یا شادی بیاہ کے اخراجات پورے کرنے میں کام آتی ہے۔

نوالین میں کچھی کمہار بھی رہتے ہیں۔ ان کی تمام عورتیں بھی مٹی کے برتن بنانے اور بیچنے کے کام میں مردوں کے ساتھ شامل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گھروں کے باہر کھلے احاطوں میں اپنے مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں اور ان کی آمدنی بھی مردوں کے برابر ہے۔ شادیاں صرف ان کی اپنی برادری میں کی جاتی ہیں۔ پہلے

لڑکیوں کی شادی تیرہ چودہ سال کی عمر میں کر دی جاتی تھی، لیکن اب عموماً سولہ سترہ برس کی عمر میں شادی کی جاتی ہے۔ برادری کے افراد کے درمیان پردے کا رواج نہیں ہے۔ عورتیں گھر کا سارا کام کاج کرتی ہیں اور مرد باہر کی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں۔ عورتیں خریداری کے لیے اپنے مردوں کے ساتھ جاتی ہیں اور اکثر کنبے والے اکٹھے سیر کرنے یا پکنک منانے جاتے ہیں۔

رہائش

نوالین میں مکانات چھوٹے بڑے ہیں۔ جو لوگ یہاں پہلے آباد ہوئے ان کے مکانوں کا رقبہ زیادہ ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ مکانوں کی اونچائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اب چار چار منزلہ مکانات بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ قانونی طور پر ممنوع ہے۔ کنبے کے ہر مرد کو شادی کے بعد الگ کمرہ دیا جاتا ہے اور جوں جوں اس کا خاندان بڑھتا ہے ایک کمرے میں (جو ۱۰فٹ X ۱۵فٹ کا ہوتا ہے) اوسطاً سات افراد آباد ہوتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں کئی کئی خاندان کنبے کے دو یا تین مرد ارکان کی آمدنی پر انحصار کرتے ہیں، جن میں سے ایک ضرور مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں کام کرنے گیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ وہاں عموماً مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں اور ہر مہینے ۲ ہزار سے ۵ ہزار روپے تک گھر بھیجتے ہیں۔

ایک سرکاری اسکول کی طالبات چھٹی سے واپسی پر

جگہ کی قلت کی وجہ سے ہر کمرے میں فرنیچر اور دوسرا اسامان کم سے کم رکھا جاتا ہے: کپڑے، بستر اور قیمتی چیزیں رکھنے کے لیے ایک الماری، ایک چٹائی یا دری، اور اگر خاندان کی مالی حیثیت اس کی اجازت دے تو ایک ٹی وی۔ ان میں سے چند بہتر حیثیت کے مکانات میں کمرے کا بیشتر حصہ روایتی بلوچی مسہری نے گھیرا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں چار عمودی ڈنڈے ہوتے ہیں جو اصل میں غالباً مچھر دانی لگانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ کھانا پکانے کی جگہ عموماً صحن میں واقع ہوتی ہے اور عورتوں اور بچوں کی دن بھر کی سرگرمیوں کا مرکز گھر کا یہی حصہ ہوتا ہے۔ مکانوں میں بیت الخلا اور غسل خانہ عام طور پر مشترک ہوتا ہے۔

عورتوں کا کہنا ہے کہ مکان کی تعمیر اور نقشہ تیار کرنے کے سلسلے میں ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ اس کو گھر کے مردوں اور مکان بنانے والے ٹھیکے دار کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ مردوں کے لیے سب سے اہم خیال عورتوں کے پردے کا ہوتا ہے، جس کا اظہار مکان کے ڈیزائن میں اس طرح ہوتا ہے کہ باہر کھلنے والے ہر دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک دیوار بنائی جاتی ہے۔ کھڑکیاں یا تو نظروں کی سطح سے اوپر بنائی جاتی ہیں یا ان پر بھاری پردے لٹکائے جاتے ہیں۔ صحن اور کھلی جگہ کے اردگرد اونچی چاردیواری ہوتی ہے۔ ان سب کی وجہ سے مکان میں ہوا اور روشنی کی آمدورفت قربان ہو جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں، جب جگہ کی اتنی قلت نہ تھی، ہوا اور روشنی کے لیے گنجائش رہتی تھی۔ تاہم، عورتیں مکانوں کے ڈیزائن کے سلسلے میں اپنے مشورے ضرور دیتی ہیں اور اگر وہ اپنی بات پر اصرار کریں یا انھیں احترام کا درجہ حاصل ہو تو ان کی بات مان بھی لی جاتی ہے۔

مردوں اور عورتوں میں ذمہ داریوں کی تقسیم

گھر کے اندر کا سارا کام کاج عورتوں کی ذمہ داری ہے۔ اس میں سودا سلف اور کپڑوں کی خریداری، اور گھر کے خرچ کا حساب کتاب بھی شامل ہے۔ مرد اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ خریداری کے لیے نکلنے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ نوالین میں مشترکہ خاندان کا رواج ہے اور ایک مکان میں رہنے والوں کی تعداد ۱۵ تک ہو سکتی ہے۔ گھر کا خرچ چلانے کی ذمہ داری عموماً گھر کی سب سے زیادہ عمر والی شادی شدہ عورت کے سپرد ہوتی ہے۔

وہ عورتیں جو گھر میں رہ کر آمدنی پیدا کرنے کی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہیں، ان کو گھر کی ذمہ داریوں اور بچوں کی دیکھ بھال سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ گھر کے بوڑھے، کمسن اور بیمار افراد کی دیکھ بھال بھی عورتوں کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔

گھر کی تمام عورتوں سے، خواہ وہ کسی بھی عمر کی ہوں، گھر کے تمام مردوں کی خدمت کرنے کی توقع کی جاتی ہے، مثلاً پانی لاکر دینا، وقت بے وقت کھانا پیش کرنا اور دوسری ضروریات کا خیال رکھنا۔

گھر کے باہر کے تمام کام مثلاً روزی کمانا اور بل ادا کرنا وغیرہ، مردوں کی ذمہ داری تصور کیے جاتے ہیں۔ چونکہ نوالین میں بہت سے جوان اور بوڑھے مرد بے روزگار ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ قریب کے فٹ بال گراؤنڈ میں یا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور گھر صرف کھانا کھانے یا سونے کی غرض سے آتے ہیں۔

آمدورفت

بیشتر نوعمر عورتوں نے بتایا کہ وہ اپنی تعلیم پوری کرنا یا قریب کے کسی اسکول میں پڑھانا چاہتی ہیں، لیکن زیادہ تر صورتوں میں انھیں اس کی اجازت نہیں ملتی۔ انھیں انجمن کے دفتر تک جانے کی بھی اجازت نہیں ملتی جو بستی کے بالکل سامنے واقع ہے کیونکہ وہاں جانے کے لیے گلی کے باہر کھلے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ گلی کے اندر لڑکیاں اور عورتیں دوسرے گھروں میں ملنے ملانے اور بات چیت کرنے کے لیے آزادی سے آجا سکتی ہیں۔ ٹولی کی صورت میں وہ بازار جاکر ضروری اشیا کی خریداری بھی کرلیتی ہیں۔

نوجوان لڑکیوں کے گلی سے باہر آنے جانے کا انحصار اس بات پر ہے کہ انھیں ساتھ جانے کے لیے اپنی عمر کی یا بڑی عمر کی کوئی عورت دستیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ عورتیں کسی عام جگہ اکیلی نہیں جاسکتیں۔ ساتھ جانے کے لیے کسی عورت کو راضی کرنا بھی ہمیشہ اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ہر عورت کی آمدورفت پر پابندیاں کم سے زیادہ شدید تک ہوتی ہیں۔ عورتوں کو آمدورفت کی کتنی آزادی ہے اس کا دارومدار گھر کے مردوں کے غیر رسمی فیصلوں پر ہوتا ہے۔

بہت سی عورتوں نے بتایا کہ اگرچہ ان کے بھائی یا شوہر ان کے باہر نکل کر اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر اعتراض نہیں کرتے، لیکن ان کے بڑے بھائیوں یا باپوں کو اس پر اعتراض ہوتا ہے اور ان کی ہی بات مانی جاتی ہے۔ بڑی عمر کی عورتوں کو بھی اس بات پر رنجیدہ دیکھا گیا کہ نوجوان بلوچ عورتیں اب بڑی تعداد میں بازار یا علاقے سے باہر آنے جانے لگی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ایک خراب تبدیلی ہے۔

جو عورتیں انجمن کے دفتر میں سلائی سیکھنے یا مفت کلاسوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتی تھیں انھوں نے اب جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ ان کے گھر کے مرد اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ عورتیں خود بھی عام جگہوں پر اکیلے آتے جاتے، یا مردوں سے مخاطب ہوتے ہوئے گھبراتی ہیں کہ کہیں ان کو گھر کے مردوں کی باتیں نہ سننی پڑیں۔ انجمن کے ایک مرد رکن نے بتایا کہ کوئی مرد رکن (جو عموماً کوئی رشتے دار ہوتا ہے) کسی عورت سے انجمن کے دفتر میں بات چیت کرنے کے بعد گھر جاکر اسے ڈانٹتا ہے کہ وہ اتنی آزاد خیال ہوگئی کہ دفتر میں آکر سب کے سامنے اس سے بات کرنے لگی۔

اوپر جن مسائل کا ذکر کیا گیا وہ ایک قبائلی معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب تک یہ تبدیلیاں نہیں آئی تھیں، مردوں اور عورتوں کا دائرۂ کار واضح طور پر متعین تھا۔ وسیع سماجی ماحول میں ہونے والی یہ تبدیلیاں عورتوں کے لیے بھی اتنی ہی اجنبی ہیں جتنی مردوں کے لیے۔ ان تبدیلیوں نے برسوں کے جانے پہچانے رواجوں میں رخنہ ڈال دیا ہے۔ مثال کے طور پر دس پندرہ سال پہلے تک محلے کے سب خاندان ایک ساتھ ساحل سمندر پر یا کراچی کے نواح میں واقع باغوں میں پکنک منانے جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ پیروں کے عرس وغیرہ میں شرکت بھی ایک عام بات تھی۔ ان تقریبات میں ناچ گانا بھی ہوتا تھا جس میں سب لوگ حصہ لیتے تھے۔ لیکن اب بدلے ہوئے رویوں، کراچی کی زندگی میں عدم تحفظ کے احساس اور مذہبی جماعتوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کی وجہ سے یہ سرگرمیاں اب بہت کم ہوگئی ہیں۔

مذہبی اثرات

علاقے کے بیشتر مرد اہل سنت فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۵ میں نوالین سے سو مردوں اور نوعمر لڑکوں کی ایک جماعت بذریعۂ بس سالانہ تبلیغی اجتماع میں شرکت کی غرض سے ملتان روانہ ہوئی۔ علاقے کے لوگ خوش ہیں کہ ان کے لڑکے اہل سنت میں شامل ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس طرح انھیں درست راستے پر آنے کا موقع ملے گا۔ انجمن کے نوجوان عہدے داروں میں سے تین ابھی ڈیڑھ برس پہلے تک اہل سنت میں شامل تھے۔ عورتوں نے کہا کہ وہ نہیں جانتیں انھوں نے یہ جماعت کیوں چھوڑی۔ تاہم اس فرقے کی نظریاتی ساخت زیادہ آزاد خیال شہری اقدار سے متصادم ہے جو کراچی کے وسیع تر تناظر میں، اور خصوصاً ذرائع ابلاغ کے اثر سے، زیادہ طاقت ور ہوتی جارہی ہیں۔ اس سے بھی لوگوں کے ذہنی کنفیوژن میں اضافہ ہورہا ہے۔

تعلیم

اسکول جانے والی لڑکیوں میں زیادہ تعداد ان کی ہے جنھوں نے میٹرک پورا کرنے سے پہلے ہی تعلیم ترک کر دی۔ ۱۹۷۷ میں لعل بخش کی بہن پروین نوالین کی پہلی لڑکی تھی جس نے میٹرک کیا۔ وہ اور بھی آگے تعلیم حاصل کر کے کچھ بننا چاہتی تھی لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ اکیلی تھی اور اسے کسی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ اسے محلے کے ایک اسکول میں پڑھانے کی ملازمت کے سلسلے میں مدد کی توقع تھی۔

اسکول چھوڑنے والی لڑکیوں کی اتنی بڑی تعداد کا سبب یہ بھی ہے کہ اسکولوں میں تعلیم کا معیار بہت گھٹیا ہے، کلاسوں میں بچوں کا ہجوم ہوتا ہے، استاد طلبا کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے، اور اس کے علاوہ ان سے اپنے ذاتی کام کرنے مثلاً سلائی کرنے اور سودا سلف لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ باتیں پورے لیاری کے اسکولوں میں عام ہیں۔ نوالین میں اسکولوں کے گھروں سے نزدیک ہونے کے باوجود لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد تعلیم کو پہلے پانچ سال مکمل کیے بغیر چھوڑ دیتی ہے۔ تیس سال سے کم عمر کی عورتوں میں سے بیشتر نے پانچ سے آٹھ سال تک تعلیم حاصل کی ہے یا بالکل نہیں کی۔ بہت کم عورتوں نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی ہے اور قریب کے کالج میں بی اے تک تعلیم حاصل کرنے والی عورتیں اکا دکا ہیں۔ لیکن اجتماعی معاملات میں ان تعلیم یافتہ عورتوں کے فعال ہونے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ ان میں سے بعض نے اپنے محلے کے افراد سے لکھنا پڑھنا سیکھا یا گھر پر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ لیکن اس قسم کی کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہوئیں اور چند ہفتوں میں ختم ہو گئیں۔

انجمن کے تعلیمی مرکز میں پڑھانے والوں میں چار یا پانچ نوجوان لڑکیاں شامل ہیں (جن کی عمر ۱۲ یا ۱۳ برس کی ہے)۔ انجمن کے عہدے داروں کا کہنا ہے کہ انھیں ان نوجوان لڑکیوں سے بہت سی امیدیں ہیں، اور یہ لڑکیاں نوالین کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لیے جو سماجی کام میں شامل ہونا چاہتی ہیں، مثال کا کام دیں گی۔ ان میں سے تین لڑکیوں کے خاندانوں کا کہنا ہے کہ وہ سنٹر میں اپنے کام کے بارے میں بہت کم بات چیت کرتی ہیں اور اپنی بہنوں کو وہاں ہونے والے پروگراموں اور تقریبوں کی اطلاع بھی نہیں دیتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بڑی عمر کی عورتیں اور نوجوان

گھوڑا گاڑیاں لیاری میں اب بھی موجود ہیں

لڑکیاں پروگرام میں شریک ہوئیں تو انھیں بٹھانے کے لیے پردہ ٹانگنا پڑے گا اور اس مسئلے پر انجمن کے ارکان کے مابین خاصی بحث و تکرار ہو چکی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے وہ عورتوں کو پروگراموں میں مدعو نہیں کرتیں۔

تعلیم یافتہ عورتیں نوالین کے علاقے کے لیے ایک نیا مظہر ہیں۔ یوں تو یہ بات خواندگی کی شرح کو دیکھتے ہوئے تعلیم یافتہ مردوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ تاہم ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بدولت ایک ایسے معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہوں گی جس نے بدلے ہوئے سماجی ماحول میں اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے۔

ٹرانسپورٹ

لیاری کے بیشتر دوسرے محلوں کی طرح نوالین میں بھی بسیں اور ویگنیں نہیں جاتیں۔ یہاں آمد و رفت کا بنیادی ذریعہ پرائیویٹ سوزوکی پک اپ اور تانگے ہیں جو صرف آس پاس کے کاروباری علاقوں تک پہنچاتے ہیں۔ وہاں سے بسوں اور ویگنوں کے ذریعے کراچی کے کسی بھی علاقے تک آمد و رفت ممکن ہے۔

بہت سی عورتیں نوالین سے آنے جانے کے لیے رکشا میں سفر کرتی ہیں جو مہنگا پڑتا ہے (رنچھوڑ لائن تک جانے میں ۲۵ روپے تک خرچ ہو جاتے ہیں)، لیکن بھیڑ بھاڑ سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔ سفر کی وجوہ میں خریداری اور رشتے داروں کے گھر یا ہسپتال آنا جانا شامل ہے۔

ثقافت

عورتوں میں بلوچ ثقافت اور روایات سے وابستگی خاصی گہری ہے۔روزمرہ اور تقریبات میں پہننے کے لیے بلوچ لباس عام ہے، اگرچہ نوجوان لڑکیاں رسمی مواقع کے لیے زیادہ مقبول لباس پہنتی ہیں۔(انجمن کے زیرِاہتمام چلائے جانے والے سلائی کے مرکز میں روایتی بلوچ لباس کے بجائے شہر میں مقبول جدید لباس تیار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔)

پچیس سال پہلے بلوچ عورتوں کا لباس اب سے مختلف وضع قطع کا ہوتا تھا۔ اسے ہاتھ سے سیا جاتا تھا اور ہر بلوچ عورت سے یہ ہنر جاننے کی توقع کی جاتی تھی۔ اب یہ ہنر بہت کم عورتوں میں رہ گیا ہے کیونکہ بیشتر عورتوں نے اسے اپنی نئی نسل کی لڑکیوں کو نہیں سکھایا۔ نوالین کی بہت سی عورتیں اب اپنے شادی کے لباس سلوانے کے لیے بلوچستان بھیجتی ہیں۔ مشینی کڑھائی کی آمد کے بعد سے کڑھائی کا ہنر مردوں کے پاس چلا گیا جو اب انجمن کے دفتر کے سامنے قطار سے دکانیں کھولے بیٹھے ہیں اور عورتوں کے لباسوں پر رنگین بلوچی کڑھائی کرتے ہیں۔

ایک بلوچ رواج جو اب تک قائم ہے وہ شادی کی دعوت دینے کا طریقہ ہے۔شادی سے پہلے کے چند ہفتوں میں دس سے بیس تک شادی شدہ عورتیں ایک گروپ کی صورت میں دولھا اور دلھن کے ہر رشتے دار اور دوست کے گھر شادی کی دعوت زبانی پہنچانے جاتی ہیں۔جب کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو قبیلے کی تمام شادی شدہ عورتیں چھ دن تک ہر روز اس عورت کے گھر جاکر اس کے پاس کچھ دیر بیٹھتی ہیں۔(اگر اس کا گھر دور ہو تو وہ وہیں ٹھہر جاتی ہیں۔) تاہم ایسی میل ملاقات سے نوجوان عورتوں کے خیال میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ گفتگو زیوروں، کپڑوں اور بچوں تک ہی محدود رہتی ہے۔

بعض بڑی عمر کی عورتوں کو اس بات کا افسوس ہے کہ شادی کی تقریبات میں اب جدید زمانے کے موسیقی اور ریکارڈنگ کے آلات شامل ہو گئے ہیں۔پرانے زمانے میں ایسی تقریبات کے موقعے پر بلوچ عورتیں مل جل کر ناچتی گاتی تھیں۔ عورتیں روایتی ساز (مثلاً دھات کے دو برتنوں اور ایک تھال سے بنایا گیا ڈھول) بجاتی تھیں اور اس کے لیے خاص مہارت کی ضرورت پڑتی تھی۔ آج بھی بہت سی عورتیں شادی کی تقریب میں رقص کرتی ہیں لیکن نوجوان لڑکیاں ایسا کرتے ہوئے شرماتی ہیں۔

نوالین میں ذاتی اور اجتماعی رقبے کا تصور سختی سے برقرار رکھا جاتا ہے۔مردوں والے حصے میں نوجوان شادی شدہ یا کنواری لڑکیوں کا موجود ہونا معیوب خیال کیا جاتا ہے اگرچہ اب اس طرح کی موجودگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

این جی اوز کی مداخلت

کچھی میمن جماعت: ۱۹۹۱ میں نوالین کی ۱۵ عورتوں کے ایک گروپ نے کچھی میمن جماعت کے دفتر میں ہنروں کی تربیت حاصل کی۔یہ جماعت بنیادی طور پر جاکیواڑا کے میمنوں کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک فلاحی مرکز چلاتی ہے۔اس تربیت کا بندوبست فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان کی مسز جمشید کے توسط سے کیا گیا تھا تاکہ عورتوں کو چھوٹے کاروبار چلانے کے لیے کھانے پینے کی اشیا تیار کرنے کی مہارت حاصل ہو سکے۔انھوں نے دو ہفتے کی تربیت کے دوران چیوڑا اور رس گلے بنانا سیکھا۔ لیکن جماعت نے انھیں اگلی کلاسوں کے بارے میں مطلع نہیں کیا اور یہ عورتیں بھی جماعت سے رابطہ برقرار نہ رکھ سکیں۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ اگر وہ یہ چیزیں اپنے طور پر تیار کر بھی لیں تو ان کو بیچنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جن عورتوں نے اس پروگرام میں شرکت کی ان کو محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔

پاسبان: تقریباً ان ہی دنوں مذہبی پارٹی جماعت اسلامی کے نوجوان ونگ پاسبان نے اپنی نمائندہ دو عورتوں کو نوالین بھیجا کہ وہ وہاں کی عورتوں سے دریافت کریں کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ فیصلہ ہوا کہ عورتوں کے لیے ابتدائی طبی امداد کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔انڈسٹریل ہوم سے چار لڑکیوں کو اور کمہار واڑہ اور نوالین سے ۱۲ یا ۱۳ عورتوں کو اس تربیت کے لیے منتخب کیا گیا۔ تاہم یہ سب باتیں طے ہو جانے کے بعد پاسبان کی عورتوں نے نوالین آنا چھوڑ دیا۔ عورتوں کے مطابق اس عمل سے بھی انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

آرم ویلفیئر: مارچ ۱۹۹۴ میں انجمن کے رکن الٰہی بخش کی دعوت پر بغدادی کی کمیونٹی تنظیم آرم ویمن اینڈ چلڈرن ویلفیئر نے، جس کا ایک فعال ویمن ونگ ہے اور جو کئی تعلیمی اور سماجی پروگرام چلا رہی ہے، نوالین کا دورہ کیا اور وہاں کی تقریباً ۱۲ عورتوں سے ملاقات کی (جو تنظیم کے عہدے داروں کی رشتہ دار تھیں)۔ انھوں نے عورتوں سے دریافت کیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہیں۔ عورتوں نے جواب دیا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہیں۔

کچھ دن بعد ایک دوسری میٹنگ میں، جس میں ۲۰ عورتوں نے شرکت کی، ایک کور گروپ تشکیل دیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ گروپ اپنی سرگرمیوں کا آغاز ۱۳ اپریل ۱۹۹۴ کو عالمی پولیو ڈے کے موقعے پر پولیو ویکسین کی مہم سے کرے گا۔ اس سلسلے میں انجمن کی طرف سے کچھ مزاحمت ہوئی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ عورتیں ویکسین کے قطرے پلانے کا کام نہیں کر سکیں گی۔ عورتوں نے اپنی بات پر اصرار کیا اور ۱۲ اپریل کی رات کو ان کے پروگرام کو آخری شکل دے دی گئی۔ دن بھر کے پروگرام میں انھوں نے ایک عورت کے مکان پر محلے کے ۵۰ بچوں کو پولیو ویکسین کے قطرے پلائے۔

جون ۱۹۹۵ میں آرم ویلفیئر نے لیاری کے ۱۲۷ اسٹریٹ اسکولوں کے استادوں کی تربیت کے لیے ایک ٹیچرز ٹریننگ کورس کا انعقاد کیا۔ نوالین کے استادوں کو بھی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے اس میں شرکت نہیں کی۔ ایجوکیشن سنٹر چلانے کے ذمہ دار نوجوان استاد رئیس نے آرم سے اس سلسلے میں مدد کی درخواست کی کہ وہ نوالین ایجوکیشن سنٹر کے استادوں کے لیے تربیتی پروگرام خود چلا سکیں۔ آرم ویلفیئر نے رئیس کو تربیت کے لیے ایک ورک پلان تیار کرنے میں مدد دی۔ اس میں ۱۶ استادوں نے شرکت کی جن میں سے چھ نوجوان لڑکیاں تھیں جو ایجوکیشن سنٹر میں پڑھاتی تھیں اور خود بھی سیکنڈری اسکول کی طالبات تھیں۔

لیاری اربن کمیونٹی ڈویلپمنٹ: پندرہ دن بعد لیمری روڈ پر عثمان پارک کے قریبی علاقے کی ایک تنظیم لیاری اربن کمیونٹی ڈویلپمنٹ نے آرم کی ایک رکن سے رابطہ قائم کیا اور درخواست کی کہ نوجوان لڑکیوں کے لیے ہنرمندی کی تربیت کا ایک کورس منعقد کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے تربیت حاصل کرنے کی خواہش مند لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ آرم نے نوالین کی ان عورتوں سے رابطہ قائم کیا جنھوں نے پولیو ویکسین کی مہم میں حصہ لیا تھا۔ آرم کے دفتر میں ایک میٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس میں نوالین اور بغدادی کی نوجوان عورتوں نے شرکت کی۔ لیکن لیاری اربن کمیونٹی ڈویلپمنٹ اس کورس کے لیے فی ہنر (موم بتیاں بنانا، آئس کریم تیار کرنا، چمڑا رنگنا، صابن بنانا اور اچار ڈالنا) ۱۰۰ روپے فیس طلب کر رہی تھی اور لڑکیاں یہ رقم فراہم نہیں کر سکتی تھیں۔

تاہم پولیو مہم کے پروگرام کے بعد سے انجمن کے رکن ارشد کی بہن روبینہ نے انڈسٹریل ہوم میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں جن میں سلائی کی استانیوں کی مدد اور نگرانی کرنا اور شاہد کے ساتھ مل کر (جو اس کا عم زاد بھی ہے) عورتوں کے پروجیکٹ کا انتظام چلانا شامل ہے۔

شرکت گاہ: ۱۹۹۴ کے وسط میں عورتوں کی ایک غیر سرکاری تنظیم شرکت گاہ کی ایک نوجوان کمیونٹی کارکن نے نوالین میں روبینہ اور اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں سے ملاقات کی اور نوالین کی عورتوں کی ضروریات کے بارے میں بات چیت کی۔ شرکت گاہ کی نمائندہ نے ان سے کہا کہ اگر وہ اپنے گروپ کو ترقی دینا اور این جی اوز کے ساتھ اپنے روابط کو جاری رکھنا چاہتی ہیں تو شرکت گاہ سے رسمی طور پر رجوع کریں تاکہ اس کام کو مستقل بنیادوں پر کیا جا سکے۔ روبینہ نے انجمن سے شرکت گاہ کے نام باقاعدہ خط لکھنے کی درخواست کی لیکن بظاہر انجمن نے خط نہیں بھیجا۔

عورت فاؤنڈیشن: عورتوں کی ایک اطلاعاتی سروس عورت فاؤنڈیشن قومی سطح پر کام کرنے والی این جی او ہے۔ طاعون کی وبا کے دوران (اکتوبر ۱۹۹۴ میں) عورت فاؤنڈیشن کی کارکنوں نے نوالین کا کئی بار دورہ کیا تاکہ اس وبا کے بارے میں، جس کا ذکر ان دنوں اخباروں میں عام تھا، لوگوں کو آگاہ کر سکیں۔ انھوں نے صحت کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے کے کئی پروگرام چلائے لیکن نوالین کی عورتیں ان پروگراموں میں شریک نہ ہوئیں کیونکہ عورت فاؤنڈیشن کی کارکنوں کے مطابق انجمن نے انھیں اطلاع دی کہ ان کا کوئی زنانہ کا ونگ نہیں ہے۔

انجمن کے سابق سوشل سیکرٹری الٰہی بخش نے کمیونٹی شراکت کے طریق کار عورت فاؤنڈیشن کے منعقد کردہ کئی سیمیناروں اور ورکشاپس میں شرکت کی ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ کمیونٹی تنظیموں میں صنفی احساس کو تقویت دی جائے۔ درحقیقت الٰہی بخش ہی نے عورت فاؤنڈیشن، آرم اور شرکت گاہ کو نوالین میں آنے کی دعوت دی تھی تاکہ نوالین کی عورتوں کو ترقی کے عمل میں شریک کیا جا سکے۔

این جی او آر سی: نومبر ۱۹۹۵ میں این جی او آر سی کی سربراہ صادقہ صلاح الدین نے علاقے کا دورہ کیا اور انجمن کے دفتر میں عورتوں کا ایک اجلاس منعقد کیا۔ انھوں نے عورتوں سے ان کے مسائل دریافت کیے۔ عورتوں نے تعلیم، آمدنی کے ذرائع اور پیسے کی کمی کا ذکر کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ عورتوں کو اپنا ایک گروپ تشکیل دینا چاہیے اور انھیں یقین دلایا کہ این جی او آر سی ترقیاتی پروگرام شروع کرنے کے سلسلے میں ان کی پوری مدد کرے گی۔ دسمبر میں این جی او آر سی نے ایک جزوقتی تنظیم کار کی خدمات حاصل کیں تاکہ نوالین کی عورتوں کو ان کے مسائل کے سلسلے میں منظم کیا جا سکے۔ تین ماہ بعد این جی او آر سی کو اس سلسلے میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لے کر مستقبل کا لائحۂ عمل طے کرنا تھا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی: کئی ماہ کی تیاریوں اور بات چیت

کے بعد نومبر ۱۹۹۵ میں نوالین کی ۱۰ عورتوں نے عائشہ منزل کے قریب واقع علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے کراچی دفتر کا دورہ کیا تاکہ یونیورسٹی کی جانب سے چلائے جانے والے خواتین کے میٹرک کے پروگرام کی تفصیلات حاصل کر سکیں۔ یونیورسٹی کی شاہدہ نے انھیں پروگرام کے خاص خاص نکات سے آگاہ کیا اور پیش کش کی کہ اگر نوالین کی ۱۵ عورتیں اس پروگرام میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں تو یونیورسٹی نوالین میں ایک میٹرک سنٹر کھول سکتی ہے۔ دسمبر میں یونیورسٹی کے ڈائرکٹر اور پروگرام کو آرڈی نیٹر نے نوالین کا دورہ کیا اور انجمن سے اس کے دفتر میں اس قسم کا مرکز کھولنے کے امکانات پر تبادلۂ خیال کیا۔

انجمن اتحاد نوجوانان نوالین: انجمن کے ساتھ رابطہ کاری عموماً بہت ناقص رہی ہے۔ نوالین سے باہر کی تنظیموں اور اداروں سے آنے والے بعض پیغامات انجمن کی کارکن روبینہ کے ذریعے بھجوا دیے جاتے ہیں اور بعض نہیں بھجوائے جاتے۔

انجمن کے کارکن شاہد کے ذریعے روبینہ کو اوپی پی آر ٹی آئی کی جانب سے دی جانے والی نقشہ سازی کی تربیت کا پتا چلا جو شاہد نے حاصل کی تھی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی نوالین کے نکاس کے نظام کا نقشہ تیار کرنے کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس کے علاوہ نوالین کی عورتوں کو انجمن کی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔

۱۹۹۴ میں انجمن نے عورتوں کے لیے دو پروگرام منعقد کیے: یوم والدین کی تقریب اور یوم آزادی کا ثقافتی پروگرام۔ دونوں موقعوں پر نوالین کی عورتوں کو مدعو کیا گیا اور انھوں نے شرکت کی۔ یوم والدین کی تقریب میں ان عورتوں نے جو پولیو ویکسین کی مہم میں حصہ لے چکی تھیں، بچوں کو ڈرامے کی پرفارمنس کی تیاری کرائی۔ جب آرم ویلفیئر نے بغدادی میں اسی نوعیت کا پروگرام منعقد کیا تو انجمن نے ایک سوزوکی کرائے پر لے کر نوالین کی عورتوں کے بغدادی جانے کا بندوبست کیا۔

۱۹۹۵ میں انجمن کے ساتھ پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی کے سبب سے عورتوں کو یوم آزادی کے پروگرام میں شرکت کی دعوت نہ دی گئی۔ تاہم ۱۳/۱۴ اگست کی رات کو یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور چند عورتوں نے پروگرام میں شرکت کی۔ روبینہ اور ان کی دوستوں نے پہلی بار اپنے طور پر میلاد کا انتظام کیا، مختلف گھروں سے اس کے لیے چندہ اکٹھا کیا اور انجمن کے تعاون سے (جس نے انھیں اپنا دفتر، دریاں اور دوسری چیزیں استعمال کرنے کی اجازت دی تھی) اس محفل کا انعقاد کیا۔ روبینہ کو اس بات پر فخر ہے کہ علاقے کی ۳۰ لڑکیوں نے اس محفل میں شرکت کی۔

اپلائیڈ سوشیو اکنامک ریسرچ سنٹر (اثر) لاہور نے نومبر ۱۹۹۵ میں لاہور میں منعقد ہونے والی ایک عورتوں کی کانفرنس میں انجمن کے کارکنوں کے ایک گروپ کو مدعو کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس گروپ میں ۱۵ فیصد ارکان عورتوں پر مشتمل ہوں۔ انجمن نے اس دعوت کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو لاہور جانے کی اجازت نہیں مل سکے گی۔

نوالین کی بیشتر عورتیں انجمن کی گزشتہ چند سال کی کارروائیوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ جب ان کو انجمن کی ان سرگرمیوں کی اطلاع دی گئی تو انھیں پہلی بار ان کا علم ہوا۔ ان کے مرد ان سے انجمن کی کامیابیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے خواہ وہ خود انجمن کے سرگرم کارکنوں میں شامل ہوں۔

عورتوں نے کئی بار نوجوان عورتوں کے لیے (جن میں سے بعض شادی شدہ ہیں اور جن کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکی) ایک ٹیوشن سنٹر قائم کرنے کی درخواست کی ہے لیکن انھیں اس کا ہمیشہ یہی جواب ملا کہ انجمن کے پاس جگہ کی کمی ہے۔ ان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ جب انجمن کے دفتر میں ایک اور کمرہ تعمیر ہو گا تو وہ اسے ٹیوشن سنٹر کے لیے استعمال کر سکیں گی۔

ایک بات جو صورت حال کو بہت پیچیدہ بنا دیتی ہے وہ اطلاعات کی ترسیل کا مسئلہ ہے۔ نوالین کی عورتوں کو پیغامات انجمن کے کارکن شاہد کے ذریعے بھجوائے جاتے ہیں جو یہ پیغامات روبینہ کے توسط سے عورتوں کو بھیجے جاتے ہیں (حالانکہ روبینہ کا بھائی بھی انجمن کے کارکنوں میں شامل ہے)۔ عورتیں کسی رشتے دار کی وساطت سے انجمن کو پیغامات بھجواتی ہیں اور یہ ان کے موڈ اور پیغام کی اہمیت کے احساس پر منحصر ہوتا ہے کہ یہ پیغام وہ انجمن کے عہدے داروں تک پہنچاتے ہیں یا نہیں۔

حکومت کی مداخلت

بیشتر عورتیں علاقے کی صورت حال بہتر بنانے کے سلسلے میں حکومت کے اقدامات سے بے خبر ہیں۔ انھوں نے کبھی کبھار سڑکوں کی مرمت ہوتے دیکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں بجلی، پانی اور گیس کے سلسلے میں کسی مسئلے کا سامنا نہیں ہے۔ ان کے خیال میں حکومت نے نوالین میں عورتوں کی بھلائی کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔

عورتوں کی سیاست سے دلچسپی

لیاری کے دوسرے علاقوں میں عمر رسیدہ عورتیں (اور اب نوجوان عورتیں بھی) سیاسی تحریکوں، سیاسی پارٹیوں کے جلسوں اور کھلی کچہریوں میں فعال کردار ادا کرتی ہیں۔ پی پی پی کی خاتون ارکان اکثر عام جلسے منعقد کر کے عورتوں کی ترقی کے سلسلے میں وزیر اعظم کے نئے پروگراموں کے بارے میں اطلاعات دیتی ہیں جن میں ہنر مندی کی تربیت، چھوٹے کاروباری قرضوں، بیواؤں کی امداد، کمپیوٹر کی تربیت کے لیے وظیفوں اور طبی تربیت کے پروگرام شامل ہیں۔ لیاری کی عورتیں ان سے فوراً فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں اپنے محلوں سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور مردوں سے بات چیت کرنی پڑتی ہے۔

تاہم نوالین کی عورتیں سیاسی سرگرمیوں اور سرکاری اہلکاروں کے ساتھ ملاقاتوں میں بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لیاری کی دوسری برادریوں کے برعکس ان کو ان سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ملتی۔ ایک عورت سومری، جس سے محلے کے تقریباً سب لوگ واقف ہیں، سیاسی جلسوں وغیرہ میں شریک ہوتی ہے لیکن وہ شیدی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔

تجزیہ

ثقافتی اور مذہبی رجحانات: نوالین کی عورتوں کی صورت حال کراچی کی کم آمدنی والی بہت سی دوسری بستیوں سے ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان عورتوں کے حاشیے سے باہر ہونے کی نوعیت اور اس کے اسباب ذرا مختلف ہیں۔

نوالین کی عورتیں قبائلی پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ عورتوں کے لیے طرز عمل کے ضوابط اس ماحول میں بہت سختی سے متعین ہوتے ہیں۔ بہت سی عمر رسیدہ عورتوں کا خیال ہو سکتا ہے کہ انھیں پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ آزادی حاصل ہے، لیکن نوجوان نسل کی عورتیں مختلف طرز زندگی کی تلاش میں ہیں اور ایسے وسائل حاصل کرنا چاہتی ہیں جو روایتی نظام ان کو فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ نوالین میں موجود مذہبی عنصر (اہل سنت) بھی روایتی نظام کو تقویت دیتا ہے۔ تاہم لیاری میں تعلیم یافتہ عورتوں (اور مردوں) کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بدولت برادری میں طاقت کے روایتی رشتوں پر سوال اٹھائے جانے لگے ہیں، وہ ڈھنگ کے عمل سے عورتوں میں سیاسی بیداری پیدا ہو رہی ہے، اور ان رجحانات سے پیدا ہونے والا رد عمل ایسی تبدیلیاں لا رہا ہے جو کم از کم فی الوقت طرز عمل کے نمونوں میں کنفیوژن پیدا کر رہی ہیں۔

خاندانی رشتے: نوالین میں رہنے والے تمام خاندان ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں کیونکہ ان سب کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ ان کے درمیان کوئی غیر نہیں ہے۔ آپس میں شادیاں عام ہیں اور عورتیں شادی کے بعد اسی گلی کے کسی دوسرے گھر میں یا برابر والی گلی میں چلی جاتی ہیں۔ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ خاندانی تقریبات کا سب کو علم ہوتا ہے اور روایتی طور پر عورتوں کے مابین ملنا جلنا کثرت سے ہوتا ہے۔

اس کے باوجود طرز عمل کے متعین ضابطے اگرچہ کمزور پڑ رہے ہیں، پھر بھی باقی ہیں۔ ان ضابطوں کی کمزوری مردوں میں زیادہ نظر آتی ہے جن میں سے بہت سوں نے خاندانی کاروبار ترک کر دیا، اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کمیونٹی ڈویلپمنٹ کی سرگرمیاں شروع کیں جن کے باعث نوالین کے باشندوں کو تعلیمی اور جغرافیائی اعتبار سے نئے امکانات حاصل ہوئے۔ تاہم نوالین کی عورتوں کو بدلے ہوئے ماحول کے باوجود ان میدانوں میں کم ترقی حاصل ہوئی ہے اگرچہ اس ترقی کی بنیاد پڑتی جا رہی ہے۔

تعلیم یافتہ نوجوانوں پر بڑی عمر کے افراد کی بالادستی ابھی تک قائم ہے۔ بیرونی ماحول میں آنے والی تبدیلیوں (اقتصادی طاقت، تحفظ اور زمین، افراد اور معلومات میں کمی) نے اس برادری کو جو کبھی مستحکم تھی، عدم استحکام کا شکار کر دیا ہے۔ اس سے ان میں اندرونی طور پر آنے والی تبدیلیوں کی مزاحمت کا رجحان پیدا کیا ہے جو طاقت کے روایتی رشتوں کی شکست و ریخت کا سبب بن سکتی ہوں۔

عورتوں کے لیے سال میں دو پروگراموں کے انعقاد کا سلسلہ انجمن نے دو سال پہلے شروع کیا تھا۔ لیکن اس قسم کا ہر پروگرام ارکان کے درمیان خاصی بحث و تکرار کے بعد ہی طے ہو پاتا تھا۔ بحث اس بات پر ہوتی تھی کہ عورتوں کو کس حد تک شامل کیا جائے۔ انجمن کے سب ارکان عورتوں کے ساتھ رابطے میں دشواری محسوس نہیں کرتے۔ "ہم ایک دوسرے کے ساتھ بڑے ہوئے ہیں،" انجمن کے ایک عہدے دار نے کہا۔ "یہ میری بہنوں اور عم زادوں کی طرح ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ آسانی سے بات چیت کر سکتے ہیں۔"

باہمی اتحاد: عورتوں کے درمیان اتحاد کی سطح خاصی نیچی ہے۔ نوعمر

عورتوں نے کئی بار کوشش کی کہ کوئی ایسا گروپ بن جائے جو غیر رسمی طور پر ہی سہی، اجتماعی عمل میں شریک ہو سکے۔ لیکن انھیں بڑی عمر کی عورتوں کی طرف سے حوصلہ شکن تبصروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ تنقید کی پہلی لہر کے سامنے ہمت ہار بیٹھتی ہیں۔

اس عدم اتحاد کا سبب عورتوں میں پایا جانے والا عدم تحفظ کا عام احساس بھی ہو سکتا ہے اور تنقید اور توہین کا خوف بھی۔ برادری میں پائی جانے والے طرز عمل کے سخت ضوابط، اور بیرونی (قبیلے سے باہر کے) اثرات سے عورتوں کی علیحدگی کے باعث ان کے سامنے سماجی طور پر قابل قبول متبادل طرز عمل کے نمونے موجود نہیں ہیں۔

یہاں کی بعض عورتوں نے کامیاب سماجی عمل کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ روایتی تہذیبی دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہی کیا گیا۔ یہ مثالیں رہنمائی، مشورے، صلح صفائی اور متحرک کرنے تک محدود تھیں۔ یہ بات سماجی طور پر قابل قبول سمجھی جاتی ہے کہ عورتیں برادری کے لوگوں کو اس قسم کی خدمات پیش کریں۔ بلکہ ایسی عورتوں کو بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل صرف انفرادی طور پر ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کی جانب سے جوابی طور پر اس طرز عمل کا اظہار نہیں کیا جاتا، یعنی ایسی خدمات فراہم کرنے والی عورت خود دوسروں سے اس کی توقع نہیں کر سکتی۔

عموماً عورتوں کو برادری میں جو احترام حاصل ہوتا ہے اس کا براہ راست تعلق اس طاقت سے ہے جو انھیں برادری میں حاصل ہے۔ روبینہ (عمر ۲۳ سال)، گل نسا (۲۸ سال) اور آمنہ (۵۰ سال) سب ایسی عورتیں ہیں جن کے کنبے مالی طور پر اچھی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ہم عمر عورتوں میں خاصا اثر رکھتی ہے۔ برادری کی عورتیں کسی ذاتی یا خاندانی مشکل میں آمنہ اور گل نسا سے اکثر صلاح مشورے اور اخلاقی مدد کے لیے رجوع کرتی ہیں۔ ان کے اثر و رسوخ کی بنیاد بظاہر ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے کنبوں کا معاشی پس منظر بھی ہے۔

قرض کا نظام: ضرورت کے وقت روپے کا بندوبست ایک ایسا شعبہ ہے جس کے مسئلے کو عورتوں نے بیسی کے روایتی طریقے سے حل کیا ہے۔ بہت سی صورتوں میں عورتوں نے اس طریقے سے اپنے مکانوں کی توسیع اور مرمت کے اخراجات کے لیے رقم حاصل کی ہے۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں بھی اکثر بیسی سے حاصل ہونے والی رقم سے کی جاتی ہیں۔ اسی طرح گھرانے کو کسی مشکل بحرانی صورت حال کا سامنا ہو تب بھی یہی طریقہ کام آتا ہے۔

تاہم بیسی میں شامل افراد کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ایک وقت میں زیادہ رقم مہیا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئے اور کم مانوس لوگوں کو شامل کرتے ہوئے (جن میں سے بعض دور کے محلوں میں رہتے ہیں) باہمی اعتماد کا عنصر نظرانداز ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی بیسی کا گروپ ٹوٹتا ہے تو سب لوگ بددل ہو کر بیسی شروع کرنے والے فرد کو نااہلی کا طعنہ دینے لگتے ہیں۔

عورتیں زیادہ بڑی رقم (۵۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے تک) کی بیسی کو پسند کرتی ہیں کیونکہ اس سے حاصل ہونے والی بڑی رقم کو فوراً شادی، مکان کی تعمیر اور مرمت وغیرہ کے اخراجات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹی رقم کی بیسی غریب اور کم عمر لوگوں کے لیے موزوں سمجھی جاتی ہیں۔

اکثر اوقات مرد بھی بیسی میں حصہ لیتے ہیں اور اس کی رقم کو بحران یا ہنگامی حالات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک چکر مکمل ہونے پر بیسی کو روک دیا جاتا ہے۔ بہت سی عورتیں کہتی ہیں کہ بیسی کا سلسلہ چلانا مشکل ہے کیونکہ بروقت ادائیگی کے لیے ارکان کے پیچھے بھاگنا پڑتا ہے۔ بروقت ادائیگی نہ ہونے کی وجہ ارکان کے درمیان اتحاد کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔

ایک بحران سے دوسرے بحران تک زندہ رہنے اور رقم کی فوری ضرورت کے سلسلے میں بیسی پر انحصار کرنے کا یہ رجحان مستقبل کی ضروریات کے لیے باقاعدگی سے بچت کرنے کی عادت کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ بہت سے خاندانوں کو شکایت ہے کہ مہینے کے پندرہ تاریخ کے بعد ان کے پاس روزمرہ اخراجات کے لیے رقم باقی نہیں بچتی۔ بچت نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضرورت کے وقت کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اس سے گھر کی معیشت غیر مستحکم ہو جاتی ہے جس میں گھر کے لوگ ایک دن سے دوسرے دن تک گزارا کرتے ہیں اور زندگی کے معیار اور حالات میں بہتری لانے کی طویل المیعاد منصوبہ بندی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

بیرونی مداخلت: نوالین کی عورتوں کے لیے پروگرام شروع کرنے کے سلسلے میں بیرونی اداروں اور تنظیموں کی تمام مداخلتوں میں سے آرم ویلفیئر کی مداخلت سب سے زیادہ پائیدار ثابت ہوئی ہے۔ اس سے مقامی تنظیموں کے درمیان مہارتوں، معلومات اور وسائل میں ایک دوسرے کو شریک کرنے کے رجحان کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ نوالین میں آرم ویلفیئر کے چلائے ہوئے پروگراموں میں غالباً سب سے کم مالی سرمایہ کاری کی ضرورت پڑی ہے کیونکہ اس تنظیم کے تمام لوگ رضاکارانہ بنیاد پر کام کرتے ہیں۔

تاہم کمیونٹی تنظیموں کی اپنی محدودات ہیں، مثلاً کمیونٹی ڈویلپمنٹ کے متبادل ماڈلوں کی کمی۔ ان میں سے بیشتر کمیونٹی کے باشندوں کو ترقیاتی عمل میں شریک کرنے کے بجائے ان کو خدمات فراہم کرنے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس رجحان کے پیش نظر یہ تعجب کی بات نہیں کہ آرم ویلفیئر کے متعارف ہونے کے بعد پہلا پروگرام پولیو ویکسین کے سلسلے میں چلایا گیا اور دوسرا ایک تفریحی پروگرام تھا۔

لیاری کی مختلف تنظیمیں آج کل بڑے پیمانے پر تفریحی پروگرام، کھیلوں کے مقابلے وغیرہ منعقد کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کر رہی ہیں۔ ان پروگراموں میں سینکڑوں لوگ شریک ہوتے ہیں جس سے ان تنظیموں کی تشہیر بھی ہوتی ہے اور دوسری تنظیموں کے اسی نوعیت کے شہری، صوبائی اور قومی سطح کے پروگراموں میں شرکت کی دعوت بھی ملتی ہے۔ انجمن جیسی تنظیمیں جو طویل عرصے سے علاقے کے باشندوں کو خدمات مہیا کر رہی ہیں، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد یہ محسوس کرتی ہیں کہ علاقے کے لوگ سہل پسند ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انھیں خدمات مہیا کی جاتی رہیں۔ تنظیم کے ارکان کے جذبے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن علاقے کے لوگوں سے ان کا فاصلہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔

تنظیموں کے اس خدمات فراہم کرنے کے رجحان سے علاقے کے باشندوں پر یہ اثر ہوتا ہے کہ ان میں پہل کاری کا جذبہ پیدا نہیں ہو پاتا۔ لوگ اپنے وسائل کا جائزہ لے کر اپنی راہیں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کیونکہ انجمن انھیں خدمات پیش کر دیتی ہے۔ لوگوں کے کسی گروپ کی طرف سے کسی پہل کاری پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس پر قبضہ جمانے کا رویہ پیدا ہوتا ہے (جیساکہ عورتوں کے زیر اہتمام ہونے والے میلاد کے سلسلے میں ہوا)۔

نوالین میں انجمن کے عہدے داروں اور علاقے کی عورتوں کے درمیان رابطے کا فقدان پایا جاتا ہے۔ انجمن کو درپیش بڑے مسائل یا بڑے فیصلوں پر غور کرنے کے دوران عورتوں سے (خواہ وہ انجمن کی رکن ہی کیوں نہ ہوں) صلاح مشورہ نہیں کیا جاتا۔ علاقے اور کمیونٹی کو درپیش مسائل کو مردوں کے دائرۂ عمل کا حصہ خیال کیا جاتا ہے اور اسے گھر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان گفتگو کا موضوع نہیں بنایا جاتا، خواہ یہ عورتوں کی ذاتی زندگی پر کتنا ہی گہرا اثر ڈالنے والے ہوں۔ عورتوں کے روایتی شعبوں (مثلاً دستکاری، صحت اور تعلیم) سے متعلق معلومات عورتوں تک پہنچائی جاتی ہیں لیکن انھیں ان معلومات کی منصوبہ بندی اور رخ متعین کرنے کے عمل میں شامل نہیں کیا جاتا۔

انجمن کے پاس کراچی اور اس سے باہر کی معروف کمیونٹی تنظیموں اور بادسیلہ این جی اوز سے تعلقات کا خاصا متاثر کن نظام موجود ہے۔ لیکن نوالین کی عورتیں اس نظام کا حصہ نہیں ہیں۔

سرکاری اداروں نے بھی نوالین کی عورتوں کو امداد فراہم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی ہے۔ لڑکیوں کا ایک سرکاری اسکول مہینوں سے استانیوں سے محروم ہے۔ اسکول کی تمام استانیاں شہر کے دور دراز علاقوں سے آتی ہیں اور شہر میں امن و امان کی خراب صورت حال کے پیش نظر انھوں نے شہر کے دوسرے علاقوں میں تبادلے کرا لیے ہیں۔

لیاری میں فرسٹ ویمن بینک کی ایک برانچ عورتوں کو چھوٹے پیمانے کے کاروبار کے لیے قرضے فراہم کرتی ہے، لیکن بہت کم عورتیں قرض لینا چاہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ قرض واپس نہیں کر سکیں گی۔

کمیونٹی کارکنوں کے خاکے

محمد یوسف

محمد یوسف نوالین ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ انجمن اتحاد نوجوانان نوالین کے بانی ہیں اور ۱۹۶۸ سے ۱۹۸۸ تک انجمن کے صدر بھی رہے۔

محمد یوسف اپنے آباواجداد کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے، لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کے دادا ایران سے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ وہ ایک پیر تھے اور لوگوں کے لیے جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ یوسف کے والد حاجی عبداللہ بچے ہی تھے جب اپنے والد کے ساتھ ایران سے یہاں آئے۔ وہ تمام عمر لیاری ہی میں رہے۔ وہ سٹی ریلوے اسٹیشن پر ٹرالی گارڈ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

یوسف نے عثمان آباد کے سندھی اسکول میں تعلیم شروع کی لیکن چوتھی جماعت کے بعد خاندان کی مالی دشواریوں کے باعث یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ۱۲ برس کی عمر تک ان کا بیشتر وقت گلی میں کھیلنے میں صرف ہوتا تھا۔ اس عمر کو پہنچ کر انھیں اپنے خاندان کی مالی مشکلات کا احساس ہوا اور انھوں نے لیاری کی ایک کریانہ کی دکان میں سیلز مین کے طور پر کام شروع کیا۔ انھوں نے ۳۰ روپے ماہانہ کی یہ ملازمت ڈھائی سال تک کی۔ جب علاقے کے ایک اور دکان دار نے یوسف کو ۶۰ روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازمت کی پیشکش کی تو ان کے مالک نے بھی ان کی تنخواہ ۶۰ روپے کر دی۔ یوسف فخر سے کہتے ہیں کہ انھیں اپنی تنخواہ میں اضافے کے لیے کہنا نہیں پڑا۔ وہ اگلے ۱۲ یا ۱۳ برس تک اسی جگہ کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۰ میں ان کی شادی

دکان کے مالک کی بیٹی سے ہو گئی اور انھوں نے دکان کا پورا انتظام سنبھال لیا۔

یوسف کو شروع ہی سے فٹ بال اور باکسنگ کا شوق تھا۔ وہ قریب کے محلے بغدادی کے ایک اسپورٹس کلب میں باکسنگ کی مشق کرتے تھے۔ یوسف اور محلے کے چند دوسرے نوجوانوں نے ایک فٹ بال کلب قائم کیا۔ وہ لوگ علاقے کے ایک میدان میں ہر روز فٹ بال کھیلنے لگے۔ کھیل ختم ہونے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر ستاتے اور آپس میں باتیں کرتے۔ ان نوجوانوں کو اپنے علاقے میں واقع جوئے کے اڈوں کے بارے میں علم تھا اور وہ اسے ایک سماج دشمن سرگرمی سمجھتے تھے۔ ان اڈوں پر اکثر پولیس کے چھاپے پڑا کرتے۔ یوسف نے سوچا کہ اس طرح ان کا محلّہ بدنام ہو رہا ہے۔ نوجوانوں نے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس پر قابو پانا تنہا پولیس کا کام نہیں ہے بلکہ علاقے کے لوگوں کو اس سلسلے میں عملی اقدام کرنا ہوگا کیونکہ محلے کے بھی چند افراد اس ناجائز کاروبار میں ملوث ہیں۔ نوجوانوں نے اسی فٹ بال گراؤنڈ میں، سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر اور اپنے ایک ساتھی کے گھر پر محلے کے باشندوں سے اس مسئلے پر بات چیت کی۔ ان کی ان اجتماعی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوالین میں جوئے کے اڈے بند ہو گئے۔

جوئے کے اڈوں کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کرنے کے دوران فٹبال کلب کے ارکان نے علاقے کے دوسرے مسئلوں پر بھی بات چیت کی۔ ان مسئلوں میں علاقے میں صحت، تعلیم اور تفریح کی سہولتوں کی کمی اور شادیوں اور جنازوں میں لوگوں کے اجتماع کے لیے جگہ کا فقدان شامل تھا۔ یہ انجمن کے قیام کی ابتدا تھی۔ باقاعدہ قیام ۱۹۶۸ میں ہوا اور فوراً ہی انجمن کے لیے ایک دفتر کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں بیٹھ کر مسائل پر تبادلہ خیال کیا جا سکے۔ جو واحد جگہ دستیاب تھی وہ کے ایم سی کی ملکیت کا ایک خالی پلاٹ تھا جہاں عوامی بیت الخلا تعمیر کرا دیے گئے تھے۔ انجمن کے ارکان نے علاقے کے بڑی عمر کے لوگوں سے اس سلسلے میں رجوع کیا لیکن ان کی درخواست رد کر دی گئی کیونکہ اسے سرکاری زمین پر قبضے کی کوشش خیال کیا گیا۔ لیکن انجمن نے اپنی بات پر اصرار جاری رکھا اور جب انھوں نے اس کے لیے تحریری درخواست دی اور اپنے مقصد کی وضاحت کی تو آخر کار یہ پلاٹ انجمن کو دے دیا گیا۔ لیکن انھیں جتنی جگہ الاٹ کی گئی تھی انھوں نے اس سے زیادہ رقبے پر اپنا دفتر تعمیر کر لیا۔ اس بات پر محلے کے عمر رسیدہ افراد خفا ہوئے۔ دفتر کی تعمیر کے اخراجات محلے کے گھروں سے ۲۰ روپے سے ۵۰ روپے تک چندہ جمع کر کے پورے کیے گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنا چندہ تعمیراتی سامان مثلاً ریتی، بجری یا سیمنٹ کی شکل میں ادا کیا۔ انجمن کے ارکان نے ایک راج کی نگرانی میں مزدوروں کے طور پر کام کیا۔

بیت الخلا ۱۹۸۰ تک استعمال کیے جاتے رہے لیکن جب حکومت کی طرف سے علاقے میں نکاس کی لائن ڈالی گئی تو رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنے مکانوں میں بیت الخلا تعمیر کرا لیے۔ ۸۴-۱۹۸۳ تک عوامی بیت الخلا نہایت خستہ حالت میں تھے کیونکہ لوگ ان کو زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے اور کے ایم سی نے ان کی صفائی وغیرہ کرنا بند کر دیا تھا۔ انجمن کا دفتر برابر میں واقع تھا اور بیت الخلا سے اٹھنے والی بدبو اور مکھیوں اور مچھروں کی یلغار کے باعث دفتر میں بیٹھنا یا کوئی اجلاس منعقد کرنا ناممکن ہو گیا۔ انجمن کے ارکان نے ایک ایک کر کے یہ سارے بیت الخلا مسمار کرنے شروع کیے تاکہ کے ایم سی یا دوسرے لوگوں کو احساس نہ ہو سکے۔ جو لوگ اب تک ان کو استعمال کرتے تھے انھوں نے اس پر احتجاج کیا۔ اس پر انجمن نے سارے بیت الخلا ایک ساتھ گرا دینے کا فیصلہ کیا۔ ایک رات وہ لوگ اکٹھا ہوئے اور بیت الخلا مسمار کر دیے۔ جب صبح کے وقت لوگ حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے وہاں پہنچے تو انجمن کے ارکان خاموشی سے ان کا برا بھلا سنتے رہے۔

انجمن نے فوراً کے ڈبلیو ایس بی پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ علاقے کے نکاس کے نظام کی تعمیر جلد مکمل کرے تاکہ تمام لوگ اپنے مکانوں میں بیت الخلا تعمیر کر سکیں۔ جونہی انجمن نے بیت الخلا کا ملبہ صاف کیا، علاقے کی مختلف تنظیمیں اس خالی جگہ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے لگیں۔ لیکن چونکہ انجمن کا دفتر اس چار دیواری کے اندر واقع تھا، اس لیے اسے وہاں سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ اس طرح تنظیموں کے درمیان ایک سرد جنگ کی ابتدا ہو گئی۔ نوالین کے باشندے انجمن کے صدر اور جنرل سیکرٹری سے ناراض ہو گئے اور ان پر شبہ کیا کہ وہ زمین کو اپنے ذاتی استعمال میں لانا چاہتے ہیں۔ علاقے کی دوسری تنظیموں نے اس سلسلے میں کے ایم سی، پولیس اور ایکسائز کے محکمے سے رجوع کیا اور انجمن کے خلاف کارروائی کر کے زمین پر سے اس کا قبضہ ختم کرانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن انجمن نے دلیل پیش کی کہ وہ اس پلاٹ کو کمیونٹی سنٹر کے طور پر لیز کرانا چاہتے ہیں۔ یہ سنٹر انجمن کی تحویل میں ہوگا اور اسے اجتماعات کے لیے استعمال کیا جا سکے گا اور اس طرح نوالین کے اور آس پاس کے محلوں کے باشندوں کو اس کا فائدہ ہوگا۔ آخر کار انجمن اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوئی اور کے ایم سی نے اس پلاٹ کی لیز انجمن کے نام کر دی۔ اس کی تفصیلات اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ لیز حاصل کرنے کے بعد یوسف نے سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے لیے ایک کوچنگ سنٹر قائم کیا۔ مختلف کلاسوں کے بچے ایک ساتھ بیٹھتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انجمن نے اپنے ارکان کو تقریبات کے لیے درکار سامان کرائے پر دینے کا بھی سلسلہ شروع کیا۔ جیسے جیسے انجمن اور محلے کے

باشندوں کے درمیان تعلقات بڑھے، لوگ اپنے ذاتی اور خاندانی مسائل کے حل کے لیے بھی انجمن سے رجوع کرنے لگے۔ دو فیصلے جو شروع ہی میں کر لیے گئے تھے، ان پر اب بھی سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ ایک، انجمن کے دفتر میں ہونے والی تقریبات میں لاؤڈ اسپیکر ہرگز استعمال نہیں کیا جائے گا، اور دو، ایسی تقریبات میں فلموں یا وڈیو کی نمائش کی اجازت نہیں ہوگی جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا تھا اور اس کے نتیجے میں بعض افراد نے عورتوں سے بدتمیزی کی تھی۔

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ۱۹۶۸ سے ۱۹۸۸ تک انجمن کے عہدے دار وہی کیوں رہے، یوسف نے بتایا دوسرے لوگ ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھے۔ جنرل باڈی کے اجلاس میں مشکل سے پانچ دس لوگ اکٹھے ہوتے اور وہ بھی عہدے داروں کی سخت کوششوں کے بعد۔ زیادہ تر فیصلے یوسف کو خود کرنے پڑتے تھے کیونکہ ان کو محسوس ہوتا تھا کہ اگر لوگوں کو فیصلہ کرنے میں شریک کیا جائے تو وہ خواہ مخواہ کے اعتراضات اٹھانے لگتے ہیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ جب ۱۹۸۸ میں علاقے کے کچھ نوجوان افراد نے ان سے رجوع کیا کہ انجمن میں انتخابات کرائے جائیں تو انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سیاسی طور پر محمد یوسف پی پی پی کے حامی ہیں۔

واجہ لعل بخش

واجہ لعل بخش ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۴ تک انجمن کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۶۸ سے ۱۹۸۸ تک قائم رہنے والی قیادت کو تبدیل کرنے میں سب سے زیادہ لعل بخش ہی کا ہاتھ تھا۔

لعل بخش کے آباواجداد نے سو سال پہلے ایران کے علاقے دشتیار سے (جو گوادر بلوچستان سے بذریعہ کار تقریباً چار گھنٹے کے فاصلے پر واقع ہے) نقل مکانی کر کے نوالین میں رہائش اختیار کی تھی۔ ان کا پیشہ زراعت تھا لیکن دشتیار میں خشک سالی کی وجہ سے انھیں نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ لعل بخش کا کہنا ہے کہ ان کے دادا کی لسبیلہ میں زمینیں تھیں۔ لسبیلہ سے بھی ان کے بہت سے رشتے دار آکر لیاری میں مقیم ہوئے لیکن اب ان کا اپنے سابق وطن سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

لعل بخش کے دادا اور دوسرے عزیزوں نے کراچی پورٹ ٹرسٹ میں مزدوروں کے طور پر ملازمت اختیار کی۔ ان کے دادا ناخواندہ تھے لیکن والد نے مڈل اسکول تک تعلیم حاصل کی اور پھر گاڑیوں کے مکینک کے طور پر تربیت حاصل کی۔ ۱۹۷۴ میں وہ عمان چلے گئے اور وہاں کے محکمہ موسمیات میں ۱۹۸۶ تک ملازم رہے۔ بیمار پڑنے کے سبب وہ عمان سے واپس چلے آئے اور ۱۹۸۶ میں نوالین میں انتقال کیا۔

لعل بخش اسکول کے دنوں میں ہی فٹ بال ٹیم میں فعال ہو گئے تھے۔ ۱۹۸۰ میں میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ بلوچ نژاد ہونے کے باعث وہ بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں شامل ہو گئے۔ مگر بعد میں انھوں نے اسے چھوڑ کر جیے سندھ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن میں شمولیت اختیار کر لی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ صرف لیاری کی نہیں بلکہ پورے صوبے کے حقوق کی نمائندہ ہے۔ آگے چل کر انھیں احساس ہوا کہ غریب لوگ اپنے لسانی یا صوبائی پس منظر سے قطع نظر پورے ملک میں استحصال کا شکار ہیں، اور وہ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو گئے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ناکامی کے بعد لعل بخش نے کالج چھوڑ دیا لیکن ڈی ایس ایف کی رکنیت برقرار رکھی۔ تاہم رفتہ رفتہ انھیں احساس ہوا کہ سیاسی پارٹیوں کے قول اور فعل میں تضاد ہے تو ۱۹۸۸ میں انھوں نے سیاست کو بالکل خیرباد کہہ دیا۔

کالج چھوڑنے کے بعد لعل بخش نے ویلڈر اور الیکٹریشن کی تربیت حاصل کی لیکن اسے پیشے کے طور پر اختیار نہ کیا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے سال بھر کراچی ڈسٹرکٹ کونسل میں بطور کلرک ملازمت کی۔ پھر دو سال تک ٹی پی ایکس میں کلرک رہے۔ ۱۹۸۹ میں انھوں نے گلوبل ٹیکسٹائل ملز کے کاٹن سیکشن میں ملازمت اختیار کر لی جہاں وہ اب بھی کام کرتے ہیں۔ لیاری میں جو سیاسی پارٹیاں سرگرم ہیں ان میں سے وہ پی پی پی سے متاثر ہیں۔

۱۹۷۸ سے ۱۹۸۸ تک انجمن میں اپنے کردار کے بارے میں لعل بخش نے بتایا، "میں مارشل لا نافذ ہونے کے بعد ۱۹۷۸ سے سیاسی پارٹیوں میں سرگرم رہا۔ میں سیاسی عمل سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ سیاسی پارٹیاں کس طرح بنائی اور چلائی جاتی ہیں۔" ۱۹۷۸ میں انجمن کے دفتر پر تالا پڑا ہوا تھا کیونکہ تنظیم غیر فعال ہو چکی تھی۔ لعل بخش اور ان کے دوست مجاہد (جو سیاست سے لاتعلق تھے اور اب بحرین میں کام کرتے ہیں) لوگوں کو پھر سے متحرک کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے انجمن کے صدر اور جنرل سیکرٹری سے دفتر کھولنے کی درخواست کی۔ انھوں نے ان دونوں کو ناتجربہ کار جان کر درخواست کو نظرانداز کر دیا۔ لعل بخش کو بتایا گیا کہ کسی تنظیم کو چلانا اور اور تنقید اور مخالفت کا سامنا کرنا ایک دشوار عمل ہے اور اس دباؤ کا سامنا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ لعل بخش اور ان کے دوست نے اپنی بات پر اصرار کیا اور ایک مہینے کے اندر اندر انجمن کے عہدے داروں کو دفتر کھولنے پر رضامند کر لیا۔

انجمن کے رکن ۱۶۶ گھرانوں کو نوٹس بھیجے گئے کہ وہ اکتوبر سے ۵ روپے ماہانہ کے حساب سے اپنی رکنیت کی فیس ادا کرنا شروع کر دیں۔ پچھلے واجبات کو معاف کر دیا گیا تاکہ لوگ انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔ جن گھرانوں کو انجمن کے دفتر کے بند ہونے پر اعتراضات تھے ان سے الگ الگ رابطہ قائم کیا گیا۔ علاقے کے باشندوں کا مطالبہ تھا کہ پہلے کی طرح تقریبات کے لیے برتن اور ڈیکوریشن کی خدمات فراہم کی جائیں۔ یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ چونکہ اب دفتر کھل چکا تھا اس لیے لوگ اب خود دفتر میں آکر اپنا ماہانہ چندہ ادا کرنے لگے۔ اس سے پہلے انجمن کے عہدے داروں کو گھر گھر جاکر چندہ وصول کرنا پڑتا تھا۔

لعل بخش اور مجاہد دفتر میں بیٹھتے اور وہاں آنے والے ارکان سے بات چیت کرتے۔ انھوں نے اپنے تمام سیاسی اور غیر سیاسی دوستوں سے رابطہ قائم کیا اور انجمن کے روزمرہ کے انتظامات چلانے کے لیے ان کی مدد طلب کی۔ الٰہی بخش (جو بعد میں جنرل سیکرٹری بنے)، غلام قادر اور کئی دوسرے لوگ اس طرح انجمن کی سرگرمیوں میں شامل ہوئے۔

انجمن کے نوجوان ارکان کئی کمیٹیوں میں انتخابات کا مطالبہ کرنے لگے۔ ۱۹۸۳ میں انھوں نے انجمن کے عہدے داروں کو صدر اور جنرل سیکرٹری کے عہدوں کے لیے انتخابات کرانے پر رضامند کر لیا۔ سابق صدر دوبارہ صدر کے عہدے پر بلامقابلہ منتخب ہو گئے اور جنرل سیکرٹری امیر بخش نے اپنے مخالف ولی محمد کو ہرا دیا۔ لعل بخش نے خود الیکشن نہیں لڑا کیونکہ وہ خود کو ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے جنرل سیکرٹری کے عہدے کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انتخابات کے بعد بھی انجمن کی قیادت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ پرانی قیادت یہی سمجھتی رہی کہ فیصلہ کرنے کے عمل میں لوگوں کو شامل کرنا پیچیدگی اور تاخیر کا سبب بنتا ہے۔ ان کے خیال میں لوگ تنقید کرنے کے شوقین ہوتے ہیں اور خود کوئی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتے۔

لعل بخش اور ان کے دوستوں نے انجمن کو دوبارہ فعال کرنے اور اس کے معاملات میں ارکان کی شمولیت بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ آخر کار انھوں نے انجمن کی قیادت کو اس بات پر قائل کر لیا کہ ایک جنرل باڈی میٹنگ بلائی جائے۔ لعل بخش نے اس میٹنگ میں نئے انتخابات کا معاملہ پھر اٹھایا۔ میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ موجودہ ایگزیکٹو کمیٹی کو توڑ دیا جائے اور نو ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی کو نئے انتخابات کرانے کا کام سونپا جائے۔ انتخابات کی تاریخ کا بھی اعلان کر دیا گیا۔ تاہم اس تمام عمل میں لعل بخش اور ان کے دوستوں سے ایک غلطی ہو گئی۔

چونکہ وہ سب الیکشن کمیٹی کے رکن تھے اس لیے خود انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی بھی عہدے کے لیے کوئی امیدوار سامنے نہ آیا۔ کاغذات نامزدگی داخل کرانے کی آخری تاریخ یعنی ۹ اپریل کو الیکشن کمیٹی نے حالات کا جائزہ لیا اور خود کو ایڈہاک کمیٹی قرار دے کر انجمن کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل دس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا:

- اگلے تین سے چھ ماہ تک کے عرصے میں نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔
- جن ارکان نے انجمن سے لیے ہوئے برتن واپس نہیں کیے ہیں ان سے برتن واپس لیے جائیں گے۔
- نئے برتن خریدے جائیں گے۔
- تمام ارکان کو اپنی رکنیت کی فیس باقاعدگی سے ادا کرنی ہو گی۔
- نئے ارکان کو انجمن میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔
- تمام ارکان سے رابطے بحال کیے جائیں گے۔
- انجمن کے تمام معاملات اور اس کا انتظام ایڈہاک کمیٹی کے پاس ہو گا۔
- علاقے میں جرائم پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی۔
- علاقے میں سماجی کام کیا جائے گا۔
- تکنیکی اور تعلیمی سرگرمیوں کو مدد فراہم کی جائے گی۔

ایڈہاک کمیٹی کے اس مجوزہ پروگرام کی منظوری کے لیے جنرل باڈی میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میٹنگ میں لعل بخش اور ان کے دوستوں کی کوئی مخالفت نہ ہوئی کیونکہ انھوں نے انجمن کے عہدے داروں اور دوسرے ارکان سے پہلے ہی الگ الگ بات کر کے اپنے اس اقدام کا مقصد سمجھا دیا تھا۔ قرارداد منظور کر لی گئی۔

ایڈہاک کمیٹی نے اگلے چھ ماہ کے عرصے میں انتخابات کرائے۔ دو سال کے لیے غلام اکبر کو صدر اور لعل بخش کو جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ اس کے بعد سے انتخابات ہر دو سال کے بعد منعقد کرائے جانے لگے۔ ۱۹۹۲ میں لعل بخش بلامقابلہ دوبارہ جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ ۱۹۹۴ کے انتخابات میں انھوں نے حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا تاکہ دوسرے ارکان کو بھی کام کرنے کا موقع مل سکے۔ ان کو محسوس ہوا کہ انجمن کا کوئی رکن صدر کے طور پر ان کا مقابلہ نہیں کرے گا اور اس طرح وہی صورت حال پیدا ہو جائے گی جو ۱۹۶۸ سے ۱۹۸۸ تک رہی تھی۔

نتائج

اس مطالعے سے کئی نتائج سامنے آتے ہیں جو ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

- **پرانے زمانے سے قائم برادریاں تبدیلی کو سست رفتاری سے قبول کرتی ہیں:** نوالین لیاری کی آبادی پرانی ہے اور کئی نسلوں سے وہاں رہ رہی ہے۔ چنانچہ اس آبادی کی روایتی قیادت اور قدیم اقدار اب تک قائم ہیں۔ نقل مکانی کر کے آنے والوں کی زیادہ متحرک برادریوں کے برخلاف (جو یہاں آنے سے پہلے دیہی علاقوں میں نوالین کے باشندوں کی سی خصوصیات رکھتی تھیں) نوالین کی آبادی تعلیمی اور معاشی طور پر پس ماندہ ہے۔ برادری کے بڑوں کا احترام اور عورتوں کے مقام میں تبدیلی کی مزاحمت وہ دو بڑے مسائل ہیں جن کا یہاں کی نئی نسل سامنا کر رہی ہے۔

- **سرکاری سرپرستی اور ذرائع ابلاغ کی حمایت ترقی کا موجب نہیں بن سکتی:** اپنی سیاسی اہمیت کے پیش نظر لیاری کو حکومت کی طرف سے ترقی کے سلسلے میں ہر طرح کی مدد حاصل ہوئی ہے۔ اسے ذرائع ابلاغ میں بھی شہر کی دوسری کم آمدنی والی بستیوں کے مقابلے میں زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے باوجود لیاری کی پس ماندگی دور نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لیاری کے باشندے حکومت کی ترقیاتی اسکیموں سے بے تعلق ہیں۔ وہ ان اسکیموں کے ڈیزائن، منصوبہ بندی، نفاذ، نگرانی یا ترجیحات کا تعین کرنے کے عمل میں شامل نہیں رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان پر روایتی سماجی ڈھانچے اور پرانی اقدار کی گرفت مضبوط ہے جن کے باعث وہ شہر میں آنے والی بڑے پیمانے کی تبدیلیوں سے خود کو آسانی سے وابستہ نہیں کر پاتے۔

- **پیروکاری کے عمل میں تبدیلیاں آئی ہیں:** لیاری میں تبدیلیاں ضرور آ رہی ہیں، اگرچہ ان کی رفتار کراچی کی نسبتاً نئی آبادیوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ایک بڑی تبدیلی پیروکاری کے طریقے میں واقع ہوئی ہے۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ علاقے کا کوئی بااثر فرد کسی بڑے اور طاقتور سیاست دان کو خط لکھتا تھا اور کسی سرکاری محکمے کی کارکردگی یا بلدیاتی سہولت مثلاً پانی کی فراہمی کے سلسلے میں اس سے شکایت کرتا تھا۔ توقع یہ ہوتی تھی کہ وہ سیاست دان متعلقہ سرکاری محکمے سے رابطہ قائم کر کے کام کروا دے گا۔ اگر شکایت دور نہ ہوتی تو ایک اور درخواست بھیجی جاتی۔ لیکن اب نوجوان قیادت متعلقہ محکمے سے براہ راست رابطہ قائم کرتی ہے اور اسے مسلسل یاد دہانی کرائی جاتی ہے جب تک کہ درخواست منظور نہ ہو جائے۔ اس نئے طریقے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ نئی قیادت تعلیم یافتہ ہے اور سرکاری اہلکاروں سے برابری کی سطح پر بات کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے سرکاری محکموں میں ذاتی تعلقات بھی ہیں کیونکہ علاقے کے بعض افراد کو سرکاری محکموں میں ملازمتیں ملی ہیں۔

- **جن مسائل پر لوگ منظم ہوتے ہیں ان میں تبدیلیاں آ گئی ہیں:** پرانے دور میں لوگ روایتی مسائل پر منظم ہوتے تھے، مثلاً بیواؤں اور یتیموں کی امداد، شادیوں اور جنازوں میں سہولتوں کی فراہمی، اور مذہبی معاملات۔ تاہم اب انھوں نے بنیادی شہری مسائل کے سلسلے میں منظم ہونا شروع کر دیا ہے کیونکہ انھیں احساس ہو گیا ہے کہ ان کے دباؤ کے بغیر سرکاری محکموں کے کام غیر معیاری، ناموزوں اور بدعنوانی کا شکار رہے گا۔ انھیں یہ بھی احساس ہو گیا ہے کہ مناسب اور اچھے معیار کا ترقیاتی کام کرانے کے لیے انھیں تکنیکی اعانت اور کل وقتی کارکنوں کی ضرورت ہے۔

- **تبدیلی کے علمبردار اور ان کی مشکلات:** نوالین میں تبدیلی کے علمبردار نوجوان افراد ہیں جنھوں نے تعلیم یا اپنے تجربے سے لیاری سے باہر کی دنیا کے بارے میں واقفیت حاصل کی ہے۔ ان کو جس سب سے بڑی مشکل کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کمیونٹی یا ترقیاتی کام سے متعلق مسائل پر زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتے کیونکہ انھیں اپنی روزی بھی کمانی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں تکنیکی اور انتظامی رہنمائی درکار ہے تاکہ وہ اپنے کام کو سرکاری محکموں کے کام سے مربوط کر سکیں اور این جی اوز اور پیشہ ور ماہرین سے تعلقات برقرار رکھ سکیں۔

- **بیرونی عوامل کا کردار:** این جی اوز کے مختلف پروگراموں سے نوالین کے کارکنوں کو یہ فائدہ ہوا ہے کہ انھیں تکنیکی اور انتظامی تربیت حاصل ہوئی ہے کہ مثلاً میٹنگ کے نکات کس طرح تیار کیے جائیں، رپورٹیں کیسے لکھی جائیں اور حساب کتاب کیسے رکھا جائے۔ اس کے علاوہ انھیں مختلف این جی اوز اور کمیونٹی گروپوں سے روابط قائم کرنے کا موقع ملا ہے جس سے ان کی آگاہی، صلاحیت اور ذہنی وسعت میں اضافہ ہوا ہے۔ این جی اوز کی جانب سے اس تعاون کے بغیر لیاری کی تنظیمیں اتنی موثر نہ ہو سکتیں جتنی کہ اب ہو رہی ہیں۔ تاہم کل وقتی کارکنوں کی تنخواہوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا مسئلہ اب بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ جب امدادی ادارے مالی اعانت فراہم کرتے بھی تو کارکنوں کے صرف کیے ہوئے وقت کو یا ٹائپنگ اور فوٹو اسٹیٹ کے خرچ کو منظور شدہ اخراجات میں شامل نہیں کرتے۔ ان ضروری کاموں کے لیے رقم کی غیر موجودگی ایک بڑا مسئلہ ہے اور

اس سے ان تنظیموں کے موثر انداز میں کام کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

• **چھوٹے مسائل اور وسیع تر تناظر سے ان کا تعلق:** اگرچہ انجمن کی موجودہ قیادت آبادی کی سطح کے مسائل کو سمجھنے لگی ہے اور ان سے نمٹنے کے قابل ہو رہی ہے، لیکن وہ اب تک ان مسائل کو بڑے تناظر میں رکھ کر سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ محلے کی سطح پر نکاس کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں کیا جا سکتا جب تک مرکزی پمپنگ اسٹیشن کو کام کرنے کے قابل نہ بنایا جائے۔ اور اس مقصد کے لیے مقامی تنظیموں کو ایک کنفیڈریشن قائم کر کے اجتماعی عمل کا آغاز کرنا ہوگا۔ فی الحال یہ کام مقامی تنظیموں کے بس سے باہر نظر آتا ہے۔

• **لیاری سے نقل مکانی:** آبادی کی گنجائی میں اضافے اور اس سے پیدا ہونے والے ماحولیاتی تنزل کے باعث بہت سے خاندان لیاری چھوڑ کر شہر کے کناروں پر قائم کچی آبادیوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس سے اس قدیم برادری کا رشتہ دوسرے نسلی اور سماجی گروہوں سے قائم ہو رہا ہے۔ علاقے کے بہت سے باشندے محسوس کرتے ہیں کہ اس سے ان کی برادری میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔

اس تبدیلی کا ایک مظہر یہ ہے کہ اب مقامی قیادت کو احساس ہو چلا ہے کہ حکومت کی طرف سے کتنی بڑی رقمیں لیاری کی ترقی کے لیے خرچ کی جاتی ہیں اور کس طرح ان رقموں کو خرد برد کر لیا جاتا ہے۔

• . **عورتوں کا مسئلہ:** علاقے میں عورتوں کا روایتی کردار اب تک برقرار ہے، اگرچہ ان کے اردگرد کے ماحول میں گہری تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ اس کشمکش کو تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن اس کا حل اگلی نسل ہی میں نکل سکے گا بشرطیکہ لڑکے اور لڑکیاں زیادہ تعداد میں تعلیم حاصل کریں۔

• **سرکاری محکموں میں بدعنوانی پر کنٹرول:** یہ بات واضح ہے کہ سرکاری محکموں میں بدعنوانی پر سیاست دانوں کے ذریعے یا روایتی طریقوں سے قابو پانا ممکن نہیں ہے۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مقامی تنظیمیں این جی اوز اور پیشہ ور ماہرین کی تکنیکی اعانت سے خود کو اس سلسلے میں منظم کریں۔ نوالین کے سلسلے میں اس قسم کے اتحاد کا قیام مستقبل کا حصہ ہے۔

ویلفیئر کالونی

بستی کا خاکہ

۲

ویلفیئر کالونی

پروین رحمان

تعارف

ویلفیئر کالونی ایک کم آمدنی والی کچی آبادی ہے جو ۳۰ سے ۱۳۵ ایکڑ کے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کالونی کراچی کے مرکز میں یونیورسٹی روڈ پر سبزی منڈی کے پیچھے حسن اسکوائر کے قریب واقع ہے۔

ویلفیئر کالونی میں ۱۳۱۵ مکانات اور ۱۱۷ گلیاں ہیں۔ اس میں تین دیگر نئی آبادیاں بھی شامل ہیں: کسٹوڈین کمپاؤنڈ، کرنال بستی اور پیر بخاری کالونی۔ کرنال بستی اور کسٹوڈین کمپاؤنڈ کی آبادی اردو بولنے والے لوگوں پر مشتمل ہے جبکہ پیر بخاری اور ویلفیئر کالونی کے باشندے پٹھان اور پنجابی ہیں۔ ویلفیئر کالونی میں کسٹوڈین کمپاؤنڈ کا علاقہ ۱۹۴۷ سے آباد ہے۔

مکان مالکان زمین کی ملکیت کے کاغذات یا لیز حاصل کرنے کے مرحلے میں ہیں۔ لیز کی ادائیگی سے (جس میں ترقیاتی واجبات بھی شامل ہیں) حاصل ہونے والی رقم سے حکومت نالے کی تعمیر کا کام انجام دے گی جس کا مطلب ہے کہ نالہ یا اخراج کا قدرتی ذریعہ جو کہ آٹھ فٹ چوڑا اور ۲۰۰۰ رواں فٹ لمبا ہے اور جو آبادی کے مرکز میں بہتا ہے، ایک کنکریٹ کے ڈھکے ہوئے نالے میں بدل دیا جائے گا۔

ویلفیئر کالونی کی کہانی لوگوں کی جد و جہد اور تنظیمی صلاحیتوں کی قوت کی مظہر ہے۔ آبادی کی ترقی میں حکومت کا کردار برائے نام رہا ہے۔ اچھا خاصا ترقیاتی کام کمیونٹی نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر مکمل کیا ہے۔ اکیانوے فیصد گلیوں میں نکاس کی لائنیں ہیں جو وہاں کے شہریوں نے ۱۵ لاکھ روپے کی سرمایہ کاری سے ڈالی ہیں۔ اسی طرح پانی کی لائنیں ۱۶ لاکھ روپے کی لاگت سے بچھائی گئی ہیں۔ کمیونٹی کی دیگر کوششوں میں نالے کے اوپر تین موریوں کی تعمیر، گلیوں اور سڑکوں میں مٹی کی بھرائی، قبرستان کے آدھے ایکڑ کے اطراف چہار دیواری کی تعمیر اور علاقے کے

سروے کے نقشے کی تیاری شامل ہے۔ آج اگر آپ یہاں گلیوں میں سے گزریں تو آپ کو قدرتی گیس کی لائنیں بچھائی جاتی دکھائی دیں گی۔ یہ بھی لوگوں کی جدوجہد اور سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔

ہر علاقے کے لوگوں الگ الگ تنظیمیں ہیں۔ سب سے زیادہ فعال انجمن اتحاد ویلفیئر کالونی ہے جس کے صدر محبوب شاہ ہیں۔ تین مواقع پر یہ تنظیمیں مختلف معاملات سے نمٹنے کے لیے متحد ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے ۷۵-۱۹۷۴ میں جب علاقے میں پانی کی ضرورت تھی؛ پھر ۱۹۸۶ میں جب پٹھان مہاجر فسادات شروع ہوگئے تھے، اور پھر ۱۹۹۱ میں جب لیز کی کاروائی کے لیے سروے کے نقشے کی ضرورت تھی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے باشندوں نے، جو یہاں کے قدیم ترین شہری ہیں، کاموں میں شرکت کے معاملے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

ویلفیئر کالونی میں ترقیاتی کام تاج محمد خان، تمکدار خان، فیض محمد، سبحان چاچا، اور حاجی عمر خطاب جیسے کارکنوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو ۱۹۷۰ کی دہائی میں اور وسط ۱۹۸۰ کی دہائی میں فعال تھے۔

کالونی کے حالیہ کارنامے جن لوگوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہیں وہ ویلفیئر سوسائٹی فیڈریشن کے صدر محبوب شاہ اور ان کی جماعت ہے جس میں ناصر برکی (جو ٹی وی انجینئرنگ میں کام کرتے ہیں)، روزا میل خان، سعید اللہ جان، بختیار خاں، احسان اللہ، راجہ سرفراز (جو سب منڈی میں مزدور

ویلفیئر کالونی کا ایک منظر

ہیں) اور اسماعیل آفریدی (جو حبیب بینک میں کام کرتے ہیں) شامل ہیں۔

ویلفیئر کالونی کے کچھ باشندوں کی علاقے میں چھوٹی دکانیں ہیں۔ زیادہ تر رکشا اور ٹیکسی چلانے والے، پھل فروش اور منڈی میں مزدور ہیں۔ یہاں کچھ ٹالیں، پھلوں کو ڈبوں میں پیک کرنے کے مراکز، چپلیں، نماز کی ٹوپیاں اور ریڈی میڈ کپڑے تیار کرنے کے گھریلو کارخانے، اور درزی خانے بھی ہیں۔

آبادی کا ارتقا

۱۹۴۷ میں یہ علاقہ دیہہ گجرو کا حصہ تھا۔ یہاں ۲۶ آشرم تھے۔ ہر آشرم ۱۵ فٹ لمبے اور ۱۲ فٹ چوڑے ایک کمرے میں قائم تھا۔ سامنے ایک مندر تھا۔ اس کے اطراف میں ۱۰۰ ایکڑ کی زرعی زمین تھی۔ صنعتی علاقہ بھی قریب ہی واقع تھا۔ تقسیم کے بعد یہ آشرم مہاجرین کو دے دیے گئے کیونکہ یہ متروکہ جائیداد قرار دے دیے گئے تھے۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے وکیل صاحب اس علاقے کے اولین آبادکاروں میں سے تھے۔

قریبی صنعتی علاقے میں فیکٹریاں تھیں، مثلاً بھارت وائر نیٹنگ ورکس، بھارت لیمپس، دولت رام ٹیکسٹائل، بھارت چاکلیٹ اور ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری۔ مزدوروں میں سے متعدد کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں زمین کے مالک تھے۔

لوگوں نے آشرموں کے سامنے پلاٹوں پر اور بعد میں اس

پھلوں اور سبزیوں کی منڈی جو مزدوروں کو معاش بھی فراہم کرتی ہے اور تنظیم کی قوت بھی

کے آس پاس زمین پر قبضہ کرلیا۔ اب کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں ۵۰ مکانات ہیں۔ تقسیم کے بعد صنعتی یونٹوں کے اطراف بہت سا تعمیراتی سامان مثلاً سیمنٹ اور سریا موجود تھا۔ مہاجروں نے اسے نئے مکانات کی تعمیر میں استعمال کیا۔

آہستہ آہستہ نئی آبادی کے رقبے میں اضافہ ہوا اور وہ لوگ جو مزار قائد کے آس پاس کی جھونپڑیوں سے منتقل کیے گئے تھے یہاں آکر آباد ہوگئے۔ پھر مسیحیوں کی آبادی عیسیٰ نگری بھی نزدیک ہی قائم ہو گئی۔

مکانوں کی تعمیر کے لیے سامان قرض پر تھلوں سے حاصل کیا جاتا ہے

۱۹۶۵ میں جب پھل اور سبزی کی مارکیٹ سولجر بازار سے، جو اُس وقت شہر کا مرکز تھا، موجودہ سبزی منڈی کی جگہ منتقل کی گئی تو زیادہ تر مزدور، پھل فروش اور دکان دار بھی موجودہ جگہ پر منتقل ہوگئے۔ چنانچہ پیر بخاری کالونی اور ویلفیئر کالونی ۱۹۷۰ کی دہائی کے وسط تک آباد ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ کنکریٹ کے مکانات تعمیر ہوئے جن کے لیے سامان تھلوں سے ادھار پر حاصل کیا گیا۔ بجلی اس علاقے میں ۱۹۷۰ میں آئی۔ ٹیلیفون کے کنکشن ۱۹۷۱ میں لگائے گئے۔

ثقافتی اور تفریحی سرگرمیاں

ایک سالانہ مذہبی اور ثقافتی تقریب دسمبر میں جھنڈا شاہ بابا کا عرس ہے۔ یہ ایک مقامی تہوار ہے۔ تنظیم کے ممبران منڈی سے چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔ قوالیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور سب کے لیے کھانا پکتا ہے۔ قبرستان کے قریب کھلے میدان میں میلہ سارا دن جاری رہتا ہے۔

آبادی کے قریب ہی میدان میں کرکٹ اور فٹبال کے سالانہ ٹورنامنٹ منعقد کیے جاتے ہیں۔ کھیل کے میدانوں کا انتظام گبول اسپورٹس کلب اور غنی الیون ٹیم کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گبول کالونی ویلفیئر کالونی سے متصل ایک آبادی ہے۔ میدان پڑوس کے ایک پرنٹنگ پریس کی ملکیت ہے اور آس پاس کے علاقوں، مثلاً فرقان آباد، غریب آباد، عیسیٰ نگری، گبول گوٹھ اور منو گوٹھ وغیرہ، کے باشندوں کے استعمال میں رہتا ہے۔

صحت کے مسائل اور سہولتیں

شیر خوار بچوں کی اموات کی شرح بلند ہے۔ اوسطاً ہر خاندان میں پانچ میں سے ایک بچہ مر جاتا ہے۔ بچے زیادہ تر پیچش یا یہاں کے لوگوں کے الفاظ میں دست اور بخار سے مرتے ہیں۔ ہر خاندان میں ہر ماہ ایک بچہ بیمار ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ عام بیماریاں پیچش، ملیریا، بخار، کھانسی، انفلوئنزا اور ٹائیفائڈ ہیں جو جون، جولائی اور دسمبر کے زمانے میں زیادہ ہوتی ہیں۔ آبادی میں پولیو کے سات کیس علم میں آئے ہیں۔

اوسطاً ایک سال میں ایک ممبر فی خاندان ہسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ اس پر اوسط خرچ ۱۵۰۰ سے ۳۰۰۰ روپے تک

ایندھن کے لیے لکڑی کی فروخت

ہوتا ہے۔ صحت پر ماہانہ خرچ فی خاندان اوسطاً ۲۵۰ روپے ہے۔

آبادی میں آٹھ نجی کلینک کام کرتے ہیں جو فی مریض ۲۵ سے ۳۰ روپے تک فیس لیتے ہیں۔ ہر کلینک میں ہر روز اوسطاً ۲۵ سے ۳۵ تک مریض آتے ہیں جن میں سے زیادہ تر کو بخار کو شکایت ہوتی ہے۔ ایدھی ٹرسٹ ۱۹۹۲ سے آبادی میں ایک ہسپتال چلا رہا ہے۔ لوگ گلشن اقبال میں واقع نجی ہسپتالوں میں بھی جاتے ہیں۔ جیسے کہ رضوان ہسپتال، ندیم ہسپتال، لیاقت نیشنل ہسپتال اور اشفاق ہسپتال۔

کچھ لوگ پیروں کے پاس بھی جاتے ہیں جو زیادہ تر طویل بیماریوں کی صورت میں ہوتا ہے جب دوائیں کام نہیں کرتیں۔

علاقے کا کوئی بھی کلینک حفاظتی ٹیکوں کی سہولت بہم نہیں پہنچاتا سوائے ایدھی کلینک کے جہاں یہ سہولت حال ہی میں شروع کی گئی ہے۔ اس سے پہلے صرف ۲۰ فی صد بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگائے گئے تھے مگر پچھلے دو سال میں زیادہ بڑی تعداد کو ٹیکے لگائے گئے۔

پرائیویٹ کلینک علاج کی سہولت فراہم کرتے ہیں

لوگ عیسیٰ نگری میں واقع آغا خان کلینک میں بھی جاتے ہیں جو ۱۹۹۰ سے قائم ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایدھی کلینک کو ترجیح دیتے ہیں جہاں ایک ٹیکے کے ۵ روپے لیے جاتے ہیں۔ محبوب شاہ کہتے ہیں، "جب سے علاقے میں لیز اور ترقیاتی کام کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور او پی پی کے ارکان ہم سے ملے ہیں اور سینی ٹیشن اور صحت کے مسائل کے بارے میں ہم سے گفتگو کی ہے، ہم میں احتیاطی تدابیر کے بارے میں آگہی بڑھی ہے۔" چنانچہ اب زیادہ سے زیادہ لوگ اپنے بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگوا رہے ہیں۔ نالے کی تعمیر اور غلاظت کے ڈھک دیے جانے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا رجحان صفائی اور صحت کا خیال رکھنے کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ قبرستان کے قریب جو زمین نالے کی تعمیر کے بعد بازیاب کی گئی ہے اس کا ویلفیئر تنظیم نے سروے کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ کوئی وہاں ہسپتال تعمیر کرے اور اسے چلائے۔ یہ پلاٹ اسے مفت فراہم کیا جائے گا۔

زیادہ تر بچے گلیوں میں ننگے پیر کھیلتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ کبھی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے، کبھی سیدھے بیٹھے ہوئے، پاؤں پھیلا کر آرام کرتے ہوئے وہ سر تا پا دھول میں اٹ جاتے ہیں۔ کچھ بچے نالے کے بالکل قریب بھی کھیلتے ہیں اور اس طرح براہ راست بہتی ہوئی غلاظت اور کوڑا کرکٹ ان کے جسموں کو لگ جاتا ہے۔

جہاں نالے کو ڈھک دیا گیا ہے وہاں بچے براہ راست غلاظت کے قریب آنے سے بچ جاتے ہیں۔ چھوٹے بچے اپنے گھروں کے قریب گلیوں میں کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچے قریب کھیل رہے ہوں تو مائیں انہیں محفوظ محسوس کرتی ہیں۔

بستی سے گزرنے والا نالہ گندے اور بارش کے پانی کے نکاس کا ذریعہ بھی ہے اور ماحول کی آلودگی کا سبب بھی

پرائیویٹ اسکول بچوں کو تعلیم کی سہولت فراہم کرتے ہیں

سڑکیں

آبادی میں کوئی پکی سڑکیں یا گلیاں نہیں ہیں۔ لوگوں نے منظم ہو کر حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن منتخب نمائندوں یا سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے۔

ماحولیاتی تجزیہ

علاقے میں کوئی پکی گلیاں نہیں ہیں۔ تاہم گلیاں صاف ستھری ہیں سوائے کچھ کوڑے کے ڈھیروں اور کچھ کھلے مین ہولوں کے۔ زیر زمین نکاس کی لائنوں کی بدولت جو لوگوں نے خود ڈالی ہیں، گلیوں میں غلاظت کے بہنے کی مصیبت پر کسی حد تک قابو پالیا گیا ہے۔
آبادی سے گزرنے والی ندی غلاظت، کوڑے کرکٹ، اور بارش کے پانی کے اخراج کا کام کرتی ہے۔ یہ علاقے میں گندگی کی بنیادی وجہ ہے۔ اب جبکہ اس ندی کو ڈھک دیا گیا ہے صورت حال میں خاصی بہتری ہوئی ہے۔
گلیوں میں درخت برائے نام ہیں۔ پانی کی کمی اور بارش کا فقدان ان کی نمود میں رکاوٹ ہیں۔ تاہم جہاں کہیں گھروں میں جگہ ہے لوگوں نے سبزیاں اگائی ہیں اور درخت لگائے ہیں۔

تعلیم

صرف ۲۵ فیصد بچے اسکول جاتے ہیں۔ آبادی میں دو پرائیویٹ اسکول اور ایک ایدھی اسکول ہے۔ علاقے کے دونوں پرائیویٹ اسکول چھٹی جماعت تک ہیں جبکہ ایدھی اسکول میں پانچویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ فی اسکول اوسطاً ۱۰۰ سے ۱۲۵ طلبا موجود ہیں۔ ماہانہ فیس ۳۰ سے ۵۰ روپے تک ہے۔ کچھ بچے قریب واقع شرف آباد کے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاتے ہیں۔
صرف ۱۶ سے ۲۰ تک لڑکے اور ۴ سے ۵ تک لڑکیاں کالج میں پڑھتی ہیں۔ اسکول جانے والی لڑکیوں کی شرح لڑکوں کے مقابلے میں کم ہے۔ بیشتر خاندان اپنے چھوٹے بچوں کو اسکول بھیجنا چاہتے ہیں مگر بچوں کو آبادی سے باہر بھیجنا انہیں دشوار اور غیر محفوظ معلوم ہوتا ہے کیونکہ بچوں کو بڑی سڑکیں پار کرنا پڑتی ہیں۔ فاصلہ جتنا زیادہ ہو والدین کی فکروں میں اتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ ٹریفک کی وجہ سے حادثوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی خواہش ہے کہ آبادی ہی میں مزید اسکول کھولے جائیں۔

ویلفیئر کالونی میں کمیونٹی تنظیمیں

علاقے میں چار کمیونٹی تنظیمیں ہیں۔ کرنال بستی، پیر بخاری کالونی، کسٹوڈین کمپاؤنڈ اور

مین یونیورسٹی روڈ کے پاس واقع ہونے کی وجہ سے ٹرانسپورٹ کی کوئی دقت نہیں

ذرائع آمد و رفت

چونکہ یہ آبادی شہر کے وسط میں بڑی سڑکوں کے قریب واقع ہے اس لیے اہم تجارتی اور صنعتی علاقوں کے لیے عام ذرائع آمد و رفت بہ آسانی دستیاب ہیں۔

ویلفیئر کالونی کی اہم تاریخیں

۱۹۴۷ سے ۱۹۸۰ تک

۱۹۴۷	آبادی قائم ہوئی۔ ۳۶ آشرم متروکہ جائیداد قرار دے کر ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کے حوالے کر دیے گئے۔ لوگوں نے قریب واقع کنڈوئٹ سے پانی کے غیر قانونی کنکشن حاصل کر لیے۔
۱۹۶۰	قائداعظم کے مزار کی مجوزہ جگہ پر آباد لوگوں کو وہاں سے ہٹا کر ویلفیئر کالونی منتقل کیا گیا۔ قریب ہی ملک پلانٹ کی تعمیر کی وجہ سے مزدور کرنال بستی میں آباد ہو گئے۔
۱۹۶۳-۶۴	سبزی منڈی اور فروٹ منڈی کے مزدوروں کی یونینیں قائم ہوئیں۔
۱۹۶۵	سبزی منڈی ویلفیئر کالونی کے قریب اپنی موجودہ جگہ پر منتقل ہوئی۔
۱۹۶۵-۷۰	سبزی منڈی کے مزدور ویلفیئر کالونی، کرنال بستی اور پیر بخاری میں آباد ہوئے۔ ٹیکسی اور رکشا ڈرائیور اور مکینک بھی اس علاقے میں بس گئے۔
۱۹۷۴	کراچی ملک پلانٹ کے لیے پانی کی لائن اس آبادی میں سے گزاری گئی۔ لوگوں نے خود کو منظم کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا اور اپنی آبادی کے لیے پانی کے بارہ اسٹینڈ پوسٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔
۱۹۷۷	قومی انتخابات کی مہم کے دوران علاقے کے امیدواروں کی مدد سے کارکن علاقے میں بجلی کے لیے این او سی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔
۱۹۷۹	علاقے کے دو سو گھروں نے منظم ہو کر اپنی مدد آپ کی بنیاد پر یونیورسٹی روڈ سے گزرنے والی پانی کی مین لائن سے کنکشن حاصل کر لیے۔ مزید اسٹینڈ پوسٹ نصب کیے گئے۔
۱۹۷۹-۸۰	کارکنوں نے علاقے کے باشندوں کو اپنی مدد آپ کی بنیاد پر نکاس کی لائن ڈالنے کے لیے منظم کیا۔
۱۹۸۰	چھ مقامی تنظیموں کی فیڈریشن قائم ہوئی جس میں قریب کی آبادیوں کی تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ اس بات کا عام احساس پیدا ہوا کہ پیروکاری کے لیے شہریوں کی زیادہ تعداد کا منظم ہونا ضروری ہے۔

ویلفیئر کالونی چاروں میں ایک ایک تنظیم قائم ہے۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے علاوہ باقی تینوں تنظیمیں مل کر کام کرتی ہیں۔

تنظیم کے کام کے لیے باشندوں سے کوئی مقررہ رقم جمع نہیں کی جاتی۔ جب کبھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے، اس مخصوص کام کے لیے چندہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ اضافی رقم دفتری اخراجات کے لیے تنظیم کے فنڈ کے طور پر بچالی جاتی ہے۔ سبزی منڈی سے بھی چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ لیز کے کام کے لیے ہر فائل پر ایک رقم لیز پروسیسنگ سروس فیس کے طور پر واجب الادا ہوتی ہے جو تنظیم کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔ یہ فنڈ دفتر کے کرائے اور گرمیوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تنظیم کے ممبران رضا کارانہ بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ کارکنوں کا کہنا ہے کہ وہ رضا کارانہ طور پر اپنا وقت اس لیے دیتے ہیں کہ انھیں علاقے کے مسائل اور ساتھ ساتھ اپنے مسائل بھی حل کر کے سکون حاصل ہوتا ہے۔ لوگ ان کی عزت اور حمایت کرتے ہیں۔ اس سے ان کا سماجی جذبہ زندہ رہتا ہے۔ جیسا کہ محبوب شاہ کہتے ہیں، "ہم چین سے بیٹھ نہیں سکتے۔" روزا میل کا کہنا ہے، "ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ یہ ہمارے علاقے کا مسئلہ نہیں، ہم سب کا مسئلہ ہے۔"

زیادہ تر کارکنوں کے پاس کمیونٹی کے کام کے لیے وقت ہے۔ وہ سبزی منڈی میں صبح چار بجے سے تقریباً صبح گیارہ بجے تک کام کرتے ہیں اور بارہ بجے دوپہر کے بعد سے فارغ ہوتے ہیں۔ کرنال بستی میں تعمیراتی کام کرنے والے

ویلفیئر کالونی میں معاشی سرگرمیاں: چٹائیوں کی پیکنگ

ویلفیئر کالونی میں معاشی سرگرمیاں: بوریوں کی سلائی اور مرمت

ویلفیئر کالونی میں معاشی سرگرمیاں: کپڑوں کی سلائی

ٹھیکیداروں کے پاس بھی فالتو وقت ہوتا ہے۔ پیر بخاری میں مرد زیادہ تر ٹیکسی ڈرائیور ہیں اور کسی اور کے ملازم نہیں چنانچہ وہ بھی کیمونٹی کے کام کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔

ان تینوں تنظیموں کا ڈھانچا ایک جیسا ہے: ایک صدر، دو نائب صدر، جنرل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، خزانچی، اطلاعات اور اشاعت کا سیکرٹری اور ایک منتظم اعلیٰ جو تنظیم کے قواعد و ضوابط کو دیکھتا ہے۔ ہر تنظیم کی اپنی مجلس عاملہ ہے۔ ویلفیئر تنظیم کی مجلس عاملہ کے ۵۲ اراکین ہیں اور کرنال بستی تنظیم کے ۲۱ اراکین۔ عہدیداروں اور مجلس عاملہ کے انتخابات ہر چار سال کے بعد کیے جاتے ہیں۔ ممبران کا انتخاب جنرل باڈی اجلاس کے دوران ہوتا ہے۔

۱۹۸۰ میں یہ سمجھتے ہوئے کہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو تو سرکاری محکموں پر دباؤ ڈالنا زیادہ آسان ہوتا ہے، تاج محمد خان جیسے کارکنوں نے کراچی ویلفیئر فیڈریشن تشکیل دی۔ یہ علاقے کی تنظیموں کی فیڈریشن تھی جو پوری ویلفیئر کالونی کی نمائندگی کرتی تھی جس میں ہمسایہ نئی آبادیوں کی دو تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ محبوب شاہ، ناصر برکی، اور روزا میل خان اس کے فعال اراکین تھے۔ تاج محمد منتخب صدر تھے۔ فیڈریشن میں مندرجہ ذیل تنظیمیں شامل تھیں: کرنال کالونی تنظیم، کراچی فروٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن، مسیحی لیگ، فروٹ ورکرز ویلفیئر ایسوسی ایشن، انجمن اتحاد پیر بخاری کالونی، اور بجر ٹرسٹ۔

آج کل محبوب شاہ کراچی ویلفیئر فیڈریشن کے صدر ہیں۔ کرنال اور پیر بخاری ویلفیئر کے صدر بالترتیب گل شیر نواز، عبدالحمید قریشی اور لقمان بادشاہ ہیں۔

تمام تنظیموں کی سرگرمیاں ملتی جلتی ہیں۔ طویل جدوجہد کے بعد وہ اپنے علاقوں کے لیے لیز کی دستاویزات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ تنظیم کا کراچی کے کئی علاقوں میں واقع دوسری تنظیموں سے رابطہ ہے جہاں سبزی منڈی کے مزدور رہائش پذیر ہیں۔ یہ مضبوط تنظیمی نیٹ ورک منڈی یونینوں کی قوت کا نتیجہ ہے جس سے بیشتر ممبران تعلق رکھتے ہیں۔ (منڈی یونینوں کی تفصیلات ضمیمہ ا میں دیکھیے۔)

کیمونٹی کی جدوجہد

پانی کے لیے تگ و دو

۱۹۴۷ میں ۱۸ انچ سے لے کر ۴۸ انچ کے قطر کا ایک پانی کا پائپ آبادی کے نیچے سے گزرتا تھا جو ڈملوٹی سے ماری پور تک پانی فراہم کرتا تھا۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ اور کرنال بستی میں لوگوں نے پانی کے پائپ سے براہ راست غیر قانونی کنکشن لیے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ اداروں سے اجازت نہیں لی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انھیں اجازت نہیں دی جائے گی۔ ان کے مطابق یہ ایسا ہی ہوتا جیسے کہ آ بیل مجھے مار۔ لوگوں نے آدھے

انچ سے پونے انچ چوڑی ٹونٹیوں کے ذریعے جوڑ بنائے اور پھر انھیں ایک انچ سے دو انچ قطر کی پانی کی لائنوں سے جوڑ دیا تاکہ وہ دیگر گھروں میں بھی پانی فراہم کریں۔

۱۹۶۰ میں جب لوگ پیر بخاری اور ویلفیئر کالونی میں آباد ہونا شروع ہوئے تو وہ دولت رام گھوسل گوٹھ یا گبول گوٹھ میں واقع کے ڈی اے کے ایک ٹوٹے ہوئے والو سے پانی لاتے تھے۔ یہ گاؤں اس آبادی سے متصل ہی واقع تھے۔ لوگ کنستروں میں پانی لے جاتے تھے۔ کچھ لوگ آبادی کے لوگوں سے ۵۰ پیسے فی کنستر کے حساب سے پانی خریدا بھی کرتے تھے۔

۱۹۷۴ میں کراچی ملک پلانٹ کے لیے پانی کی لائن علاقے کے کچھ حصے میں سے گزار کر ڈالی گئی۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے شہریوں نے اپنے علاقے کے لیے پانی کی لائن کے لیے درخواست دی۔ ان کی درخواست پی پی پی سے جو اس وقت اقتدار میں تھی تعلق رکھنے والے وزیر حفیظ پیرزادہ نے قبول کرلی۔

ویلفیئر کالونی پیر بخاری اور کرنال بستی کے ممبران بھی کنکشن لینا چاہتے تھے۔ نمکدار خان، سبحان چاچا، اور حاجی عمر خطاب جیسے کارکنوں کی مدد سے فائل وزیر صاحب کے دفتر سے ہٹوادی گئی اور اس کی جگہ تمام علاقے کے لیے اسٹینڈپوسٹ کی ایک درخواست داخل کی گئی۔ یہ درخواست منظور ہوگئی۔

چند سال تک پانی کی فراہمی کافی تھی لیکن پھر کمی پیش آنے لگی کیونکہ کراچی ملک پلانٹ کی لائن کے پانی میں کمی کردی گئی تھی۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ اور کرنال بستی کے لوگوں نے مین لائن سے ایک دوسرا کنکشن لے لیا۔ چونکہ یہ مکانات پانی کے ذخیروں کے نزدیک تھے اس لیے پانی کا دباؤ کافی تھا۔ "ہم نے ایک لائن ڈالی اور فی مکان ۳۰۰ روپے خرچ کیے،" ڈاسٹ پبلک اسکول کے ڈائریکٹر اشرف نے بتایا۔

۱۹۷۹ میں تاج محمد خان اور محبوب شاہ کی تنظیمی کوششوں سے پیر بخاری اور ویلفیئر کالونی میں تقریباً ۲۰۰ گھروں سے ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپے فی مکان جمع کیے گئے۔

ویلفیئر کالونی تنظیم کی کوششیں ایک نظر میں

۱۹۸۴ سے ۱۹۹۵ تک

۱۹۸۴ — قبرستان کو قبضہ گیروں کے قبضے میں جانے سے بچایا گیا۔ اپنی مدد آپ کی بنیاد پر چندہ جمع کرکے قبرستان کے گرد چاردیواری تعمیر کی گئی۔ محبوب شاہ ایک سماجی رہنما کے طور پر سامنے آئے۔

۱۹۸۶ — شہر میں مہاجروں اور پٹھانوں کے درمیان فسادات ہوئے، لیکن ویلفیئر کالونی کے سماجی کارکنوں نے متحد ہوکر اپنے علاقے کے باشندوں کو ان کے اثر سے محفوظ رکھا۔ عوامی سہولت کے لیے مخصوص ایک پلاٹ کو منشیات فروشوں کے مافیا کے قبضے میں جانے سے بچایا گیا۔ ایدھی ٹرسٹ کو دعوت دی گئی کہ اس پلاٹ پر اسکول اور کلینک قائم کرے۔

۱۹۸۹ — محبوب شاہ نے بلدیاتی انتخابات میں شکست کھائی لیکن ہول سیل فروٹ مارکیٹ یونین کے خزانچی منتخب ہوئے۔

۱۹۹۰ — محبوب شاہ کو منشیات کے بیوپاریوں کی سازش سے زہر دیا گیا لیکن ان کی جان بچ گئی۔

۱۹۹۱ — سبزی منڈی میں ڈکیتی کے بعد یونینوں نے دو دن کی ہڑتال کی اور تحفظ فراہم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ مارکیٹ میں آگ بھڑک اٹھی اور ۱۶۰۰ مزدور بے گھر ہوگئے۔ یونینوں نے سرگرم ہوکر منشیات اور اسلحے کی تجارت کرنے والے مافیا کا صفایا کیا۔ وزیراعلیٰ کے مشیر عرفان اللہ مروت کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں کالونی کی ریگولرائزیشن کا نوٹیفکیشن حاصل کیا گیا۔ تین مقامی تنظیموں نے رقم جمع کرکے سروے کے نقشے تیار کرائے اور سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے ساتھ لیز پلان تیار کیا۔

۱۹۹۲ — سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے لیز کیمپ لگایا۔ لیز فراہم کرنے کا عمل شروع ہوا لیکن نئے ڈائرکٹر جنرل نے اسے روک دیا۔ سوئی گیس کی لائن کے لیے درخواستیں جمع کرائی گئیں۔ سو مکانوں نے پانی کی لائن کے لیے رقم جمع کی۔ گنے کی منڈی کو علاقے سے منتقل کردیا گیا۔ آڑھتیوں نے مزدوروں کو نکال دیا۔ منڈی یونینوں نے دس دن تک احتجاج کیا اور انھیں دوسری یونینوں کی بھی حمایت حاصل ہوئی۔

۱۹۹۳ — تسنیم صدیقی کے دوبارہ ڈائرکٹر جنرل بننے پر لیز دینے کا عمل دوبارہ شروع ہوا۔ علاقے کے باشندوں نے نالے پر دو کلورٹ تعمیر کیے۔

۱۹۹۴ — اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ نے ویلفیئر کالونی میں کام شروع کیا۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے لیز سے جمع ہونے والی رقم کو ترقیاتی کام میں لگانے پر آمادگی ظاہر کی۔ نالے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ علاقے کے باشندوں نے او پی پی آر ٹی آئی کی رہنمائی میں کام کی نگرانی کی۔ سوئی گیس کی لائنیں ڈالی گئیں۔

۱۹۹۵ — سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے نئے ضابطوں سے اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کارکنوں نے اپنا تعاون واپس لے لیا۔ اتھارٹی نے پرانے ضابطے بحال کردیے اور تنظیموں نے دوبارہ اس کے ساتھ کام شروع کیا۔ پڑوس کی آبادی نے علاقے کے کارکنوں سے مدد طلب کی تاکہ کے ایم سی کے ہاتھوں عوامی سہولت کے لیے مخصوص ایک پلاٹ کے غلط استعمال کو روکا جاسکے۔ حکومت نے سبزی منڈی کو علاقے سے باہر منتقل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ تنظیم نے مزدوروں کو منظم کیا کہ وہ ٹریڈ یونین اور اجتماعی سوداکاری ایجنٹ کے طور پر رجسٹریشن حاصل کریں تاکہ مزدوروں کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔ نئی سبزی منڈی کے قریب مزدوروں کے لیے رہائشی سہولتوں کے بارے میں حکومت سے مذاکرات شروع ہوئے۔ کوششیں تاحال جاری ہیں۔

سبزی منڈی سے بھی چندہ اکٹھا کیا گیا۔ کل ۳۰،۰۰۰ روپے کی جمع شدہ رقم سے یونیورسٹی روڈ کے ساتھ ساتھ چلنے والی مین لائن سے ایک غیر قانونی کنکشن لیا گیا اور آبادی میں ایک نیا اسٹینڈ پوسٹ نصب کر دیا گیا۔ لیکن سات سال کے بعد اس میں پانی کا دباؤ کم ہو گیا کیونکہ ہمسایہ آبادیوں کے کنکشنوں کی وجہ سے اور آس پاس تعمیر ہونے والے لگژری فلیٹوں کی وجہ سے لائن پر بوجھ بڑھ گیا۔

مقامی کنوؤں سے پانی کی فراہمی

۱۹۸۹ میں عیسیٰ نگری کے لوگوں نے حکومت سے ۱۴ انچ قطر کی پانی کی پائپ لائن حاصل کرلی۔ محبوب شاہ اور ان کے فعال ساتھیوں نے عیسیٰ نگری کے باشندوں سے اجازت حاصل کی اور مقامی کونسلر کی وساطت سے لائن سے ایک کنکشن لے لیا۔ لیکن لائن میں پانی کا دباؤ مناسب نہیں تھا۔ اس مین لائن کے لیے لوگوں نے فی مکان ۲۰۰ سے ۳۰۰ روپے تک چندہ دیا۔ کچھ مدت میں لوگوں نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر اپنی گلیوں میں پانی کی لائنیں بچھائیں۔

۱۹۹۲ میں ڈپٹی اقبال نے، جو ایم کیو ایم کے کونسلر تھے، ایک مین لائن فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ لوگوں نے فی مکان (تقریباً ۱۰۰ مکانوں نے) ۷۰۰ روپے چندہ جمع کیا اور یہ رقم کونسلر کو دی۔ ایک ۱۸ انچ قطر کی لائن سے دولت رام روڈ میں کنکشن دیا گیا لیکن پھر وہی ہوا کہ پانی کا دباؤ کم تھا اور وہ تمام گھروں تک نہیں پہنچ سکا۔

پانی کی کمی اور بے قاعدہ فراہمی سے نمٹنے کے لیے لوگوں نے پانی کی فراہمی کا ایک متبادل نظام قائم کیا ہوا ہے۔ کچھ لوگوں نے موٹر پمپ نصب کیے ہیں تاکہ اپنے گھروں میں پانی کھینچ سکیں۔ علاقے کے دو مکانوں میں ۳۰ سے ۴۰ فٹ گہرے کنویں ہیں۔ ۱۵ سے ۲۰ مکانوں میں لوگوں نے ۱۸ سے ۲۰ فٹ گہرے کنوؤں سے بورنگ کروائی ہے۔ ایسے کنوؤں پر ۳،۰۰۰ سے ۶،۰۰۰ روپے تک لاگت آتی ہے۔ کنویں کا پانی میٹھا ہے مگر بورنگ سے ملنے والا پانی قدرے کھاری ہے۔ لوگ اس کھاری پانی کو شدید کمی کے زمانوں میں ہی پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

پانی کی تقسیم کا نظام ان خوش نصیبوں کے لیے جن کے پاس پانی وافر مقدار میں آتا ہے آمدنی کا ذریعہ ہے کیونکہ پانی کو بورنگ کے ذریعے حاصل کرنے والے اور کنوؤں کے مالکان سبزی منڈی اور ہمسایوں میں پانی بیچتے ہیں۔ گدھا گاڑیاں جن میں ۱۱۵ گیلن پانی سے بھرے ہوئے ٹینک لدے ہوتے ہیں گھروں میں پانی پہنچاتے ہیں جسے پمپ کے ذریعے چھت پر بنے ہوئے ٹینکوں میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ ایک ٹینک کی قیمت ۳۰ سے ۴۰ روپے تک ہوتی ہے۔ شاہ ثروب کنویں کا پانی فروخت کرنے والا ہر روز چھ ٹینک فروخت کرتا ہے۔

اپنی مدد آپ کی بنیاد پر پانی کی لائنیں ڈالی جا رہی ہیں

فضلے اور گندے پانی کے اخراج کے امکانات

گندگی کا اخراج شروع میں عارضی بنیادوں پر تھا۔ "ہم نے اپنے مکانوں کے قریب گندے پانی کو اکٹھا کرنے کے لیے گڑھے کھود لیے تھے اور فضلے کے لیے بالٹیوں کے بیت الخلا بنا لیے تھے،" محبوب شاہ کہتے ہیں۔ "جمعدار ہر مکان سے ہر روز فضلہ

اٹھانے کے ۵ روپے ماہانہ لیتے تھے۔ لیکن چونکہ جمعدار بے قاعدگی سے آتے تھے اس لیے لوگ فضلہ اٹھا کر آبادی سے گزرنے والے نالے میں پھینک دیتے تھے۔ کچھ لوگوں نے سوک پٹ بھی بنائے ہوئے تھے۔ اس وقت نالہ اس سے دگنا بڑا اور گہرا تھا جتنا آج ہے، یعنی تقریباً ۱۸ فٹ چوڑا اور ۸ فٹ گہرا۔"

۱۹۷۹-۱۹۸۰ کے دوران لوگوں نے اپنی گلیوں میں نکاس کی لائنیں بچھانے کے لیے کوشش شروع کردیں۔ وہ نالہ جو آبادی میں سے گزرتا تھا یونیورسٹی روڈ کے ساتھ واقع متصل علاقوں کے غلاظت اور بارش کے پانی کے اخراج کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ان لوگوں نے جو نالے کے قریب رہتے تھے سب سے پہلے اپنی گلیوں میں نکاس کی لائنیں ڈالیں۔ ابتدا میں مختلف طریقوں سے کام انجام دیا گیا۔ محمد بشیر کہتے ہیں، "میرا گھر نالے سے ۴۰ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے نکاس کی لائن آزادانہ طور پر ڈالی اور ۳۰۰ روپے اس پر خرچ کیے۔"

ایک اور شہری سعید اللہ خان کا کہنا ہے، "ہم نے نکاس کی لائن ہر مکان سے سو روپے چندہ لے کر خود ڈالی۔ پہلے ہم نے ۵۰ روپے جمع کیے، پھر ۳۰ اور پھر ۲۰ روپے دو قسطوں میں جمع کیے گئے۔ جب ہم نے ابتدا میں لائن ڈالی تب ہمارے پاس کوئی تخمینہ نہیں تھا۔ جیسے جیسے رقم خرچ ہوتی رہی اور کام آگے بڑھتا رہا ہم مزید رقم جمع کرتے گئے۔ ہم نے علاقے کے مستریوں کو ٹھیکے پر اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اب لائن دو تین دفعہ ڈالی جا چکی ہے۔

ایک صاف ستھری گلی

گلیوں میں اپنی مدد آپ کی بنیاد پر نکاس کے نظام کی تعمیر

ہر بار ہم نے پائپ کا قطر بڑھا دیا اور لاگت میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپے فی مکان اضافہ ہوا۔ لیکن ہر بار ہماری لائن بند ہو جاتی ہے۔ ہم اسے خود ہی صاف کرتے ہیں یا کسی جمعدار کو بلاتے ہیں جو فی مکان ۵ سے ۱۰ روپے تک لیتا ہے۔ نالے کی چوڑائی اور گہرائی کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے ہمیں اپنی گلیوں کو مٹی سے بھرنا پڑتا ہے اور نکاس کی لائن کا قطر بڑھانا پڑتا ہے۔

دلدار خان کا کہنا ہے، "۱۹۸۲ میں ہم نے ۳۰۰ روپے فی مکان جمع کیے اور اپنی نکاس کی لائن بچھائی۔ ہم نے اسے برابر کی گلی کی زیر زمین نکاس کی لائن سے جوڑ دیا۔"

ہم نے نکاس کی لائنیں ڈالتے ہوئے ایک دوسرے سے مشورہ نہیں کیا۔ ہر شخص نے بس پائپ لائن کے اس حصے کے لیے رقم کی ادائیگی کی جو اس کے مکان میں آتا تھا۔ لیکن پائپ لائن کسی کام کی نہیں، روز بند ہو جاتی ہے،" سردار محمد اکبر کہتے ہیں جو زیادہ خوش نہیں ہیں۔

تاہم تمام کوششیں ناکامی کا شکار نہیں ہوئی ہیں۔ محبوب شاہ یاد کرتے ہیں، "ہمارے علاقے میں سبحان چاچا اور نمکدار خان نے لوگوں کو مناسب اور منظم طریقے سے نکاس کا لائنیں ڈالنے کے لیے متحرک کیا۔ پہلے بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے متصل گلیوں میں لوگ منظم نہیں ہو پاتے تھے۔ ایک گلی کے رہنے والے متفق ہو جاتے تھے مگر برابر کی گلیوں والے نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں مسائل کھڑے ہوتے تھے کیونکہ ایک گلی والے برابر کی گلیوں والوں کی ان کی لائنیں اپنی لائن سے

جوڑنے نہیں دیتے تھے۔ لیکن پھر معاملہ نمٹا لیا جاتا تھا اور بعد میں شامل ہونے والی گلیوں کے لوگ کنکشن کے لیے اضافی رقم ادا کرتے تھے۔ یہ دوسروں کے لیے ایک سبق ہوتا تھا۔ چنانچہ بعد میں کام زیادہ منظم انداز میں ہوا۔"

کچھ گلیوں میں لوگوں نے خود کام کیا لیکن زیادہ تر میں انھوں نے کسی مقامی مستری کو کام دیا جو خرچ کا تخمینہ لگا کر دیتا تھا۔ دو اشخاص ہر مکان سے پیسے جمع کرنے اور کام کا انتظام سنبھالنے پر مقرر کیے جاتے تھے۔

آج تمام ۱۷ گلیوں میں اپنی مدد آپ کی بنیاد پر نکاس کی لائنیں بچھی ہوئی ہیں۔ مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر گلیوں میں نکاس کی لائنیں کارآمد حالت میں ہیں۔ تاہم ان کی گہرائی اس سے کم ہے جو ہونی چاہیے لیکن یہ بھی ہے کہ نالے کی سطح محدود ہے۔ کنکریٹ اور اینٹوں کے بنے مین ہولوں کی جسامت اور ساخت مختلف ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں مین ہولوں کے کنکریٹ کے ڈھکنے موجود ہیں۔ جہاں ڈھکنے غائب ہیں وہاں لوگوں نے پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے انھیں ڈھکنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔

پائپوں کی مرمت کا اور انہیں دوبارہ بچھانے کا کام، جہاں کہیں بھی نظام جواب دینے لگتا ہے، جاری رہتا ہے۔ ناصر برکی نے، جو ویلفیئر تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہیں، حال ہی میں اپنی گلی میں نکاس کی لائن کے ایک حصے کو دوبارہ تعمیر کیا ہے۔ "میری گلی میں چالیس مکانوں کے لوگوں نے فی مکان ۱۰۰ روپے جمع کیے اور نالے کے ایک حصے کو دوبارہ بچھایا،" انھوں نے کہا۔ یہ ٹوٹ گیا تھا کیونکہ اسے بہت کم گہرائی پر بچھایا گیا تھا اور اس کو صرف چھ انچ کی مٹی کی تہہ سے ڈھکا گیا تھا۔

محبوب شاہ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ تکنیکی رہنمائی کے فقدان کی وجہ سے لوگوں کو نکاس کی لائنیں دو یا تین دفعہ ڈالنا پڑیں۔ نالے کے قریب گلیوں میں لائنیں سب سے پہلے ڈالی گئیں چنانچہ یہ نالیاں زیادہ پرانی ہیں۔ جب نالہ کیچڑ سے بھر گیا تو وہ گلیاں جو براہ راست نالے سے جڑی ہوئی تھیں بند ہو گئیں اور انھیں کئی بار دوبارہ ڈالنا پڑا۔ ہر دفعہ چندہ فی مکان ۵۰ سے ۲۰۰ اور حتیٰ کہ ۴۰۰ روپے تک ہو گیا۔ پائپ کا قطر بھی بڑھایا گیا کیونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ قطر جتنا بڑا ہوگا پائپ میں کچھ پھنسنے کا امکان اتنا ہی کم ہوگا۔

زمین پر ناجائز قبضے، نالے کا کیچڑ سے اٹ جانا، سوکھے کچرے کو نالے میں ٹھکانے لگانا اور متصل علاقوں کے لیے پانی کے کنکشنوں میں اضافہ مزید مسائل کا سبب بنا۔ چونکہ ویلفیئر کالونی ایک نیچی سطح پر واقع علاقہ ہے اس لیے آغا خان ہسپتال، اور یونیورسٹی روڈ کے ساتھ ساتھ بنے قریبی فلیٹوں اور تجارتی علاقوں تک سے بارش کا اور گندا پانی اس نالے میں خارج ہوتا ہے۔ کے ڈبلیو ایس بی نے ایک ڈھکی ہوئی سطح کا نالہ ان علاقوں میں نکاس کے لیے بنایا تھا اور یہ اخراج ابتدا میں یونیورسٹی روڈ کے ساتھ ۱۵ انچ قطر کے بڑے نالے میں ہوتا تھا۔ چونکہ یہ نالہ اکثر بند ہو جاتا تھا اس لیے ڈھکے ہوئے ڈرین کو کافی عرصہ پہلے ویلفیئر کالونی کے نالے سے جوڑ دیا گیا۔ یونیورسٹی روڈ کے ساتھ کسی بارش کے پانی کے نالے یا اخراج کے مقام کی غیر موجودگی میں ملحقہ علاقوں سے بارش کا تمام پانی ان آبادیوں اور نالے میں داخل ہو جاتا ہے۔

بارشوں کے دوران نالہ تباہی کا باعث بن جاتا تھا۔ وقت کے ساتھ اس کی چوڑائی صرف چھ سے آٹھ فٹ تک رہ گئی تھی اور گہرائی چار سے آٹھ فٹ تک۔ چنانچہ بارش کے دنوں میں علاقے کا ایک تہائی سے زیادہ رقبہ زیر آب آ جاتا۔ آس پاس کے تمام علاقوں سے بارش اور نکاس کا پانی ویلفیئر کالونی کے نالے میں داخل ہو جاتا جو اخراج کا واحد راستہ تھا۔ اگر دوسرے علاقوں کا پانی نہ ہوتا تو اس نالے کی گنجائش ویلفیئر کالونی کے بارش کے اور گندے پانی کے نکاس کے لیے کافی تھی۔

علاقے کے لوگ گلیوں کی سطح کا یعنی "اندرونی" نکاس کا نظام پہلے ہی اپنی مدد آپ کی بنیاد پر تعمیر کر چکے تھے۔ انھوں نے گلیوں میں پانی کی پائپ لائن بھی خود ڈالی تھی۔ اب واضح طور پر اس بات کی ضرورت تھی کہ نالے کی تعمیر کا یعنی "بیرونی" کام مکمل کیا جائے، کیونکہ علاقے میں سینی ٹیشن کی صورت حال اس کے بغیر بہتر نہیں ہو سکتی تھی۔ جنوری ۱۹۹۴ میں جب او پی پی آر ٹی آئی نے علاقے کے باشندوں کے کیے ہوئے کام کی دستاویز سازی کی تو اس نے بھی اس ضرورت کو نوٹ کیا۔ علاقے کے لوگوں کے علاوہ او پی پی آر ٹی آئی نے بھی سندھ کچی آبادی اتھارٹی سے درخواست کی کہ لیز سے حاصل ہونے والی رقم کو نالے کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس نکتے پر خاص زور دیا گیا کہ صرف نالے کی تعمیر سے سندھ کچی آبادی اتھارٹی علاقے میں گندے پانی کے نکاس کے بہت بڑے مسئلے کو حل کرنے کا بہت کم وقت میں پورا کریڈٹ لے سکتی ہے۔ اتھارٹی کے ڈائرکٹر جنرل نے نالے کی تعمیر پر رضامندی ظاہر کی اور اس سلسلے میں ڈیزائن تیار کرنے کے لیے او پی پی آر ٹی آئی سے تعاون کی درخواست کی۔ فروری ۱۹۹۴ میں او پی پی آر ٹی آئی اور اتھارٹی نے نالے کے معائنے کے لیے دورہ کیا۔ محبوب شاہ اور علاقے کے دوسرے سماجی کارکن بھی ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے مسائل کی نشان دہی کی اور یہ بھی بتایا کہ بارش کا پانی کن راستوں سے نالے میں داخل ہوتا ہے۔

او پی پی نے اتھارٹی کے انجینئروں کو مشورہ دیا کہ وہ دو متبادل ڈیزائن تیار کریں جن میں سے ایک میں نالے کو بارش اور نکاس کے پانی دونوں کے اخراج کے لیے استعمال کیا جائے اور دوسرے میں اسے صرف بارش کے پانی کے اخراج کے لیے رکھا جائے اور نکاس کے پانی کے لیے اس کے متوازی ایک ٹرنک نالہ تعمیر کیا جائے۔ اس ڈیزائن میں اس بات کا خیال رکھا جانا ضروری تھا کہ نالے کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے مکانوں میں سے کم سے کم کو مسمار کرنے کی ضرورت پڑے۔ اتھارٹی کے انجینئروں نے پہلے ہی سے ایک ڈیزائن تیار کر رکھا تھا اور او پی پی نے اس کا جائزہ لینے پر آمادگی ظاہر کی۔

ایک ڈھکے ہوئے نالے کا بنیادی ڈیزائن تیار کیا گیا۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے دو مرحلوں کے منصوبے کے پہلے مرحلے پر کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا جو نالے کے ۱۰۰۰ رننگ فٹ کے حصے پر مشتمل تھا جہاں سے لیز کی بیشتر رقم وصول کی جا چکی تھی۔ نالے کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو کرنال بستی کے باشندوں میں بھی لیز حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ نالے کی تعمیر کا باقی کام اور لیز کے کاغذات فراہم کرنے کا کام ساتھ ساتھ جاری ہے۔

بارش کے بعد گلیاں زیر آب

سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست

علاقے کا بیشتر سوکھا کچرا نالے میں ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔ لیکن اب جبکہ نالہ تعمیر کیا جا رہا ہے، پیر بخاری، کرنال بستی اور ویلفیئر کالونی کے سماجی کارکن لوگوں کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ کے ایم سی کے فراہم کیے ہوئے ڈسٹ بنوں میں کچرا پھینکیں۔ نالے کے کنارے پر رہنے والے لوگ بھی دوسرے لوگوں کو نالے میں کچرا پھینکنے سے روکتے ہیں۔

نالے کی تعمیر کے بعد قبرستان کے قریب کی زمین بازیاب کی گئی ہے اور اسے اب سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ علاقے کی ۲۵ فیصد گلیوں میں جمعداروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو فی گھر ۱۵ روپے لیتے ہیں اور کچرا جمع کر کے کے ایم سی کی کچرا کنڈیوں میں ڈال دیتے ہیں۔ باقی گلیوں کے لوگوں کو بھی یہی طریقہ اختیار کرنے کے لیے متحرک کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کارکن پمفلٹ تقسیم کر رہے ہیں۔ یہ پمفلٹ تنظیم کے ارکان ہی لکھتے اور تقسیم کرتے ہیں۔

بجلی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد

کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے وکیل صاحب کا کہنا ہے کہ بجلی ۱۹۷۰ میں حاصل کی گئی تھی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ کس طرح۔ باقی علاقے کے لیے تاج محمد خان، نمکدار خان اور ان کے گروپ نے کے ای ایس سی کے ساتھ پیروکاری کی۔ انھوں نے درخواستیں دیں اور حکام سے ملاقاتیں کیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۷۷ کے انتخابات کے دوران حلقہ ۵۸ کے امیدوار زبیر اکرم ندیم کے ذریعے سے کے ڈی اے سے اس سلسلے میں این او سی حاصل کیا گیا۔ پھر ۱۹۷۹ کے بلدیاتی انتخابات میں علاقے کے باشندوں نے ایک شرط پر امیدوار جاوید اقبال کی حمایت کا اعلان کیا۔ "اگر جاوید اقبال کو یہاں سے ووٹ لینے ہیں تو انھیں پہلے اس علاقے کو بجلی فراہم کرانی ہو گی۔" انتخابات سے پہلے کھمبے لگے، تار کھینچے گئے اور بجلی آگئی۔ لیکن محبوب شاہ کا مکان چونکہ نالے کے بالکل کنارے پر واقع تھا اس لیے ان کی گلی میں کھمبے نصب نہ کیے جا سکے۔ انھوں نے اپنے تین پڑوسیوں کے ساتھ مل کر ۲،۵۰۰ روپے جمع کیے، ایک سیمنٹ کا ستون تعمیر کیا جس کے اوپر بجلی کا کھمبا نصب کیا گیا اور یوں انھیں بجلی کا کنکشن مل سکا۔

مکانوں کو دیے جانے والے کنکشنوں کے لیے ہر گھر سے ۱،۰۰۰ سے ۱،۵۰۰ روپے تک جمع کیے گئے۔ مقامی کارکنوں نے لوگوں کو رقم اور بجلی کی فراہمی میں لگنے

والے وقت کے بارے میں آگاہ کیا۔ یہ رقم کے ای ایس سی کی ہدایات کے مطابق بینک میں جمع کرائی گئی۔

لیز کے کاغذات کا حصول

عرفان اللہ مروت نے ویلفیئر تنظیم کی مدد کی اور ۱۹۹۱ ایک نوٹیفکیشن جاری ہوا جس میں علاقے کو ایسی کچی آبادی کے طور پر تسلیم کیا گیا جسے ریگولرائز ہونا تھا۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ، کرنال بستی اور پیر بخاری کالونی کو بھی اس میں شامل کر کے ویلفیئر کالونی کا حصہ بنا دیا گیا۔ ۱۹۹۱ میں مروت کی حیثیت عملاً صوبے کے وزیر اعلیٰ کی سی تھی۔ ان کو حاصل اختیارات کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس وقت کے صدر مملکت کے داماد تھے۔ پٹھان ہونے کی وجہ سے انھیں اس علاقے کے پٹھانوں میں اپنا ووٹ بینک قائم رکھنے کی بھی فکر تھی۔ چاروں بستیوں کے کارکنوں نے اپنے علاقے کا دورہ کرنے کی دعوت دی اور ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا۔ اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے مروت نے لیز کا انتظام کرنے کا وعدہ کیا۔

علاقے کی تنظیموں نے محبوب شاہ سے درخواست کی کہ وہ لیز کے معاملات میں ان سب کی نمائندگی کریں۔ وہ اور تنظیم کے نمائندے مروت کا خط لے کر سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے پاس گئے اور علاقے کے لیے لیز جاری کرنے کی درخواست کی۔ تسنیم صدیقی کے ڈائرکٹر جنرل ہونے کی وجہ سے لیز جاری کرنے کے عمل میں تیز رفتاری آئی۔ اتھارٹی نے علاقے کا فیزیبلٹی سروے کیا اور اندازہ لگایا کہ یہ تنظیمیں علاقے کے باشندوں کی درست نمائندگی کرتی ہیں۔ چونکہ کوئی سیاسی دباؤ نہیں تھا اس لیے اتھارٹی نے ویلفیئر کالونی کو اپنی لیز کی فہرست میں شامل کر لیا۔ علاقے میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں اتھارٹی کے نمائندوں اور علاقے کے کارکنوں نے شرکت کی۔ لوگوں نے اتھارٹی کے اہلکاروں کی موجودگی میں محبوب شاہ کو اپنی نمائندگی کا کام سونپا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ لیز کیمپ تنظیم کے دفتر میں لگایا جائے گا۔ لوگوں کی سہولت کے لیے لیز کیمپ کے اوقات کار سہ پہر دو بجے سے رات دس بجے تک رکھے گئے۔

مقامی تنظیم کے چند فعال کارکن: محبوب شاہ، ناصر برکی اور روز اسمٰعیل خان

سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی ہدایت اور مروت کی مدد سے تنظیم نے کے ڈی اے سے علاقے کا نقشہ نکلوایا۔ اس سلسلے میں محبوب شاہ نقشے کی درخواست اور مروت کا خط لے کر کے ڈی اے کے دفتر گئے۔ جب ایک ہفتے تک کوئی جواب موصول نہ ہوا تو محبوب شاہ نے مروت سے کے ڈی اے کے سروے ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کو فون کرایا۔ اس پر فوری ایکشن ہوا اور علاقے کا نقشہ جاری کر دیا گیا۔ نقشے کے ساتھ ساتھ علاقے کے باشندوں کے شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات مثلاً راشن کارڈ اور بجلی کے بل کی نقلیں جمع کر کے تنظیم نے اتھارٹی کو فراہم کیں۔

جب سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے کے ڈی کے فراہم کردہ نقشے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں صرف ویلفیئر کالونی کو شامل کیا گیا ہے اور پلاٹوں کی

لیز حاصل کرنے کے لیے لوگوں کی کوششیں: ایک میٹنگ کا منظر

نشان دہی مناسب طور سے نہیں کی گئی ہے۔

اتھارٹی کے لیزنگ کے سائٹ انچارج ریاض کا کہنا ہے، "اس وقت اتھارٹی کے پاس فنڈز کی قلت تھی اس لیے سروے کر کے نقشہ تیار کرنا ممکن نہ تھا۔ ہمارے تیار کردہ نقشے میں زمین کا استعمال دکھایا جانا ضروری ہوتا ہے، یعنی یہ کہ پلاٹ رہائشی ہے یا تجارتی، خالی ہے یا رفاہی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تعمیر کی نوعیت بھی ظاہر کی جاتی ہے، کیونکہ ان معلومات کا ہماری منصوبہ بندی پر اثر پڑتا ہے۔ ہم نے علاقے کے باشندوں سے انتظار کرنے کو کہا، لیکن انھوں نے انتظار کرنے کے بجائے خود نقشہ تیار کرالیا۔"

علاقے کا سروے اور نقشہ سازی: علاقے کے باشندوں نے ایک پرائیویٹ فرم کی خدمات حاصل کیں

چونکہ یہ زمین شہر کے مرکز میں واقع تھی اس لیے ایم پی اے حاجی حنیف طیب جیسے سیاست دانوں کی نظریں اس پر تھیں۔ لوگوں کو بھی ان کی کوششوں کے بارے میں علم تھا، اس لیے وہ لیز حاصل کرنے کے لیے مزید انتظار کرنا نہیں چاہتے تھے۔

"ہم نے ایک پرائیویٹ کنسلٹنٹ ضمیر ایسوسی ایٹس کی خدمات حاصل کیں۔ انھوں نے سروے کرنے اور نقشہ تیار کرنے کے لیے ایک ہزار روپے فی ایکڑ معاوضہ طلب کیا،" محبوب شاہ کہتے ہیں۔ "پورے علاقے کا رقبہ، کسٹوڈین کمپاؤنڈ، کرنال بستی اور پیر بخاری کو ملا کر ۱۳۵ ایکڑ تھا۔ اس طرح کل رقم ۳۵ ہزار روپے بنی۔ ہم نے آبادی کے مختلف حصوں میں جا کر میٹنگیں کیں اور لوگوں کو سمجھایا۔ کئی گروپ رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سلسلے میں کوئی خاص مسئلہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ بعض لوگوں کو بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ لوگوں کو اپنے مقرر کردہ کمیونٹی کارکنوں پر اعتماد تھا۔ پھر بے دخلی کا خطرہ بھی موجود تھا کیونکہ حاجی حنیف طیب کے اثر ورسوخ کے باعث فائلیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں جن کے ذریعے انھیں زمین کا قبضہ ملنے والا تھا۔ لوگوں کو یہ احساس تھا کہ وقت ضائع ہونے سے نقصان ہوگا۔ مختلف لوگوں کی مختلف مالی حیثیت کے پیش نظر چندے کی کوئی رقم متعین نہیں کی گئی، اور اس طرح لوگوں کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ جتنی استطاعت رکھتے ہیں اتنی رقم ادا کریں۔ رقم جمع کرنے کے لیے کارکنوں کو ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک جنرل باڈی قائم کی گئی جس میں ویلفیئر کالونی سے محبوب شاہ اور اسمٰعیل صاحب، کرنال بستی سے ستار صاحب، اور پیر بخاری سے دلدار خان اور روزامیل خان شامل تھے۔ ان میں سے ہر رکن اپنے اپنے علاقے میں رقم جمع کرنے کا ذمہ دار تھا۔ ہر گھر نے سو روپے سے ۵۰۰ روپے تک ادا کیے اور اس طرح کل ۷۵ ہزار روپے جمع ہوئے۔ بیواؤں سے کوئی رقم نہیں لی گئی اور بعض لوگ ایسے تھے جنھوں نے کچھ نہیں دیا۔"

سروے کا کام جاری ہے

باقاعدگی سے منعقد کی جانے والی کارنر میٹنگوں سے رقم جمع کرنے میں مدد ملی۔ اس عمل کے دوران ہی سروے کا کام شروع ہوگیا تھا اور اسے دیکھ کر بھی لوگ ادائیگی پر آمادہ ہوئے۔ رقم کی باقاعدہ رسید جاری کی گئی۔ لوگوں سے حاصل

ہونے والی رقم اور اس کے خرچ کا حساب تنظیم کے دفتر میں ایک رجسٹر میں رکھا گیا۔ سروے مکمل ہونے میں دو ماہ لگے۔ مکانوں کو شمار کرنے اور نشانات لگانے میں تنظیم کے ارکان نے سروے کرنے والوں کی مدد کی۔

جب نقشہ تیار ہو گیا تو سروے فرم کو ۳۵ ہزار روپے ادا کیے گئے۔ نقشہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے پاس جمع کرایا گیا۔ علاقے کا سماجی و اقتصادی سروے اور لے آؤٹ پلان تیار کرنے کا کام اتھارٹی نے خود کیا اور ڈرائنگوں کی جانچ کی۔ ویلفیئر کالونی کے نقشے دوبار تیار کرنے پڑے۔ مکمل ہونے پر نقشے تنظیم کے دفتر میں آویزاں کر دیے گئے تاکہ لوگ ان پر اپنی رائے دے سکیں۔ لوگوں سے کہا گیا کہ اگر انھیں کوئی اعتراض ہو تو خط کی صورت میں لکھیں یا دفتر میں رکھے ہوئے رجسٹر میں درج کر دیں۔

اسّی مکانات پانی کے کنڈوئٹ پر واقع ہے، جو کے ڈبلیو ایس بی کی ملکیت تھا، چنانچہ ہمارے لیے ان مکانوں کو لیز جاری کرنا ممکن نہ تھا۔ دوسرے اعتراضات سے نمٹنے میں دو ماہ کا عرصہ لگا جبکہ ہمارا اندازہ تھا کہ یہ کام ایک ماہ میں پورا ہو جائے گا۔ زیادہ تر اعتراضات مکانوں کے ان حصوں کے بارے میں تھے جنھیں سڑک اور نالے کی چوڑائی برقرار رکھنے کے لیے مسمار کیا جانا تھا۔ مثلاً ایک شخص کا اعتراض تھا کہ اس کے مکان کا ڈیڑھ فٹ چوڑا حصہ گرایا جا رہا ہے جبکہ اس کے سامنے والے مکان کا صرف ایک فٹ حصہ مسمار کیا جا رہا ہے،" ریاض بتاتے ہیں۔ "ہم نے بیشتر اعتراضات کو تسلیم کر لیا۔ مثال کے طور پر ایک ۲۰ فٹ چوڑی گلی کو ۱۵ فٹ چوڑی گلی میں بدل دیا گیا، لیکن ہم نے یہ بات واضح کر دی کہ اتھارٹی کے ضوابط کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ ان ضوابط میں حدیں متعین ہیں۔ یعنی گلی کی چوڑائی کو ۲۰ فٹ سے ۱۵ فٹ کیا جا سکتا ہے لیکن ۹ فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ گلی کی کم سے کم چوڑائی ۸ فٹ مقرر کی گئی اور اگر کچھ اور جگہ دستیاب تھی تو ہم نے اسے بھی گلی میں شامل کر لیا۔

"ہم نے لوگوں کو بتایا کہ اگر ہم نے ان کی دیوار توڑی تو ان کو زیادہ مشکل ہو گی اس لیے بہتر ہو گا کہ یہ کام وہ خود کریں۔ اس بات کا لوگوں کی طرف سے اچھا جواب ملا۔ لوگوں نے خود ہی اپنی دیواریں دو فٹ سے چھ فٹ تک پیچھے ہٹا لیں۔ سب سے پہلے کمیونٹی کے رہنماؤں نے یہ کام کیا۔ جب تک دیوار پیچھے ہٹا نہ لی جاتی تب تک چالان جاری نہ کیا جاتا۔

"متاثرین کی تعداد ۵۰ سے ۱۰۰ تک تھی جن میں سے ۷۰ فیصد لوگوں نے دیواریں خود ہٹائیں۔ لوگوں مل کر ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ بہت چھوٹے مکانوں میں ۲۰ سے ۳۰ تک لوگ رہ رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم نے اس پر غور کیا ہے لیکن گلی کی چوڑائی ۱۵ فٹ سے ۹ فٹ نہیں کی جا سکتی۔ اس پر ایک میٹنگ بلائی گئی۔ کمیونٹی کے رہنما بھی آئے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہمارے پاس دو راستے ہیں: یا تو کام روک دیا جائے یا پھر اگر لوگ تعاون کریں تو ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے تیار کردہ منصوبے سے ترقیاتی کام میں آسانی پیدا ہو گی۔ مثلاً کے ڈبلیو ایس بی چھ انچ قطر کی پانی کی لائن اسی وقت ڈال سکتا ہے جب گلی کی چوڑائی ۱۰ فٹ ہو۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے حتمی منصوبے کو قبول کر لیا۔ اس طرح کام شروع ہوا۔"

نالے کی تعمیر کے لیے سروے: سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے انجینئر کا دورہ

ایک کمیونٹی کارکن ناصر برکی یاد کرتے ہیں، "بہت سی میٹنگیں ہوئیں جن میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی تجویز کردہ تبدیلیوں کی خوبیوں اور خرابیوں پر بحث کی گئی۔ بحث کا مرکزی موضوع گلیوں کی چوڑائی تھا۔ کچھ ممبروں کو محسوس ہوتا تھا کہ گلیوں کی چوڑائی بڑھانے کی وجہ سے ان کے پلاٹ ۱۰ سے ۱۵ فٹ تک کم چوڑے ہو گئے ہیں۔ اتھارٹی کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا گیا جو یہ تھا کہ گلی کی چوڑائی اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ ضرورت پڑنے پر ایمبولینس یا فائر بریگیڈ کی گاڑی داخل ہو سکے اور اس کے علاوہ پانی اور نکاس کی لائنیں ڈالی جا سکیں۔ فیصلہ ہوا کہ گلیوں کی چوڑائی ۸ سے ۱۵ فٹ تک رکھی جائے کیونکہ یہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے کافی ہے اور

اس طرح متاثر ہونے والے پلاٹوں کی تعداد بھی کم سے کم رکھی جاسکے گی۔"

سروے کرنے والی فرم کو ۱۵ہزار روپے کی اضافی رقم دی گئی تاکہ وہ نقشوں میں تبدیلیوں کو ظاہر کر کے حتمی نقشے تیار کرے۔ ان تبدیلیوں کے سلسلے میں بعض جگہ مکانوں کو ۲فٹ سے ۶فٹ تک پیچھے ہٹانا پڑا۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی اور علاقے کے باشندوں کے درمیان یہ طے پایا کہ لوگ یہ تبدیلیاں خود کریں گے۔

اتھارٹی کے ڈائرکٹر جنرل اور او پی پی کے ارکان نے باشندوں کو لیز حاصل کرنے پر متحرک کیا اور اتھارٹی کی ترقیاتی پالیسی کی وضاحت کی

لیز کیمپ کا آغاز: ۱۹۹۲

آخرکار ۱۹۹۲ کے اوائل میں تنظیم کے دفتر میں لیز کیمپ قائم کیا گیا۔ ویلفیئر کالونی اور پیر بخاری کالونی کے ارکان نے اس میں حصہ لیا۔ تنظیم کے ممبروں نے فائلیں تیار کرنے اور شناخت کی ضمانت دینے اور ثبوت مہیا کرنے کے کام میں مدد کی۔ فارم علاقے کے باشندوں کو ۱۰روپے فی فارم کے حساب سے براہ راست فراہم کیے گئے۔

ریاض کہتے ہیں، "ہم نے ایک ہزار فارم دیے اور ہمیں سات سو فائلیں موصول ہوئیں، جن میں سے ۱۰۰ متنازعہ تھیں۔ اس طرح ہم نے ۶۰۰ چالان جاری کیے اور ان میں سے ۴۰۰ نے لیز کے واجبات ادا کیے۔ ہم فارم جاری کر کے درخواست گزاروں کو تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کو کہتے جن میں اس بات کا ثبوت مہیا کرنا بھی شامل تھا کہ درخواست گزار اس بستی میں ۱۹۸۵ سے رہ رہا ہے۔ اس کے لیے ہم کوئی بھی دستاویز قبول کر لیتے ہیں، مثلاً شناختی کارڈ، ریڈیو/ٹی وی لائسنس، کسی بھی نوعیت کا سرکاری کارڈ، نکاح نامہ، راشن کارڈ، ووٹر لسٹ، یا کوئی بھی سرکاری کاغذ۔ ثبوت کے لیے ہماری کوئی متعین شرط نہیں ہے۔ کوئی بھی ایسا کاغذ جس سے درخواست گزار کے علاقے میں رہنے کی تصدیق ہوتی ہو، کافی ہے۔ ہم انھیں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی جانچ پڑتال کی کمیٹی کے پاس بھیجتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ درخواست گزار نے کاغذ پر ظاہر کیا کہ مذکورہ پلاٹ پر مکان بنا ہوا ہے، جبکہ دراصل وہاں دکان قائم ہوتی ہے۔ اس صورت میں زمین کا استعمال بھی بدل جاتا ہے اور رجسٹریشن کی فیس بھی۔

نالے کی تعمیر کے لیے لیول سروے کے دوران تنظیم کے کارکن اتھارٹی کے انجینئروں کی مدد کر رہے ہیں

"پلاٹ کی ذیلی تقسیم کے معاملے میں لیز کے واجبات دگنے ہو جاتے ہیں خواہ پلاٹ تجارتی ہو یا رہائشی۔ ایک ۴۰۰ گز کا پلاٹ ہے جو چار حصوں میں منقسم ہے۔ چار بھائی اس پلاٹ کے مالک ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم سے نقشہ تیار کرنے میں غلطی ہوئی۔ جب ہم نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی مکان ہے۔ اگر چار مکان الگ الگ ہوتے تو چاروں کا باورچی خانہ الگ الگ ہوتا اور بیچ کی دیوار کا نشان بھی ہوتا۔ ایسا نہیں تھا اس لیے ہم نے اسے ایک ہی مکان تسلیم کیا۔ اگر لوگ اسے تقسیم کرتے ہیں تو انھیں اس کی فیس ادا کرنی ہوگی۔

"حال ہی میں ہمارے سامنے ایسا ہی ایک معاملہ آیا۔ دو بھائیوں کو باپ کے مرنے کے بعد ایک

مکان ترکے میں ملا تھا۔ ہم نے موقعے کا معائنہ کیا۔ وہاں الگ الگ دو باورچی خانے تھے اور تقسیم کرنے والی دیوار بھی موجود تھی۔ بڑے مکانوں کے لیے دو سے ڈھائی لاکھ تک کی پیش کش موجود ہوتی ہے۔ انھوں نے ہم سے کہا کہ پرانے ریکارڈ میں مکان کو منقسم دکھائیں اور یہ ظاہر کر دیں کہ نقشہ بنانے میں غلطی ہوئی تھی اور مکان دراصل منقسم تھا۔ لیکن اگر غلطی ظاہر بھی کی جاتی تب بھی انھیں تقسیم شدہ پلاٹ کی فیس ادا کرنی پڑتی جو عام فیس سے دگنی ہوتی ہے۔ تین سو درخواست گزار ایسے ہیں جن کا اصرار ہے کہ انھیں اس کا فائدہ دیا جائے۔

"ایک بااثر شخص زبیر نام کا ہے۔ بہت سے گھرانوں پر اس کا دبدبہ ہے۔ ایک بہت بڑا قطعۂ زمین اس کی ملکیت ہے۔ اس زمین کے لیز کے واجبات کوئی دو لاکھ روپے ہوں گے لیکن اگر اسے چھوٹے پلاٹوں میں منقسم دکھایا جائے تو یہ واجبات ۲۵ ہزار روپے ہوں گے۔ زبیر نے ہمارے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ لیز کی رقم بینک میں نہیں بلکہ افسروں کے گھر جاتی ہے۔ زبیر اور اس کے آدمیوں نے کرنال بستی کے لوگوں کو گمراہ کر لیا جن میں سے ۹۰ فیصد ناخواندہ ہیں۔ اس نے بعض جعلی کاغذات دکھا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ لیز اصلی نہیں ہے۔ مسجد کے قاری نے بھی لیز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ غلط ہے۔"

لیز کے کام کا آغاز

لیز کا کام ایک سال کے لیے بند

جنوری ۱۹۹۲ میں تسنیم صدیقی کو سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر ان کی جگہ فیاض شیخ کو مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے لیز کے کام کو جاری رکھا۔ نومبر ۱۹۹۲ میں ان کی جگہ ناہید حیدر مقرر ہوئیں۔ انھوں نے ۱۱ ماہ کے لیے کام رکوا دیا۔ وہ سابقہ ڈی جی کے کام پر معترض تھیں۔ کام ستمبر اکتوبر ۱۹۹۳ میں دوبارہ شروع ہوا جب تسنیم صدیقی اس عہدے پر واپس آئے۔

اب تک ویلفیئر کالونی اور پیر بخاری کالونی کے باشندوں نے لیز کے کاغذات حاصل کیے ہیں۔ کرنال بستی اور کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے ممبروں نے نقشوں کی تیاری میں حصہ لیا لیکن لیز کے کاغذات حاصل نہیں کیے۔ محبوب شاہ کا دعویٰ ہے کہ یہ لوگ اردو بولنے والے ہیں اور ان سے ایم کیو ایم نے وعدہ کیا ہے کہ انھیں مفت میں لیز دی جائے گی۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے نمایاں کارکن وکیل صاحب کا کہنا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو لیز کی ضرورت نہیں کیونکہ انھوں نے زمین پر قبضہ نہیں کیا بلکہ حکومت نے انھیں ۱۹۴۷ میں یہ جگہ فراہم کی تھی اور ان کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات بھی موجود ہیں۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں وکیل صاحب کے مکان کے آس پاس کی دو چار گلیوں میں ایم کیو ایم کے کونسلر نے پانی اور نکاس کی لائنیں بھی ڈلوا دی ہیں۔ وکیل صاحب کا کہنا ہے کہ وہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی جاری کی ہوئی لیز کو نہیں مانتے اور اسے فراڈ سمجھتے ہیں۔

کرنال بستی کے لوگوں کی شمولیت

کرنال بستی کی مسجد کے قاری صاحب نے ۱۹۹۱ میں لوگوں کو گمراہ کر کے لیز کے کاغذات حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایم کیو ایم سے بات کر کے بستی کے باشندوں کو مفت لیز دلوا سکتے ہیں۔ لیز کے مسئلے پر محبوب شاہ کی نمائندگی کے باعث انھیں اپنی قائدانہ حیثیت کے لیے خطرہ محسوس ہوا۔ ۱۹۹۴ میں تسنیم صدیقی نے کرنال بستی میں ایک میٹنگ منعقد کی اور لوگوں کو مطلع کیا کہ ان کی دی ہوئی رقم ان کے علاقے میں ترقیاتی کاموں پر، خصوصاً نالے کی تعمیر پر، صرف کی جائے گی۔ انھوں نے زمین کی قیمت بڑھنے کی بھی وضاحت کی۔ بعد میں قاری صاحب اور ان کے گروپ کے لوگ تسنیم صدیقی سے آ کر ملے اور لیز حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مگر انھوں نے اس بات پر اعتراض کیا کہ لیز ویلفیئر کالونی کے نام سے جاری کی جا رہی ہے اور مطالبہ کیا کہ اس میں کرنال بستی کے نام کا اضافہ کیا جائے۔ اتھارٹی نے بریکٹ میں اس نام کا اضافہ کرنا منظور کیا۔ قاری صاحب نے اس بات پر بھی

اعتراض کیا کہ ویلفیئر کالونی تنظیم کے دفتر کو لیز کیمپ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ فیصلہ ہوا کہ اس علاقے کے لیے لیز ایک ساتھ اتھارٹی کے دفتر سے جاری کی جائیں گی۔ اس وقت کرنال بستی کو لیز کاغذات کی فراہمی کا کام جاری ہے۔

رفتہ رفتہ کرنال بستی کے باشندوں نے انفرادی طور پر ویلفیئر تنظیم کے دفتر آ کر لیز حاصل کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس میں زیادہ سہولت تھی۔ نالے کا جو حصہ ویلفیئر کالونی اور پیر بخاری کالونی کے علاقے میں واقع ہے اس پر ہونے والے ترقیاتی کام نے بھی کرنال بستی کے لوگوں کو لیز حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔

لیز کیمپ آبادی کے اندر واقع ہونے اور تنظیم کے تعاون کے باعث لوگ ایک ماہ سے تین ماہ تک کے عرصے میں لیز حاصل کر لیتے ہیں۔ انھیں مختلف دفتروں کے چکر نہیں لگانے پڑتے۔ لوگ ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک کی اضافی رقم دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں جو ان کے کہنے کے مطابق رجسٹرار کے عملے کو دی جانے والی رشوت ہے، کیونکہ اس طرح ان کو ایک دن کی بھی مزدوری ضائع نہیں کرنی پڑتی۔ چونکہ ان میں سے بیشتر لوگ دیہاڑی پر مزدوری کرتے ہیں اس لیے یہ بات ان کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی اب تک (مارچ ۱۹۹۵ تک) ۲،۱۲۱،۰۰۶ روپے کی رقم لیز کے واجبات کی مد میں وصول کر چکی ہے۔ تنظیم کے ارکان رات گئے تک مصروف رہتے ہیں۔ محبوب شاہ اور دوسرے کارکنوں کو دیر تک فائلوں کی فہرستیں تیار کرتے اور جمع کرائے گئے چالانوں کی جانچ کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ تمام ریکارڈ احتیاط سے رکھا جاتا ہے۔ اتھارٹی تنظیم کے دفتر کو کسی معاوضے کے بغیر استعمال کر رہی ہے۔ لیز ضروری ہے کیونکہ، جیسا کہ محبوب شاہ کا کہنا ہے، "اس سے بے دخلی اور مکانوں کے مسمار کیے جانے کا خطرہ ختم ہو جاتا ہے۔"

اتھارٹی کے انجینئر نالے کی تعمیر کا کام شروع ہونے سے پہلے ڈیزائن کی وضاحت کرتے ہوئے

ڈیزائن کی نقلیں کارکنوں کو دی گئیں اور تفصیلات کی وضاحت کی گئی

جنوری ۱۹۹۵ میں کرنال بستی کے ایک باشندے کی شکایت پر کہ لیز کیمپ کا انچارج ممتاز رشوت وصول کر رہا ہے، اتھارٹی نے اسے کیمپ سے ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے شخص کو مقرر کر دیا، حالانکہ پیر بخاری اور ویلفیئر کالونی کے لوگ چاہتے تھے کہ اسے نہ ہٹایا جائے۔ اتھارٹی کی نئی پالیسی کے تحت اس کے اہلکاروں کو گھر گھر جا کر مکان کے مالک سے براہ راست رابطہ قائم کرنا ہوتا تھا، یعنی اس رابطے میں تنظیم کا دخل نہ ہوتا تھا۔ اتھارٹی بدعنوانی کا سدباب کرنا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس کے سینئر افسران (مثلاً ڈائرکٹر جنرل یا ڈائرکٹر کو آرڈی نیشن) براہ راست اس عمل میں شامل ہوں تو بدعنوانی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔

اتھارٹی کے اس اقدام سے تنظیم کے اعتبار پر برا اثر پڑا۔ ایسے افراد، مثلاً گل زرین خان اور اس کا بھائی، جو بدلہ لینے کی تاک میں تھے، متحرک ہو گئے۔ وہ اس علاقے میں نہیں رہتے لیکن یہاں رہنے والے بعض لوگوں کے ضامن کے طور پر

نالے کی تعمیر کا آغاز

جزوی طور پر مسمار کر کے نالے کی تعمیر کے لیے گنجائش پیدا کی گئی، مقامی تنظیموں نے دو دن کے اندر نمٹا لیا۔ سات دکانوں اور ایک مکان کے مالکوں کو اس انہدام کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا کیونکہ سروے اور ڈیزائن کی تیاری کا کام فروری ۱۹۹۴ کے آس پاس مکمل ہو چکا تھا۔ محبوب شاہ، ناصر بخاری اور ویلفیئر کالونی تنظیم کے ارکان نے مالکوں کو اس بات کی اطلاع دے رکھی تھی کہ دکانوں کا جو حصہ نالے کے اوپر دو سے تین فٹ تک، اور مکانوں کا جو حصہ ۸ فٹ تک آگے نکلا ہوا ہے اس کو مسمار کرنا ضروری ہو گا۔ مالکوں نے تعاون کا یقین دلایا تھا کیونکہ وہ اسے جائز، ضروری اور آبادی کے لیے مفید سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ یہ بات ان سے اتھارٹی یعنی ایک سرکاری محکمے کے لوگ نہیں بلکہ محبوب شاہ اور دوسرے کارکن کہہ رہے تھے جن کے لیے ان کے دل میں احترام اور اعتماد تھا۔ چنانچہ مزاحمت کا کوئی سوال نہ تھا۔ صرف اتنی درخواست کی گئی کہ اتھارٹی سے اس انہدام کے لیے معاوضے کا مطالبہ کیا جائے۔

جب مئی ۱۹۹۵ میں نالے کی تعمیر کا کام شروع ہوا تو اتھارٹی نے محبوب شاہ سے ان تجاوزات کو ہٹوانے کی درخواست کی۔ محبوب شاہ کا کہنا ہے، "دکانوں اور

تجاوزات کا انہدام جو لوگوں نے خود کیا
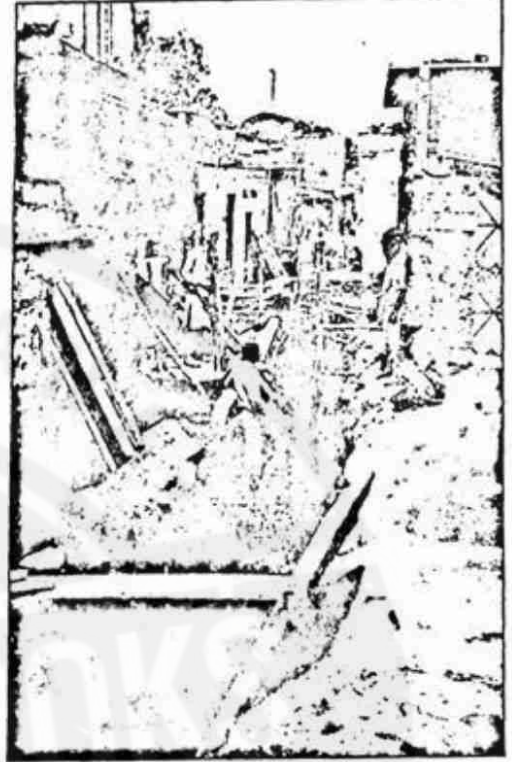
سامنے آئے اور دعویٰ کرنے لگے کہ وہ صرف ۲۰۰ روپے فی فائل سروس چارج لے کر اور اتھارٹی کے کم نرخ پر لیز دلوا سکتے ہیں۔ ویلفیئر کالونی، پیر بخاری اور کرنال بستی کی تنظیموں کے ارکان نے اپنا انداز دھیما رکھا۔ ان کے پاس ۲۰۰ فائلیں بالکل تیار تھیں لیکن وہ بہتر وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس علاقے کے باشندے اتھارٹی کے اہلکاروں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔

اتھارٹی کے نچلے درجے کے اہلکاروں کے ذہن میں بھی لوگوں کے بارے میں شکوک و شبہات کا تسلط ہے۔ اتھارٹی کا یہ اچانک فیصلہ، جس کے باعث لیز حاصل کرنے کا کام دشوار ہو گیا، لوگوں کو غیر ضروری معلوم ہوا اور لیز کے واجبات کی وصولی کا کام رک گیا۔ لوگوں کی تنظیموں کو مضبوط بنانے کے بجائے اس اقدام نے تنازعات کو جنم دیا۔ دو ماہ کے بعد اتھارٹی نے تنظیم کے ذریعے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کا طریقہ دوبارہ اختیار کر لیا۔

تجاوزات کا خاتمہ

نالے کے اوپر قائم تجاوزات کو ہٹانے کا معاملہ، جہاں سات دکانوں اور ایک مکان کو

مکان کے مالکوں سے بات چیت کرنے میں ہمیں صرف دو دن لگے۔ پہلے دن میں چند فعال کارکنوں کے ساتھ شام کے وقت ان کے پاس گیا اور ان سے انہدام کے بارے میں بات کی اور دریافت کیا کہ آیا یہ کام وہ خود کرنا چاہتے ہیں یا اتھارٹی کے ٹھیکے دار سے کرانا چاہتے ہیں۔ اگلے دن انھوں نے ہمیں اطلاع دی کہ یہ کام وہ خود کرلیں گے۔" مالکوں کو اندازہ تھا کہ اگر یہ کام ٹھیکے دار کے سپرد کیا گیا تو زیادہ نقصان ہوگا۔ تیسرے دن مالکوں نے زائد حصے منہدم کرکے نالے کی تعمیر کے لیے راستہ صاف کردیا۔

ایک اور مکان جو آدھا نالے کے اوپر بنا ہوا تھا، اس کے سلسلے میں بھی یہی پرامن طریقہ اختیار کیا گیا۔ یہ مکان ایک بیوہ کی ملکیت ہے۔ محبوب شاہ نے اس کو کسی حد تک معاوضہ ملنے کا یقین دلایا ہے۔ "دیکھتے ہیں کیا کرسکتے ہیں اس کے لیے۔" محبوب شاہ کا خیال ہے کہ اس بیوہ عورت کی مدد کرنا تنظیم کی ذمہ داری ہے۔

محبوب شاہ کام کی نگرانی کرتے ہوئے: اتھارٹی کے انجینئر کو نقائص دکھائے جارہے ہیں

امن وامان

ایسے واقعات اکثر پیش آتے ہیں کہ پولیس نے لوگوں کو پکڑ لیا یا انھیں ہراساں کیا۔ تنظیم کے ارکان ایسی صورت میں پولیس سے بات چیت کرکے ان لوگوں کو چھڑاتے ہیں۔ بیشتر تھانوں میں ایسے سپاہی موجود ہیں جن سے تنظیم کے ارکان کی ذاتی دوستیاں، رشتہ داریاں یا تعلقات ہیں۔ اگر پولیس کو رشوت دینے کے لیے رقم کی ضرورت پڑے تو تنظیم کے ارکان آپس میں چندہ کرلیتے ہیں، اور اگر یہ رقم بہت زیادہ ہو تو فروٹ منڈی سے عطیات وصول کرتے ہیں۔

۱۹۸٦ میں ہونے والے مہاجر پٹھان فسادات کے دوران محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں نے کسٹوڈین کمپاؤنڈ اور کرنال بستی میں رہنے والی مہاجر آبادی کو تحفظ فراہم کیا۔ انھوں نے رات دن پہرا دینے کے لیے گروپ بنائے۔ علاقے سے باہر رہنے والے پٹھانوں کو علاقے میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ دوسری طرف کرنال بستی اور کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے کارکنوں نے پٹھانوں کو تحفظ دیا، جبکہ پٹھان اور مہاجر سیاست دان ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔

منشیات فروش

منشیات کے تاجروں کو علاقے میں داخل ہونے اور منشیات کے عادی افراد کو علاقے کی خالی جگہیں استعمال کرنے سے روکنے کے لیے تنظیم کے ارکان نے چوکیداری کی۔ ۱۹۸٦ میں ایک خالی پلاٹ کو (جہاں اب ایدھی بلڈ بینک اور اسکول قائم ہے) سرجانی ٹاؤن کے ایک منشیات فروش گل زریں خان اور اس کے گروپ کے قبضے کا خطرہ لاحق تھا۔ منشیات کی لت کے شکار لوگ اس پلاٹ کو اپنی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنے لگے تھے۔ محبوب شاہ کی تنظیم نے پولیس اور ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی لیکن کوئی کارروائی نہ ہوئی۔ آخر تنظیم نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محبوب شاہ کا کہنا ہے، "ہم نے اپنی بندوقیں نکالیں اور ان کا تعاقب شروع کردیا۔" سبزی منڈی کے مزدوروں، پھلوں کے تاجروں اور علاقے کے باشندوں کی عملی حمایت کے ساتھ وہ علاقے کو منشیات فروشوں اور نشے کے عادی افراد سے پاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے کوشش کرکے ایدھی ٹرسٹ کو یہ پلاٹ استعمال کرنے پر آمادہ کرلیا۔ محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ پٹھان ہونے کے ناتے یہ ان کی عزت کا معاملہ تھا۔ "ایک بار جب ہم نے منشیات بیچنے اور خریدنے والوں کو علاقے سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا تو پھر اپنی جان دے کر بھی ہمیں اس فیصلے پر عمل کرنا تھا۔

سوئی گیس

محبوب شاہ اب بھی پہلے کی طرح مصروف ہیں۔ اس بار ان کی مصروفیت کا باعث سوئی گیس کے کنکشن کی درخواستیں ہیں۔ ۱۹۹۲ میں جب کالونی کا نقشہ تیار کیا گیا تو تنظیم نے نقشے کے ساتھ سوئی گیس کی فراہمی کی درخواست بھی متعلقہ حکام کے پاس جمع کرادی تھی۔ رفتہ رفتہ سوئی گیس ٹرانسمیشن کمپنی نے علاقے میں گیس کی لائنیں بچھادیں۔ اس کے لیے کمپنی نے نرخ متعین کردیے ہیں۔ ۲۰ فٹ کے پائپ

اور گیس کے استعمال کے لیے تین پوائنٹ نصب کرانے کے لیے فی گھر ۵۷۷ روپے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ کنکشن لگانے کے لیے سردیٹر اور مزدوروں کا انتظام کرنے کے سلسلے میں محبوب شاہ مدد کرتے ہیں۔

تعلیم اور صحت

تنظیم نے سرکاری محکموں اور مخیّر افراد سے رابطے کے لیے کوششیں شروع کر رکھی ہیں تاکہ علاقے میں ایک اسکول اور ایک ہسپتال قائم کیا جاسکے۔

اس کے علاوہ علاقے میں کسی کی وفات ہو جائے تو تنظیم تجہیز و تکفین کے عمل میں پسماندگان کی مدد کرتی ہے۔ اگر مرنے والے کا خاندان غریب ہو تو کفن دفن کا خرچ بھی تنظیم برداشت کرتی ہے۔ فطرہ اور زکوٰۃ بھی جمع کر کے مستحقین کو پہنچائی جاتی ہے اور وصول اور تقسیم ہونے والی رقم کا مکمل حساب رکھا جاتا ہے۔

مستقبل کے منصوبے

علاقے میں پانی کی قلت کا مسئلہ اب بھی موجود ہے۔ اس کو حل کرنے کے لیے ایک

نالہ تعمیر سے پہلے

نالہ تعمیر کے بعد

باقاعدہ ڈسٹری بیوشن لائن کی ضرورت ہے۔ محبوب شاہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں، "اگر سندھ کچی آبادی اتھارٹی ہمیں تخمینہ تیار کر کے دے دے تو ہم فاضل رقم بھی ادا کرنے کو تیار ہیں۔ ہم گھر گھر جا کر رقم جمع کر لیں گے۔ ہمیں سر شاہ محمد سلیمان روڈ کے ساتھ گزرنے والی ۱۲ انچ قطر کی لائن سے یا یونیورسٹی روڈ سے گزرنے والی ۱۸ انچ قطر کی لائن سے صرف ۲ یا ۳ انچ کا کنکشن درکار ہے۔ گلیوں میں پانی کی تقسیم کے لیے لائن ہمارے علاقے میں موجود ہے۔"

مستقبل میں محبوب شاہ کا منصوبہ ہے کہ او پی پی کے نکاس کے پروگرام کی طرز پر ایک پروگرام متعارف کرایا جائے جس کے تحت لوگ پہلے سے موجود نکاس کی لائنوں کی مرمت اور درستی کا کام کر سکیں۔ اس کے علاوہ تعلیم اور صحت کے مسائل بھی ان کے منصوبوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔ علاقے میں ایک ایدھی اسکول قائم ہے لیکن یہ ناکافی ہے۔ وہ محکمۂ تعلیم کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک پلاٹ پر جو علاقے میں موجود ہے ایک اسکول قائم کیا جائے۔ یہاں دو پرائیویٹ اسکول بھی موجود ہیں۔

محبوب شاہ نے کراچی کی حدود کے باہر زیرِ تعمیر نئی سبزی منڈی کے قریب

واقع گوٹھ پیر بخش میں ایک ہاؤسنگ اسکیم قائم کرنے کا بھی منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت ۱۰۰ سے ۱۲۰ مربع گز تک کے ۱۶۳ رہائشی پلاٹ تیار کیے جائیں گے۔ زمین کا بندوبست گوٹھ کے باشندوں کی مدد سے کیا جا چکا ہے۔ یہ اسکیم ان بے ٹھکانا مزدوروں کے لیے ہے جو فی الحال پرانی سبزی منڈی میں کام کرتے اور وہیں دکانوں اور گوداموں کی چھتوں پر سوتے ہیں۔ ہر پلاٹ کی قیمت اوسطاً دس ہزار روپے ہے۔ محبوب شاہ پہلی قسط کے طور پر دو ہزار روپے وصول کرتے ہیں۔ باقی رقم آسان قسطوں میں واجب الادا ہوتی ہے۔ تنظیم ان مزدوروں کے لیے ۱۹۹۰ سے فکر مند ہے جب سبزی منڈی میں چھتوں پر آگ لگ گئی تھی جس کا سبب ہیروئن کے عادی افراد کو پناہ دینا بتایا جاتا ہے۔ محبوب شاہ کو یقین ہے کہ آگ منشیات فروشوں نے اپنے کاروبار میں اضافے کی غرض سے لگوائی تھی۔ محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں کی کوششیں مشکلات کے باوجود جاری ہیں۔

بیرونی مداخلت

بلدیاتی ادارے

لوگوں کا کہنا ہے کہ بلدیاتی کونسلر صرف ووٹ مانگنے ان کے پاس آتے ہیں اور اس کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی لوگ ان کے پاس پانی کی قلت یا کوئی اور مسئلہ لے کر جاتے ہیں وہ فنڈز کی کمی کی وجہ بتا کر اسے حل کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کونسلر اقبال نے علاقے کے باشندوں سے پانی کی مین لائن بچھوانے کے لیے ۷۰ ہزار روپے وصول کیے اور یہ لائن کچھ ہی دنوں میں خشک ہو گئی۔

۱۹۸۸ میں ایم کیو ایم کے کونسلر نے چند مین ہول تبدیل کرائے اور نکاس کی دو لائنیں ڈلوائیں۔ پانی کی ایک لائن دولت رام روڈ کے ایک ایم کیو ایم کونسلر نے بچھوائی لیکن بعد میں لوگوں کو ۷۰۰ روپے فی گھر کے حساب سے ۷۰ ہزار روپے جمع کر کے کونسلر کو ادا کرنے پڑے۔

صوبائی حکومت

صوبائی حکومت کے مختلف محکموں میں سے صرف سندھ کچی آبادی اتھارٹی ہی واحد محکمہ ہے جو علاقے میں کوئی کردار ادا کر رہا ہے۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ یہ کردار ادا کر سکے مقامی تنظیم کو بعض بنیادی نوعیت کے کام کرنے پڑے، مثلاً سروے کے نقشوں کی تیاری، علاقے کے باشندوں کو منظم کرنا، فائلیں بنانا اور اس طرح کے دوسرے کام۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی صوبائی حکومت کی بلدیات اور دیہی ترقی کی وزارت کے تحت ایک ادارہ ہے جس کا چیئرمین کچی آبادیوں کا وزیر ہوتا ہے۔ اسے ۷ اپریل ۱۹۸۶ کو نافذ ہونے والے ایک ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا تھا تاکہ وہ مارچ ۱۹۸۶ میں اس وقت کے وزیراعظم کے کیے ہوئے اس اعلان پر عمل درآمد کی نگرانی کر سکے جس کی رو سے ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ سے پہلے سے موجود تمام کچی بستیوں کو قانونی طور پر مستقل کیا جانا تھا۔ اتھارٹی کو ایشیائی ترقیاتی بینک سے ملنے والا ۲۵۰ ملین روپے کا گردشی سرمایہ دیا گیا تھا۔

اتھارٹی کا بنیادی کاموں میں سندھ کچی آبادی آرڈیننس کے تحت مختلف کچی آبادیوں کو تسلیم کرنے کے نوٹیفکیشن جاری کرنا، سرکاری پالیسی کے تحت کچی آبادیوں کو مستقل کرنا یا اس میں اعانت کرنا، کچی آبادیوں کی حالت براہ راست یا بلدیاتی اداروں کی مدد سے بہتر بنانا اور رفتہ رفتہ ادارے کے طور پر خود انحصاری حاصل کرنا ہے۔

اتھارٹی کو درپیش رکاوٹیں: اتھارٹی کو اپنے پروگراموں کو روبہ عمل لانے کے سلسلے میں اندرونی طور پر بہت سی دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ اس کی بڑی وجہ پہلے سے مروج طرز عمل ہے جس کا بدلنا بہت دشوار ثابت ہوتا ہے۔ کچی آبادی کے باشندوں کے کہنے کے مطابق ڈائرکٹر جنرل، دو ڈپٹی ڈائرکٹر جنرلز اور چند ایماندار اہلکاروں کو چھوڑ کر تمام دیگر عملہ ماضی میں بدعنوانیوں میں ملوث رہ چکا ہے۔ کام کی ماہانہ نگرانی اور علاقے کے باشندوں کے ڈی جی اور ڈپٹی ڈی جی تک براہ راست رسائی کے باوجود بدعنوانی کو پوری طرح ختم نہیں کیا جا سکا ہے۔

اتھارٹی کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل جاوید سلطان کہتے ہیں کہ سروے اور نقشوں کی تیاری اتھارٹی کے کام کا سب سے اہم مرحلہ ہے اور بدعنوانی کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ نقشوں میں جہاں پلاٹ کا رقبہ، طول و عرض اور محل وقوع دکھایا جاتا ہے، ہمیشہ "غلطیاں" رہ جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر طول و عرض میں فرق ہوتا ہے یا تعمیر شدہ پلاٹوں کو خالی پلاٹ ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ جب موقعے پر ان غلطیوں کا پتا چلتا ہے تو اتھارٹی کے اہلکار اس کی ذمہ داری کنسلٹنٹ پر ڈال دیتے ہیں اور یوں ان معاملات کا تصفیہ ملتوی ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ ڈی جی کے آنے سے پہلے ان معاملات کا تصفیہ رشوت لے کر کیا جاتا تھا۔

سندھ کچی آبادی اتھارٹی

۱۹۸۶ میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے قیام سے لے کر اب تک اس کی کارکردگی کا انحصار ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہونے والے چھ مختلف افراد کے ایجنڈا اور ترجیحات پر رہا ہے:

۱۹۸۶ تا ۱۹۹۱: ٹی اے جعفری
ان کا خیال تھا کہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کا کام آبادیوں کی ریگولرائزیشن کے نوٹیفکیشن جاری کرنا اور لیز کی رقم ترقیاتی کاموں کے لیے بلدیاتی اداروں کے حوالے کرنا ہے۔ ان کے دور میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے براہ راست لیز یا ترقیاتی کام سے متعلق کوئی کام نہیں کیا۔

جون ۱۹۹۱ تا جنوری ۱۹۹۲: تسنیم صدیقی
انھوں نے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کو اس طرح منظم کیا کہ وہ ان کاموں کو سرانجام دے سکے جو اس کے قیام کی دستاویز میں درج ہیں۔ تاہم آٹھ مہینے کے عرصے میں ایک وزیر نے ان کا تبادلہ کر دیا۔ سندھ کے دونوں بڑے شہروں کراچی اور حیدر آباد کے بلدیاتی اداروں پر اس وقت جس سیاسی جماعت (ایم کیو ایم) کا کنٹرول تھا وہ چاہتی تھی کہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی صرف آبادیوں کی ریگولرائزیشن کے نوٹیفکیشن جاری کرے اور ترقیاتی کاموں کے فنڈ بلدیاتی اداروں کے حوالے کر دے اور لیز یا ترقیاتی کام خود نہ کرے۔

فروری ۱۹۹۲ تا اکتوبر ۱۹۹۲: فیاض شیخ
انھوں نے لیز دینے کا کام جاری رکھا لیکن ان پر اور ان کے عملے پر غلط طریقے اختیار کرنے کے الزامات لگائے گئے۔ ان پر لیز اور نوٹیفکیشن جاری کرنے کے لیے رشوت لینے، اپنے رشتے داروں کے لیے پلاٹ حاصل کرنے اور وزرا، مشیروں اور دوسرے سیاست دانوں کو پلاٹ دینے کے الزامات عائد کیے گئے۔ تسنیم صدیقی کے دور میں لیز کے ذریعے جو رقم جمع کی گئی تھی اسے گاڑیوں کی خریداری اور دوسرے غیر ترقیاتی اخراجات کے لیے استعمال کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۹۲ تا مئی ۱۹۹۳: ناہید حیدر
یہ اپنی دیانت داری کے لیے معروف تھیں اور ان کو سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے حالات دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی۔ انھوں نے سارا کام رکوا دیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ انھیں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے کردار کو سمجھنے کے لیے وقت درکار ہے۔ وزیر اعلیٰ کے کچی آبادیوں کے مشیر ان کو مستقل تنگ کرتے رہے کہ وہ انھیں، ان کے رشتے داروں اور ساتھی سیاست دانوں کو پلاٹ فراہم کریں اور غیر قانونی نوٹیفکیشن جاری کریں۔ ناہید حیدر یہ کام نہیں کرنا چاہتی تھیں اس لیے انھوں نے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے تبادلہ کرا لینے کو ترجیح دی۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی کا عملہ اور لینڈ مافیا بھی ان پر متواتر دباؤ ڈالتا رہا کہ پچھلے طریقوں کو جاری رکھا جائے۔

مئی ۱۹۹۳ تا جون ۱۹۹۳: آفتاب شیخ
ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ تمام کچی آبادیوں کو بل ڈوز کر دینا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے اس عہدے سے تبادلے کی کوششوں کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔

جون ۱۹۹۳ تا حال: تسنیم صدیقی
ان کے دوبارہ ڈائرکٹر جنرل بننے پر سندھ کچی آبادی اتھارٹی دوبارہ فعال ہوئی۔ لیز اور ترقیاتی کام پھر سے شروع ہوا۔ او پی پی کے ترقیاتی کام کے ماڈل کو سندھ کچی آبادی اتھارٹی کی پالیسی میں شامل کر لیا گیا۔ نئے ضوابط کار مرتب کیے گئے اور گزٹ نوٹیفکیشن جاری کر کے انھیں سرکاری پالیسی کا درجہ دیا گیا۔ لیز چارجز سے جمع ہونے والی رقم کو آبادیوں میں پانی کی فراہمی اور نکاس کے بیرونی نظام کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈائرکٹر جنرل ماہانہ میٹنگوں میں کام کی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہیں اور مسائل کی نشان دہی کر کے ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ کام کر کے سیکھنے کا طرز عمل اختیار کیا گیا ہے۔

جاوید سلطان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب اتھارٹی لیز کے عمل کو آسان بنانے کی بات کرتی ہے تو لوگ اس پر اعتبار نہیں کرتے۔ وہ اتھارٹی کے ساتھ اپنے مقامی کارکن، یا بعض صورتوں میں دلالوں کے توسط سے ہی رابطہ قائم کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کو اس کام کا معاوضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ دلال یا سیاسی نمائندے اتھارٹی کے فیلڈ کے عملے کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ اس طرح اتھارٹی کے لوگوں کے ساتھ براہ راست معاملہ کرنے اور اچھے سماجی کارکنوں کو تلاش کرنے میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس رابطے میں رکاوٹ کے باعث علاقے کے باشندوں تک معلومات کی رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

ترقیاتی کام کے سلسلے میں پرانے طریق کار اور انجینئروں کے رویے تبدیل ہونے میں بہت وقت لیتے ہیں۔ان طریقوں میں تمام کام ٹھیکے دار کو سونپ دینا، لاگت کا تخمینہ بڑھاچڑھا کر تیار کرنے کے لیے کام کے مطلوبہ معیار کو اونچار کھنا، سروے، ڈیزائن اور نگرانی کے عمل پر توجہ نہ دینا، اور لوگوں کو ناخواندہ اور تکنیکی معاملات سمجھنے کی صلاحیت سے عاری گردان کر ان سے براہ راست رابطہ قائم کرنے سے گریز شامل ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل اور ان کے نائبین کو ان رکاوٹوں کا احساس ہے اور وہ ان پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن یہ ایک وقت طلب عمل ہے۔ایک علاقے میں اتھارٹی نے سروے اور نقشہ تیار کرنے کا کام خود انجام دیا، لیکن ابھی اس کے نتائج آنا باقی ہے۔ترقیاتی کام میں ٹھیکے دار کو کام سونپنے کے بجائے علاقے کے باشندوں کی شمولیت سے محکمہ جاتی بندوبست کے طریقے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تاہم اس طریقے کو اتھارٹی کے انجینئروں کی جانب سے مزاحمت کا سامنا ہے۔

ویلفیئر کالونی میں لوگوں اور اتھارٹی کے باہمی رشتے میں کئی رکاوٹوں کا مشاہدہ کیا گیا۔ مثلاً اتھارٹی کے سربراہ کے بار بار بدلنے سے محکمے کا ایجنڈا بھی متواتر بدلتا رہا ہے۔اس کے باعث کالونی میں ایک سال تک کام رکا رہا۔اس کے علاوہ ایک سرکاری محکمہ ہونے کے باعث اتھارٹی کو لوگوں سے معاملہ کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ایک جانب سرکاری محکموں کے پرانے طور طریقے ہیں جن میں عام لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔دوسری جانب لوگوں کے ذہن میں سرکاری محکموں کا تاثر یہ ہے کہ وہ بدعنوان اور بے حس ہوتے ہیں۔ان وجوہات سے اتھارٹی کے لیے دشوار ہے کہ وہ سماجی کارکنوں، دلالوں، سیاسی کارکنوں اور عوامی تنظیموں کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔اس مشکل کے باعث ویلفیئر کالونی میں لیز جاری کرنے کا کام دو ماہ تک رکا رہا۔اتھارٹی کو محبوب شاہ اور حمید کی تنظیموں کے بارے میں شبہات تھے چنانچہ وہ علاقے کے باشندوں سے براہ راست رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ لوگ ایک سرکاری محکمے سے براہ راست معاملہ کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔وہ اتھارٹی کو ایک عام سرکاری محکمہ سمجھتے ہیں اور اس سے معاملہ کرنے میں دلالوں اور کارکنوں کی مدد لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔اگرچہ لوگوں کو دعوت دی گئی کہ وہ اپنی تجاویز یا شکایات براہ راست ڈی.جی یا ڈپٹی ڈی.جی تک پہنچائیں، اور لوگوں کو ان تک رسائی بھی حاصل ہے، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ان اونچے افسروں کا کبھی بھی تبادلہ ہو سکتا ہے جبکہ فیلڈ کا عملہ مستقل ہے، اس لیے وہ فیلڈ کے عملے سے اچھے تعلقات رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

سیاست دانوں کا کردار

ویلفیئر کالونی کی ترقی میں صرف ایک سیاست دان عرفان اللہ مروت نے مثبت کردار ادا کیا۔انھوں نے اس علاقے کو کچی آبادی قرار دیے جانے کا نوٹیفکیشن نکلوانے میں لوگوں کی مدد کی۔مروت پٹھان ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے لیے اس علاقے کے پٹھان باشندوں کی حمایت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔دوسری جانب رکن قومی اسمبلی حافظ تقی کا کردار منفی رہا ہے۔ان کی کوشش رہی کہ اس قیمتی زمین پر آباد لوگوں کو یہاں سے بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیں۔

این.جی.اوز کی مداخلت

اوپی پی آر ٹی آئی اور ایدھی ٹرسٹ ہی دو ایسی غیر سرکاری تنظیمیں ہیں جو اس علاقے میں کام کر رہی ہیں۔یہاں کسی غیر ملکی امدادی ادارے نے کسی کام میں حصہ نہیں لیا۔

تحفظ ماحول کی انجمن: اوپی پی آر ٹی آئی کے یہاں فعال ہونے سے پہلے ایک مقامی این.جی.او ایسوسی ایشن فار پروٹیکشن آف انوائرنمنٹ کو سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے دعوت دی تھی کہ وہ علاقے کے ترقیاتی کام میں اس کی مدد کرے۔اس انجمن کے ایک نمائندے نے اتھارٹی کے سربراہ سے ملاقات کر کے کچی آبادیوں میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔انجمن نے علاقے کا بیس لائن سروے کیا اور یہاں کے کارکنوں سے بات چیت کی۔۱۸ ماہ کام کرنے کے بعد انجمن نے یہاں اپنا کام جاری رکھنے سے معذرت کر لی۔یہاں کے باشندے نالے کی تعمیر کا مطالبہ کر رہے تھے اور انجمن اس کے لیے درکار اہلیت نہیں رکھتی تھی۔علاوہ ازیں اسے سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانے کے بندوبست سے دلچسپی تھی اور اس سلسلے میں اسے باشندوں کی طرف سے مثبت ردعمل نہیں ملا تھا۔

اوپی پی آر ٹی آئی: جب لیز جاری کرنے کا کام شروع ہوا تو محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں نے نالے کی تعمیر کے لیے سندھ کچی آبادی اتھارٹی سے رابطہ قائم کیا۔جنوری ۱۹۹۴ میں اتھارٹی کے توسط سے اوپی پی آر ٹی آئی کو ویلفیئر کالونی میں نکاس کے نظام کی تعمیر کے سلسلے میں لوگوں کے کیے ہوئے کام کا پتا چلا۔اوپی پی آر ٹی آئی نے محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں کی مدد سے اس کام کی دستاویز سازی کی اور ان پر اس عمل کی اہمیت واضح کی۔ محبوب شاہ اور ناصر برکی نے دستاویز سازی کے اس کام میں اوپی پی آر ٹی آئی کے نمائندوں کی مدد کرنے اور کارآمد اور بند لائنوں کی نشان دہی کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اوپی پی کے ادا کردہ

کردار، سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے کام اور اس سروے کی ضرورت کے بارے میں علاقے کے باشندوں سے بات چیت کی گئی۔ محبوب شاہ اور ناصر برکی کے انٹرویو ریکارڈ کیے گئے۔ نالے سے متعلق مسائل اور ان کے ممکنہ حل کے بارے میں باشندوں اور کارکنوں کے ساتھ غیر رسمی گفتگو کی گئی۔ تمام کام کی نقشوں کی شکل میں دستاویز سازی میں ایک ہفتے کا وقت لگا۔ انٹرویو اور غیر رسمی بات چیت کا سلسلہ مہینے بھر جاری رہا۔

اس تمام عمل سے یہ ظاہر ہوا کہ نکاس کے "بیرونی" نظام کے طور پر نالے کی تعمیر ایک فوری ضرورت ہے۔ او پی پی نے اتھارٹی کے ڈی جی سے درخواست کی کہ علاقے سے جمع کی جانے والی لیز کی رقم کو نالے کے ترقیاتی کام کے لیے استعمال کیا جائے۔ ڈی جی نے اس پر رضامندی ظاہر کی اور او پی پی آر ٹی آئی سے درخواست کی کہ وہ نالے کا ڈیزائن تیار کرنے میں مدد کرے۔ چنانچہ موقعے کے کئی دورے کیے گئے اور محبوب شاہ اور تنظیم کے دوسرے ارکان سے بات چیت کی گئی۔

او پی پی نے اتھارٹی کے انجینئروں کی رہنمائی کی۔ باشندوں سے بات چیت کر کے کنکریٹ کے ڈھکے ہوئے نالے کا ایک بنیادی خاکہ تیار کر کے انجینئروں کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ اس کی بنیاد پر تفصیلی ڈیزائن اور لاگت کا تخمینہ تیار کریں۔ انجینئروں کے تیار کردہ ڈیزائن کو او پی پی نے سادہ کر کے بنایا اور اس میں دی گئی تکنیکی تفصیلات کو اردو میں ترجمہ کیا تاکہ علاقے کے باشندے ان کو سمجھ سکیں۔ ان نقشوں اور تفصیلات کی نقلیں کارکنوں کے حوالے کی گئیں۔

اتھارٹی کے انجینئروں کو مشورہ دیا گیا کہ اپنا تیار کردہ ڈیزائن علاقے کے باشندوں کو سمجھائیں۔ مارچ ۱۹۹۴ میں کالونی میں ہونے والی ایک میٹنگ میں اتھارٹی کے انجینئروں کی کارکنوں سے ملاقات ہوئی جس میں انھوں نے ڈیزائن کی تفصیلات واضح کیں اور بتایا کہ تعمیراتی کام کے دوران کس کس چیز کی نگرانی کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے ٹھیکے دار اور سب انجینئر کا لوگوں سے تعارف کرایا اور اتھارٹی کی جانب سے نگرانی کے بندوبست کی وضاحت کی۔ او پی پی ٹیم کے ارکان نے اس بات پر زور دیا کہ علاقے کے باشندوں کو تعمیراتی کام کے معیار کی سخت نگرانی کرنی ہوگی۔ کام کے گھٹیا معیار کی صورت میں ان سے اتھارٹی یا او پی پی کو مطلع کرنے کو کہا گیا۔ کارکنوں نے کام کے مختلف مرحلوں کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری لی۔

علاقے کے کارکنوں کے ساتھ او پی پی آر ٹی آئی کی میٹنگ جس میں صحت، تعلیم اور چھوٹے کاروباری قرضوں کے پروگراموں پر تبادلۂ خیال کیا گیا

او پی پی کے ایک ممبر کو بھی کام کی نگرانی سونپی گئی۔ کام کے معیار کی نگرانی کے ساتھ ساتھ او پی پی کو امید تھی کہ نگرانی کا یہ عمل مقامی کارکنوں کی تربیت اور علاقے کے باشندوں کے ساتھ ان کے رشتوں کی مضبوطی کا سبب بنے گا اور اس کے نتیجے میں آگے چل کر گلی کے اندر نکاس کے نظام کی تعمیر اور صحت کے پروگراموں پر بھی عمل کیا جا سکے گا۔

بعد میں جب اتھارٹی کا انجینئر موقعے سے مستقل غیر حاضر رہنے لگا تو او پی پی کے اصرار پر ایک مقامی کاریگر کو کل وقتی نگرانی کے کام پر مقرر کیا گیا۔

اتھارٹی کے ویلفیئر کالونی میں کیے ہوئے کام سے واضح ہو گیا کہ ٹھیکے دار کے ذریعے کام کرانے میں کیا نقصانات ہیں۔ او پی پی کا نگرانی کا کام پھیل کر کل وقتی نگرانی میں تبدیل ہو گیا تاکہ انجینئر اور ٹھیکے دار کے گٹھ جوڑ سے ہونے والے گھٹیا کام پر قابو پایا جا سکے۔ بحث مباحثہ بہت بڑھ گیا اور اتھارٹی اور او پی پی کے ارکان کو بار بار مشترکہ معائنے کے لیے جانا پڑا تاکہ اتھارٹی کے انجینئروں پر کام کے نقائص واضح کیے جا سکیں۔

او پی آر ٹی آئی اور سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے تعلقات:

اتھارٹی کے تعلقات: اتھارٹی سے او پی پی کا تعلق بطور تربیت کنندہ اور مشیر نومبر ۱۹۹۰ میں شروع ہوا تھا۔ جب یونی سیف نے پہلی بار او پی پی کے سینی ٹیشن پروگرام کے نمونے کو سکھر میں اپنانے کا فیصلہ کیا تو ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی، سکھر میونسپل کارپوریشن اور یونی سیف شراکت

دار تھے۔ اتھارٹی کو منصوبے میں رابطہ کار اور جزوی سرمایہ فراہم کرنے والے کا کردار سونپا گیا۔ اگست ۱۹۹۱ میں جب تسنیم صدیقی کو اتھارٹی کا ڈی جی مقرر کیا گیا تو انھوں نے کراچی کی کچی آبادیوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے او پی پی سے اعانت کی درخواست کی۔ ماری پور، گریکس ولیج اور ٹکری کی آبادیوں کو آزمائشی منصوبے کے طور پر منتخب کیا گیا جہاں او پی پی کے سینی ٹیشن پروگرام کی طرز پر "اندرونی" اور "بیرونی" نکاس کے نظام کا مظاہرہ کیا جانا تھا۔ تاہم جنوری ۱۹۹۲ میں تسنیم صدیقی کو اس عہدے سے ہٹا دیا گیا جس کے نتیجے میں یہ منصوبہ رک گیا اور او پی پی نے اپنی اعانت بند کر دی۔

مئی ۱۹۹۲ میں حیدر آباد میں کولیبوریٹو کچی آبادی امپروومنٹ پروگرام کے سلسلے میں عالمی بینک کی شیلٹر ٹیم کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس منصوبے میں بھی اتھارٹی کو رابطہ کار اور جزوی سرمایہ فراہم کرنے والے کا کردار سونپا گیا۔ او پی پی کو اس پروگرام میں شامل مختلف فاعل کرداروں کو تربیت فراہم کرنے کے علاوہ مجموعی طور پر منصوبے کے مشیر کی ذمہ داری دی گئی۔

جون ۱۹۹۳ میں تسنیم صدیقی ایک بار پھر اتھارٹی کے ڈی جی مقرر ہوئے۔ انھوں نے او پی پی سے دوبارہ درخواست کی کہ کراچی کی مختلف کچی آبادیوں میں اتھارٹی کے کام میں مشیر اور تربیت کار کے طور پر اعانت فراہم کرے۔ اتھارٹی نے او پی پی کے ماڈل کو اپنی سرکاری پالیسی کے طور پر اپنا لیا۔ او پی پی آر ٹی آئی نے کسی رسمی معاہدے کے بغیر اتھارٹی کے ساتھ کام شروع کیا۔ اپریل ۱۹۹۴ میں ایک سرکاری معاہدہ ہوا جس کی رو سے او پی پی کو اتھارٹی کا کنسلٹنٹ مقرر کیا گیا جس کا کام مشیر اور تربیت کار کے فرائض انجام دینا تھا۔ اتھارٹی اس کے عوض او پی پی کو ہر سال ایک لاکھ روپے ادا کرتی ہے جس میں فیس اور براہ راست آنے والی لاگت شامل ہے۔ اس وقت او پی پی اتھارٹی کے ساتھ کراچی کی ۲۰ کچی آبادیوں میں کام کر رہی ہے۔

بین الاقوامی امدادی ادارے

بین الاقوامی امدادی ادارے ویلفیئر کالونی میں کوئی عملی کردار ادا نہیں کر رہے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو ان اداروں کے وجود کا بھی علم نہیں۔

عورتوں اور نوجوانوں کے کردار کے بارے میں پائے جانے والے تصورات

اس کالونی میں چار نسلی گروہوں کے لوگ آباد ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد پٹھانوں کی ہے، ان کے بعد پنجابیوں اور مہاجروں کا نمبر آتا ہے اور کچھ بلوچی خاندان بھی یہاں آباد ہیں۔ عورتوں اور نوجوانوں کے کردار کے بارے میں ان مختلف نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے تصورات ان کے پس منظر کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

پٹھان باشندے، جو پاکستان کے شمال مغربی دیہی علاقے کے قبائلیوں پر مشتمل ہیں، لڑکیوں کو تعلیم دینے کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ آٹھ یا دس سال کی عمر کو پہنچنے پر لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا ممنوع ہو جاتا ہے۔ مردوں کا خیال ہے کہ باہر جانے پر ان کی لڑکیاں شہری ماحول سے متاثر ہو سکتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ روایات سے بغاوت کریں گی اور قابو سے باہر ہو جائیں گی۔ لڑکیوں کو قرآن کی تعلیم بھی نہیں دی جاتی۔ جن ۲۰ عورتوں کا انٹرویو کیا گیا وہ سب کی سب ناخواندہ تھیں۔ بچپن کی شادیاں عام ہیں۔ لڑکیوں کو بارہ تیرہ سال کی عمر میں بیاہ دیا جاتا ہے۔ شادی پر لڑکے کا خاندان لڑکی کے گھر والوں کو ۷۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے تک ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اس کے بعد لڑکی شوہر کی ملکیت تصور ہوتی ہے اور بیشتر صورتوں میں اسے اپنے والدین سے ملنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔

خاندانی منصوبہ بندی کو گناہ خیال کیا جاتا ہے، تاہم بعض عورتیں جاننا چاہتی تھیں کہ اس کے طریقے کیا ہیں اور اس کے لیے ادویات وغیرہ کہاں سے مل سکتی ہیں۔ چند ایک نے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کیے ہیں۔ بچے کی پیدائش کے سلسلے میں بیشتر خاندان دائی کو بھی طلب نہیں کرتے بلکہ خاندان کی عورتیں ہی سب کام انجام دیتی ہیں۔ دوائیں وغیرہ گھر کے مرد لا کر دیتے ہیں۔ عورتوں کو اشد ضرورت کے سوا ڈاکٹر کو نہیں دکھایا جاتا اور جب ڈاکٹر کے پاس لے جایا بھی جاتا ہے تو وہ سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس ہوتی ہیں۔ جسمانی معائنے کی اجازت صرف لیڈی ڈاکٹر کو دی جاتی ہے۔

تاہم بعض خاندانوں نے (جن کی تعداد تقریباً ۲۰ فیصد ہے) اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلانا شروع کیا ہے۔ اس کی ایک مثال فریدہ ہے جو اب کالج کے دوسرے سال میں پڑھ رہی ہے۔ اس کی تعلیم کے سلسلے میں اس کی دادی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ایک اور لڑکی شازیہ بھی سیکنڈ ایر میں ہے۔ وہ مقامی کالج میں زیر تعلیم ہے اور اس سلسلے میں اسے اپنے باپ کی تائید حاصل ہے۔ ایک شخص دریا خان اپنی تمام لڑکیوں کو تعلیم دلوا رہا ہے۔ اس کی بڑی لڑکی ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے۔ دریا خان خود ایک ڈرائیور ہے لیکن اس کا باپ غیر منقسم ہندوستان میں انجینئر تھا۔ اس کی سوتیلی ماں انگریز تھی اور خود دریا خان نے بمبئی کے ایک کالج میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم

حاصل کی ہے۔ ایک مثال شکیلہ اور اس کی دو بہنوں کی بھی ہے جو سائنس کی گریجویٹ ہیں۔ وہ اپنے گھر پر ایک ٹیوشن سنٹر بھی چلا رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم ان کے خاندان میں عام ہے۔ فرزانہ ایک درزن ہے اور اپنی بیٹی کو پڑھا رہی ہے۔

ویلفیئر کالونی میں داخلے کی بڑی سڑک

کالج جانے والی لڑکیاں برقع نہیں بلکہ چادر اوڑھتی ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا کہ جو خاندان کراچی میں ۲۰ یا ۳۰ سال سے مقیم ہیں ان کے رویے میں تبدیلی آئی ہے جس کا اثر لڑکیوں اور عورتوں کو دی جانے والی آزادی پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان خاندانوں میں بچپن کی شادیوں کا رواج یا عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے، ٹی وی دیکھنے، ریڈیو سننے اور دوسرے خاندانوں کی عورتوں سے ملنے پر پابندی نہیں ہے۔

بیشتر نوجوان لڑکے یا تو ناخواندگی کا شکار ہیں یا انھوں نے صرف پانچویں یا چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر ان کی تعلیم کا سلسلہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں شادی، جلد ہی بچے کی پیدائش اور کم آمدنی (بیشتر لڑکے سبزی منڈی میں مزدوری کرتے ہیں) کے باعث منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن عابد اور نورزمین جیسے لڑکے بھی ہیں جنھوں نے اپنے باپ کی خواہش کے برعکس تعلیم حاصل کی۔ عابد کا کہنا ہے کہ وہ اپنے خاندان میں باغی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صبح کے وقت ایک کالج میں پڑھتا ہے اور شام کو ایک کلینک میں کام کر کے اپنی تعلیم کا خرچ پورا کرتا ہے۔ او پی پی میں حفاظتی ٹیکے لگانے کی تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ کسی مقامی ہسپتال میں نرس کے طور پر جز وقتی ملازمت کرنا چاہتا ہے۔ عابد کا کہنا ہے کہ وہ علاقے کے اردو بولنے والے خاندانوں اور کالج میں اپنے ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے متاثر ہوا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے گھر جاتا ہے، جو گلشن کے علاقے میں فلیٹوں میں رہتے ہیں، اور ان کے صاف ستھرے رہن سہن کو بہت پسند کرتا ہے۔ خاندانی پابندیوں اور روایتوں کے باوجود اس نے اپنی بہنوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ جلد ہی ایک تیرہ سالہ لڑکی سے اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو تعلیم دلائے گا اور اگر وہ ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہیں گے تو انھیں اجازت دے گا تاکہ وہ (اس کے اپنے لفظوں میں) "پڑھیں لکھیں موج کریں۔ میری طرح نہیں جو جھگڑ جھگڑ کر پڑھا ہے، اور اپنی پڑھائی کا خرچ خود کیا ہے۔"

نورزمین بھی اپنی تعلیم کا خرچ خود اٹھا رہا ہے۔ وہ سہ پہر کو کالج جاتا ہے اور شام کے وقت کالونی میں گیس کی لائن ڈالنے والے ایک ٹھیکے دار کے پاس کام کرتا ہے۔ رات کو وہ ایک کلینک میں کام کرتا ہے۔ نورزمین خاندان میں عورتیں ناخواندہ ہیں لیکن اس کی سب سے چھوٹی بہن کالونی کے ایک پرائمری اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ نورزمین نے اپنے باپ کو، جو سبزی منڈی میں مزدوری کرتا ہے، اس بات پر قائل کیا ہے۔ نورزمین کی ماں بھی اس کی حامی ہے۔ اس کی ماں اور دو

ویلفیئر کالونی میں واقع بازار

بہنیں فرزانہ کے لیے اپنے گھر رہ کر کپڑے سینے کا کام کرتی ہیں اور تقریباً ایک ہزار روپے ماہانہ کما لیتی ہیں۔ نورزمین کا ارادہ ہے کہ جب اس کی بیٹیاں ہوں گی تو وہ ان کو پڑھائے گا۔ عابد اور نورزمین کہتے ہیں کہ علاقے کے دوسرے لڑکے بھی پڑھنا چاہتے ہیں لیکن جلد شادی کے رواج اور اپنے خاندان کو پالنے کے لیے مزدوری کرنے کی مجبوری کے باعث ایسا نہیں کرپاتے۔

جن عورتوں سے انٹرویو کیا گیا ان میں سے ۵۰ فیصد چاہتی ہیں کہ ان کی بیٹیاں تعلیم حاصل کریں۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم یافتہ عورت اپنے گھر کا انتظام زیادہ اچھی طرح چلا سکتی ہے اور کسی ناگہانی حادثے، مثلاً طلاق یا شوہر کی موت، کی صورت میں کوئی کام کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال سکتی ہے۔ ایسا حادثہ پیش آنے کی صورت میں عورت کو ایک بوجھ سمجھا جانے لگتا ہے اور خواہ وہ اپنے باپ اور بھائیوں کے گھر رہے یا سسرال میں، اسے گھر کا پورا کام سنبھالنا پڑتا ہے۔ ماؤں کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کر کے عورتیں مصروف رہ سکتی ہیں بجائے اس کے کہ ان کی طرح بیکار وقت گزار کر موٹی یا بیمار ہو جائیں۔

جن لڑکیوں سے انٹرویو کیا گیا ان میں سے تقریباً سبھی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ گھروں سے نکل کر خریداری کرنے یا دوسری لڑکیوں سے ملنے جانا چاہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر پر ان کے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہر گھر میں اتنی زیادہ عورتیں اور لڑکیاں ہیں کہ گھر کا کام ذرا سی دیر میں پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ سب فارغ بیٹھی رہتی ہیں۔ سب لڑکیاں چاہتی ہیں کہ ٹی وی دیکھیں، اخبار اور کتابیں پڑھ سکیں، اور گھومنے جا سکیں لیکن ان پر باپ اور بھائیوں کی طرف سے اتنی پابندیاں ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔

بہت سے پٹھان مرد چاہتے ہیں کہ ان کی عورتیں کام کریں لیکن ان کی شرط یہ ہے کہ یہ کام وہ گھر پر رہ کر یا محلے میں کریں۔ انھیں ڈر ہے کہ اگر ان کی عورتیں محلے سے باہر نکلیں تو راستہ بھول جائیں گی یا تیز رفتار ٹریفک سے کچلی جائیں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ گاؤں میں جہاں ہر جگہ جانی پہچانی ہوتی ہے، ان کے گھر سے نکلنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ سے باہر معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نئی نسل کی لڑکیوں نے کبھی کوئی گاؤں نہیں دیکھا ہے!

سبزی منڈی کی سرگرمیاں

مہاجر اور پنجابی خاندانوں کے خیالات ملتے جلتے ہیں۔ ان کے مرد بیشتر تعمیراتی مزدور یا رکشا ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ان کی عورتوں کے گھر سے باہر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ گھر سے باہر جاتے وقت برقع یا چادر اوڑھتی ہیں۔ وہ دن بھر پڑوسیوں یا رشتے داروں سے ملنے یا خریداری کے لیے بازار جانے میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کے ٹی وی دیکھنے یا کتابیں اور اخبار پڑھنے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ سب باتیں ان کے لیے فطری اور معمولی ہیں۔ لڑکیوں کی شادی کی اوسط عمر ۱۶ سے ۱۸ سال ہے۔ شادیاں عموماً رشتے داروں ہی میں ہوتی ہیں لیکن خاندان سے باہر شادی کرنے کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ انٹرویو کے دوران مہاجر عورتوں اور لڑکیوں کے چہروں پر وہ خالی پن کا تاثر نہیں تھا جو پٹھان عورتوں سے انٹرویو میں دکھائی دیا۔

بیشتر خاندان اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ ان کے نزدیک مالی استطاعت اور گھر کے قریب اسکول کا نہ ہونا ہے۔ تقریباً ۲۵ فیصد لڑکیاں اسکول جاتی ہیں اور چند ایک کالج۔ قرآن سب نے پڑھ رکھا ہے۔ جن لڑکیوں سے انٹرویو کیا گیا وہ سب تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

تمام عورتیں اور لڑکیاں گھر پر رہ کر سلائی کڑھائی یا کوئی اور کام کرنا چاہتی ہیں۔ چند ایک پہلے ہی سے گھریلو کاروبار مثلاً پھلوں اور مسالوں کو چھیلنے اور پیک کرنے کے کام میں مشغول ہیں۔ جن سولہ عورتوں سے انٹرویو کیا گیا ان میں سے دو نے اپنے گھر میں کریانے کی دکانیں کھول رکھی ہیں اور ایک ریڈی میڈ کپڑے سیتی ہے۔ پچاس فیصد عورتیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے استعمال کرنا چاہتی ہیں لیکن انھیں اس سلسلے میں معلومات نہیں ہیں۔

بلوچ خاندانوں میں مرد بیشتر منڈی میں ڈرائیور یا مزدور کے طور پر کام کرتے ہیں۔ پٹھانوں کی طرح بلوچوں کے بھی بڑے بڑے خاندان ہیں۔ ایک خاندان عموماً

۱۷ سے ۱۲۸افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آٹھ سے دس سال کی عمر کے بعد لڑکیوں کے محلے سے باہر جانے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ تاہم پٹھان عورتوں کے برعکس وہ ٹی وی دیکھ سکتی ہیں اور برقع یا چادر اوڑھ کر کسی بڑی عمر کی عورت کے ساتھ بازار جا سکتی ہیں۔ بچپن کی شادی کا رواج نہیں ہے اور شادی کے لیے لڑکیوں کی اوسط عمر سولہ سے اٹھارہ سال ہے۔ بیشتر بلوچ عورتوں کو کڑھائی کے کام میں مشغول پایا گیا۔ ایک خاندان میں جہاں کل دس عورتیں ہوں، وہاں پانچ یا چھ عورتیں دن بھر کڑھائی کا کام کرتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے آرڈر انھیں شہر کے مالدار بلوچ خاندانوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ شلوار قمیص اور دوپٹے پر مشتمل ایک سوٹ تیار کرنے میں تقریباً تین ماہ لگ جاتے ہیں۔ اوسطاً پانچ عورتیں اس سوٹ پر کام کرتی ہیں اور انھیں ۱۵۰۰روپے ملتے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔

تجزیہ

ویلفیئر کالونی میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک کسی سرکاری محکمے، بین الاقوامی ادارے یا این جی او کی طرف سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ لوگوں نے پانی، نکاس اور بجلی کی سہولتیں اپنی مدد آپ کے تحت حاصل کی ہیں۔ لیز کے کاغذات اور نکاس کا بیرونی کام متواتر پیروکاری کے ذریعے کرلیا گیا ہے۔ آٹھ پرائیویٹ کلینک اور دو اسکول علاقے کے لوگوں نے قائم کیے ہیں۔

کونسلروں کا کردار برائے نام رہا ہے، لیکن جب کبھی انھوں نے ترقیاتی کام میں حصہ لیا ہے تو ان کا کردار جانب دارانہ اور استحصال پر مبنی رہا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ کونسلر ڈپٹی اقبال نے پانی کی لائن ڈلوانے کے لیے سات سو روپے فی گھر وصول کیے جب کہ اس کام کے لیے اس کے پاس کے ایم سی کے فنڈز موجود تھے۔

اوپی پی آر ٹی آئی نے محض مقامی تنظیم کے اعانتی ادارے کا کردار ادا کیا ہے جبکہ ایک اور این جی او، ایدھی ٹرسٹ، نے فلاحی نوعیت کا کام کیا ہے۔ اس ادارے نے علاقے میں ایک اسکول اور ایک ہسپتال بھی قائم کیا ہے۔ ایدھی ٹرسٹ کے اسکول اور ہسپتال کے لیے پلاٹ مقامی تنظیم نے فراہم کیا تھا۔ یہ تنظیم اس پلاٹ کو قبضہ گیروں اور منشیات فروشوں سے بچانے کے لیے بھی سرگرم رہی تھی۔ سیاست دانوں میں عرفان اللہ مروت نے مثبت کردار ادا کیا کیونکہ ان کا مقصد پٹھانوں کے ووٹ لینا تھا۔ لیکن حاجی حنیف طیب کا کردار لوگوں کے نقطہ نظر سے منفی رہا کیونکہ وہ ان کو بے دخل کرکے زمین پر قبضہ کرنے کے خواہش مند تھے۔

علاقے میں لوگوں کے لیے ہوئے پہل کارانہ اقدام کے نتیجے میں ترقی پسندانہ رویے کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ خاندان اب اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں اور اس کا خرچ بھی اٹھانے کو تیار ہیں، لیکن علاقے میں اسکولوں کی غیر موجودگی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بچوں کے والدین کو حفاظتی ٹیکوں کی ضرورت کا احساس ہے لیکن آبادی میں حفاظتی ٹیکوں اور ٹیکے لگانے والوں کی شدید کمی ہے۔ لوگ علاج معالجے کے لیے بھی رقم ادا کرنے کو تیار ہیں۔

ویلفیئر کالونی کے ترقیاتی کام میں سب سے اہم کردار ان کارکنوں نے ادا کیا جن کے پاس علاقے کی ترقی کے لیے اپنا ایجنڈا تھا۔ ان میں سے بیشتر خود روزگار تعمیراتی مزدور، ٹیکسی ڈرائیور یا منڈی کے مزدور ہیں اس لیے اجتماعی کاموں کے لیے وقت دے سکتے ہیں۔ ان کے مضبوط تنظیمی ڈھانچے کی وجہ منڈی یونینوں کا کیا ہوا کام ہے۔

محبوب شاہ اور ان کے ساتھیوں کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انھیں اپنے علاقے کی ترقی کے لیے کس قسم کی اعانت درکار ہے۔ انھوں نے فلاحی مقصد کے لیے مخصوص ایک پلاٹ پر اسکول اور ہسپتال قائم کرنے کے لیے ایدھی ٹرسٹ سے درخواست کی کیونکہ اس سے دہرا مقصد حاصل ہوتا تھا: ایک طرف پلاٹ کو قبضہ گیروں کے چنگل سے بچانا اور دوسرے علاقے کے لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنا۔ اسی طرح اوپی پی آر ٹی آئی سے نالے کی تعمیر کے سلسلے میں اعانت کی درخواست کی گئی۔

ویلفیئر کالونی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کسی سرکاری محکمے یا بین الاقوامی ادارے نے کوئی کام نہیں کیا۔ لوگوں نے اپنے مسائل خود حل کیے۔ تاہم صحت، سینی ٹیشن، پانی کی فراہمی، تعلیم اور چھوٹے کاروبار کے لیے قرضوں کے سلسلے میں تکنیکی امداد کی ضرورت اب بھی موجود ہے۔

کمیونٹی کارکنوں کے خاکے

عبدالحمید قریشی (صدر، کرنال بستی تنظیم)

"میں ۱۹۷۷ سے کرنال بستی میں رہ رہا ہوں جب میری عمر ۱۳ برس تھی۔ میری بہن مجھ سے پہلے سے یہاں رہتی تھیں۔ ہم لوگ نواب شاہ سے یہاں آئے ہیں،" حمید قریشی کہتے ہیں۔ ۱۹۷۷ میں، جب ممتاز بھٹو وزیر اعلیٰ سندھ تھے، سندھیوں اور غیر سندھیوں کے درمیان فسادات ہوئے تھے۔ عبدالحمید کا خاندان

نواب شاہ چھوڑ کر پنجاب چلا گیا۔ فسادات تھمے تو وہ لوگ واپس نواب شاہ گئے، اپنی زمین فروخت کی اور کراچی آگئے۔ یہاں وہ کرنال بستی میں مقیم ہوئے۔ ان کے والد پہلے مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے نواب شاہ میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں جو سب کے سب کرنال بستی میں رہتے ہیں۔ نواب شاہ میں انھوں نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر فسادات کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

حمید نے علاقے میں تعمیراتی مزدور کے طور پر کام شروع کر دیا۔ کرنال بستی کے بیشتر لوگ ہنر مند یا نیم ہنر مند مزدور ہیں اور ان میں سے کچھ ٹھیکے دار بھی ہیں۔ یہ بستی ۱۹۶۰ میں قریب واقع ملک پلانٹ کی تعمیر کے وقت آباد ہوئی تھی۔

جنوری ۱۹۸۳ میں حمید کو دوائیں تیار کرنے والی کمپنی فائزر کے پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں ہیلپر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ وہ فائزر کی لیبر یونین ایکشن کمیٹی کے ایک فعال رکن بن گئے اور تین سال تک کمیٹی کے چیئرمین کے عہدے پر بھی رہے۔ ۱۹۸۷ میں کمپنی کی انتظامیہ اور یونین کے درمیان تنازعہ ہوا۔ دو سو مزدوروں کو جبراً ریٹائر کیا جا رہا تھا۔ یونین نے اس کی مخالفت کی جس کے نتیجے میں تمام عہدے داروں کو چارج شیٹ کر دیا گیا۔ احتجاج ہوا۔ مزدوروں نے کام روک دیا اور کمپنی چھ مہینے کے لیے بند ہو گئی۔ آخر کار عہدے داروں کو دو لاکھ روپے کا معاوضہ اور تمام واجبات ملے۔ تب یونین نے کام شروع کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ نئے عہدے دار منتخب کیے گئے۔ حمید کو جوائنٹ سیکرٹری چنا گیا۔ لیکن ڈیڑھ سال بعد جنرل سیکرٹری کو ہٹا دیا گیا کیونکہ وہ یونین کے چند سینئر ارکان کو نوکری سے نکالنے کے معاملے میں انتظامیہ کے ساتھ ہو گیا تھا۔ حمید نے علاقے کے ایک وکیل سے مشورہ کر کے جنرل سیکرٹری کو معطل کرا دیا۔ تحقیقات سے جنرل سیکرٹری پر الزام ثابت ہو گیا۔ ۹۰ دن کے اندر دوبارہ انتخابات ہوئے اور حمید کو جنرل سیکرٹری چن لیا گیا۔ تاہم انتظامیہ نے تنازعہ جاری رکھا۔ مزدور ہڑتال کرنا چاہتے تھے لیکن حمید نے انھیں باز رکھا اور مذاکرات پر آمادہ کیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ۴۳ مزدوروں کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ حمید نے ان کی تنخواہ کے لیے ہر مزدور سے دو سو روپے ماہانہ چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایک ماہ تک یونین نے چندہ کیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اگر مزدوروں نے ہڑتال کی تو سب کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے گولڈن ہینڈ شیک اور رضاکارانہ ریٹائرمنٹ کے لیے مذاکرات کیے۔ انتظامیہ اس پر راضی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہڑتالوں کی وجہ سے کمپنی کو پہلے ہی ایک کروڑ روپے کا نقصان ہو چکا ہے اور وہ اب کمپنی کو بند کرنا چاہتی ہے۔ مزدور جانتے تھے کہ یہ ایک چال ہے، اس لیے انھوں نے کہا کہ وہ اس پر رضامند ہیں بشرطے کہ جب کبھی کمپنی دوبارہ کام شروع کرے تو ان کو دوبارہ ملازمت دی جائے۔ یہ بات نہیں مانی گئی۔ آخر کار احتجاج ناکام ہو گیا اور مزدوروں کو نوکری سے برخاست ہونا پڑا۔ ہر ایک کو اس کے واجبات دیے گئے جو زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ روپے تک تھے۔ حمید نے بھی فائزر کمپنی ستمبر ۱۹۹۴ میں چھوڑ دی۔

فائزر میں ملازمت کے دوران حمید یونین کے کاموں میں اتنے مصروف رہے کہ تنظیم کے کام کے لیے وقت نہ نکال سکے، اگرچہ وہ مختلف موقعوں پر تنظیم کے ارکان کو مشورے دیتے رہے۔ فی الحال وہ بے روزگار ہیں لیکن انھوں نے اپنے ایک دوست کے ماربل کے کاروبار میں ایک لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کر لی ہے۔ وہ وہاں ہفتے میں دو بار جاتے ہیں اور اس کے سوا انھیں فرصت رہتی ہے۔ اس شراکت داری سے انھیں تین ہزار روپے ماہانہ حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا ارادہ اپنے کام کو تعمیرات اور ٹھیکے داری تک پھیلانے کا ہے اور وہ اس کام کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تنظیم کے دفتر میں محبوب شاہ اور ناصر بڑی رات دیر تک اتحادی کے اہلکاروں کے ساتھ محو گفتگو

فروری ۱۹۹۵ سے وہ کرنال بستی ویلفیئر تنظیم کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔ صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد انھوں نے محبوب شاہ سے رابطہ قائم کیا تاکہ لیز جاری کرنے کے کام کو سمجھ سکیں اور اس سلسلے میں ان کا تعاون حاصل کر سکیں۔ وہ لیز، پانی، گیس، امن و امان اور منشیات کے مسئلے جیسے تمام معاملات پر محبوب شاہ کے

ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

کرنال بستی تنظیم کے پچھلے صدر عبدالرشید زیادہ مضبوط شخصیت کے مالک نہ تھے۔وہ مقامی مسجد کے قاری صاحب کے زیراثر تھے۔ ۱۹۹۴ میں حمید اور ان کے ساتھیوں کو قاری جان محمد کی بعض نامناسب کارگزاریوں کے بارے میں معلوم ہوا ۔ قاری صاحب نے مقامی مسجد اور مدرسے کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کر رکھا تھا جس کے نام پر وہ فطرہ، زکوٰۃ اور بقر عید کے موقعے پر کھالیں جمع کرتے تھے۔ لیکن یہ رقم بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم نہیں کی جاتی تھی (جیسا کہ ہونا چاہیے تھا) بلکہ مدرسے کے استادوں کی تنخواہیں ادا کرنے میں استعمال ہوتی تھی۔ حمید اور ان کے ساتھی اس طرز عمل کو غلط سمجھتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ جب مدرسے کے تمام طلبا فیس ادا کرتے ہیں تو قاری صاحب کو استادوں کی تنخواہوں کے لیے زکوٰۃ اور فطرے کی رقم استعمال نہیں کرنی چاہیے۔انھوں نے استادوں کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے چندہ جمع کرنے تک کی پیش کش کی۔ اس وقت سے حمید تنظیم کے کام میں سرگرم ہوئے۔اب تمام فطرہ اور زکوٰۃ تنظیم جمع کرتی ہے اور اسے یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس سال انھوں نے ۱۴،۰۰۰ روپے جمع کیے اور اس رقم کو چھ مستحقین میں تقسیم کیا گیا۔

محبوب شاہ کی رہنمائی میں حمید نے سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے ساتھ لیز جاری کرنے کے عمل کے سلسلے میں رابطہ قائم کر لیا ہے۔ جنوری میں کرنال بستی کے ۴۰ ارکان کے ساتھ انھوں نے تسنیم صدیقی سے ملاقات کی اور ان سے بستی کے لیے لیز جاری کرنے کی درخواست کی۔ تاہم اس سلسلے میں اتھارٹی کے عملے کے بعض ارکان کی جانب سے ایک مسئلہ پیدا کیا گیا۔ انھوں نے کرنال بستی میں ایک میٹنگ منعقد کی اور لوگوں سے کہا کہ تنظیم کی وساطت کے بغیر براہ راست ان سے معاملہ کریں۔اس سے حمید اور محبوب شاہ جیسے کارکنوں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور انھوں نے اس کام سے علیحدگی اختیار کر لی۔ حمید کی تنظیم ۱۲۰ مالک مکانوں کی فائلیں مکمل کر چکی تھی اور لوگوں نے اتھارٹی سے براہ راست معاملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ایک ماہ سے زیادہ کے تعطل کے بعد یہ مسئلہ حل ہوا اور اتھارٹی نے دوبارہ تنظیموں کی وساطت سے لیز کا کام کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔اب حمید کی تنظیم کے ذریعے سے ۲۷۵ فائلیں مکمل کی جا چکی ہیں اور ان کے چالان جمع کرائے جا چکے ہیں جبکہ مکانوں کی کل تعداد ۳۶۰ ہے۔ چھ مالک مکانوں کو لیز جاری کی جا چکی ہے۔ تنظیم ہر فائل پر کام کرنے کے عوض سو روپے فیس وصول کرتی ہے۔ رجسٹرار کے دفتر سے لیز جاری کرنے کے عمل کو آسان بنانے کے لیے تنظیم ایک وکیل کی خدمات حاصل کر رہی ہے۔ حمید کا بیشتر وقت اب لیز کے کام میں گزرتا ہے۔

حمید کے چار بچے ہیں: ایک بیٹا اور تین بیٹیاں۔ان میں سے تین اسکول میں پڑھ رہے ہیں اور سب سے چھوٹی بچی کی عمر صرف تین سال ہے۔ حمید کا بیٹا ویلفیئر کالونی سے باہر ایک اسکول میں پڑھتا ہے اور اپنی پھوپھی کے گھر رہتا ہے۔ دو لڑکیاں ویلفیئر کالونی کے الفاروق ماڈل اسکول میں پڑھتی ہیں۔ حمید اپنے تمام بچوں کو پڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے، "میں نے خود تعلیم حاصل نہیں کی، اس لیے مجھے اپنے بچوں کی تعلیم کی اہمیت کا بہت احساس ہے۔"

محبوب شاہ (کارکن ویلفیئر کالونی تنظیم)

محبوب شاہ باجوڑ علاقے کے سالارزئی شہزاد خیل قبیلے سے تعلق رکھنے والے پٹھان ہیں۔ وہ پشاور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے باپ ایک مزدور تھے۔ محبوب شاہ ۱۹۶۵ میں کراچی آئے۔ یہاں انھوں نے سات برس ایک درزی کے طور پر الفنسٹن اسٹریٹ پر کام کیا۔ان کی ماں اس دوران ان کے پاس رہیں۔ ان کا ایک بھائی سولجر بازار میں رہتا تھا اور اقبال فروٹ مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ جب اس فروٹ مارکیٹ کو موجودہ سبزی منڈی منتقل کیا گیا تو محبوب شاہ اور ان کے بھائی نے ویلفیئر کالونی میں رہائش اختیار کر لی۔ اپنی درزی کی دکان کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس آبادی میں کھانے کی بھی ایک دکان کھول لی اور اسے تین سال تک چلایا۔

۱۹۷۲ میں انھوں نے اپنے بھائی کی شراکت سے سبزی منڈی میں ایک پھلوں کی دکان کھول لی۔ پھر ۱۹۷۴ میں انھوں نے ماشاخور کے طور پر پھلوں کا تھوک کاروبار شروع کیا۔ "میں بڑے ٹھیکے داروں سے پھلوں کے ٹرک خریدتا اور مقامی دکانوں کو فروخت کرتا ہوں۔ اس کاروبار میں ہم چار شراکت دار ہیں۔ ہم ایک ٹرک ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ روپے تک میں خریدتے ہیں۔ جب ایک تہائی یا نصف ٹرک فروخت ہو جاتا ہے تو ہمیں اپنی رقم واپس مل جاتی ہے۔ عموماً ایک ٹرک روزانہ فروخت ہو جاتا ہے، اگرچہ کبھی کبھی اس میں دو تین دن کا وقفہ بھی آ جاتا ہے۔" اگست میں محبوب شاہ اور ان کے شراکت داروں نے ۱۵ ٹرک فروخت کیے۔ یہ کام موسمی نوعیت کا ہے۔ کبھی کبھی تین تین مہینے تک کوئی سودا نہیں ہوتا۔ محبوب شاہ کے پاس چار مزدور ملازم ہیں جو پھلوں کو الگ الگ کرتے اور گنتے ہیں۔ محبوب شاہ ہر روز ۳۰۰ سے ۴۰۰ روپے تک کما لیتے ہیں اور کبھی کبھی ان کی آمدنی ایک ہزار سے ۱۵ سو روپے تک ہو جاتی ہے۔ آج کل وہ شہر کے باہر نئی تعمیر شدہ سبزی منڈی میں ایک دکان حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

محبوب شاہ نے ویلفیئر کالونی میں اپنا پلاٹ ۱۹۷۶ء میں ۵۰۰۰ روپے میں خریدا تھا۔ اُس وقت، ان کا کہنا ہے، ہر طرف جھگیاں ہی جھگیاں تھیں۔ پلاٹ کے گرد صرف ایک چاردیواری تھی۔ انھوں نے اپنا مکان رفتہ رفتہ تعمیر کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردگرد آبادی ہوتی گئی۔ یہاں بسنے والے لوگ سبزی منڈی یا ملک پلانٹ میں کام کرتے تھے۔ کچھ لوگ رکشہ چلاتے تھے۔

۱۹۸۹ء میں محبوب شاہ نے کراچی ویلفیئر فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ یہ تنظیم ۱۹۸۱ سے کراچی ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے تاج محمد خان کی زیرِ صدارت کام کر رہی تھی، جو اب کینیڈا منتقل ہو چکے ہیں۔ محبوب شاہ اس تنظیم میں شروع ہی سے فعال تھے اور انھوں نے تاج محمد کے ساتھ مل کر پانی اور بجلی کے حصول کے لیے کام کیا تھا۔ ویلفیئر کالونی میں محبوب شاہ کو ان کوششوں کی بنا پر شہرت حاصل ہے جو انھوں نے علاقے کے قبرستان میں منشیات فروشوں اور قبضہ گیروں کو قدم جمانے سے روکنے کے لیے کی تھیں۔ جھنڈا شاہ بابا کو سب لوگ ایک ملنگ کے طور پر جانتے تھے جو قبرستان میں ایک چھپر میں رہتا اور قبروں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ اس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کالونی کے باشندے کرتے تھے۔ تنظیم کے ارکان اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہر روز بابا کے پاس جاتا۔ ہر جمعرات کو کالونی کے کئی گھروں سے بابا کے لیے کھانا بھیجا جاتا۔ ہر روز کئی لوگ نذر نیاز کے لیے بابا کے پاس جاتے اور اس کا حال پوچھتے۔ کالونی میں کسی کی فاتحہ ہوتی یا کوئی تقریب منعقد ہوتی تو بابا کو کھانا کپڑا اور نقد رقم دی جاتی۔ اسی طرح عید، بقر عید، شب برات وغیرہ پر اسے کالونی کے گھروں سے عطیات ملتے۔ جب بارش وغیرہ میں اس کے چھپر کو نقصان پہنچتا تو تنظیم کے ارکان اس کی مرمت کراتے۔ ۱۹۸۴ء میں جھنڈا شاہ بابا کی وفات ہو گئی۔ بابا کا بھتیجا قبضہ گیروں مسعود بھینس والے اور خوشحال چھوٹا ماما کے ساتھ مل گیا اور قبرستان پر قبضے کی کوششیں کرنے لگا۔ انھوں نے قبرستان کی زمین پر جھگیاں ڈال لیں۔ قبرستان کی زمین جس کا رقبہ تقریباً نصف ایکڑ تھا، کالونی کے باشندوں کے لیے مذہبی اور مقدس حیثیت رکھتی تھی کیونکہ یہاں ان کے رشتے دار دفن تھے اور خود ان کو بھی یہیں دفن ہونا تھا۔ چنانچہ اس قبضے پر ان میں سخت ردِ عمل پیدا ہوا۔ محبوب شاہ نے قبضہ گیروں کی جھگیاں خود مسمار کیں۔ اس میں انھیں سبزی منڈی کی لیبر یونین اور پھلوں کے تاجروں کی حمایت حاصل تھی۔ قبضہ گیروں نے عدالت سے حکمِ امتناعی حاصل کر لیا لیکن محبوب شاہ نے سبزی منڈی کے حاجی افتخار کی مدد سے منڈی سے ۳۰ ہزار روپے جمع کیے اور ۴۰ ہزار روپے کا چندہ کالونی کے باشندوں سے جمع کیا۔ اس رقم سے قبرستان کے گرد چاردیواری تعمیر کی گئی اور دو پھاٹک لگائے گئے۔ یہ زمین آج تک محفوظ ہے۔

۱۹۸۶-۸۷ء میں بہت بھاگ دوڑ کے بعد محبوب شاہ نے اپنے مکان کے لیے بجلی کی منظوری حاصل کی۔ قریب کے چار مکانوں سے چار چار ہزار روپے جمع کیے گئے اور اس سے بجلی کے کھمبے نصب کیے گئے تاکہ ان مکانوں تک بجلی پہنچ سکے۔ انھوں نے نالے کے اس حصے پر جو ان کے مکان کے پاس واقع ہے، ۱۶,۵۰۰ روپے کے خرچ سے ایک کلورٹ تعمیر کرایا۔ محبوب شاہ نے سوئی سدرن گیس کمپنی سے علاقے کے لیے گیس کا کنکشن بھی منظور کرایا۔ اب فی گھر ۵۷۷ روپے ادا کرنے کے بعد علاقے کے باشندے گیس کا کنکشن حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں تنظیم ان کی پوری مدد کرتی ہے۔

۱۹۸۹ کے بلدیاتی انتخابات میں لوگوں نے محبوب شاہ کو کونسلر کے عہدے کے لیے امیدوار نامزد کیا۔ انھوں نے ان کی انتخابی مہم کے لیے چندہ بھی جمع کیا کیونکہ وہ اپنی آبادی سے کونسلر منتخب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن محبوب شاہ ایم کیو ایم کے ڈپٹی اقبال سے ہار گئے۔ محبوب شاہ کا کہنا ہے کہ ابتدائی گنتی میں ان کو کامیاب قرار دیا گیا تھا لیکن آخری گنتی میں ڈپٹی اقبال کو منتخب قرار دے دیا گیا کیونکہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی تھی۔

اس زمانے میں کراچی میں نسلی سیاست نے زور پکڑا۔ ایم کیو ایم کراچی کے مہاجروں کی حمایت سے شہر کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ غیر مہاجر اقلیت میں تھے اور ان کے ووٹ کئی سیاسی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اس صورت حال کا اثر ویلفیئر کالونی کے انتخابی نتیجے پر بھی پڑا کیونکہ کونسلر کے حلقے میں آس پاس کی دوسری آبادیاں بھی شامل تھیں۔

محبوب شاہ کو سبزی منڈی کے مزدوروں میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ایک مزدور حمید بہت بیمار ہو گیا۔ محبوب شاہ نے اس عرصے میں اس کا بہت خیال رکھا۔ "میں نے ایک سوزوکی پکڑی اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے کہا کہ حمید کو آرام کے لیے پشاور لے جاؤں۔ میں نے راتوں رات سبزی منڈی سے حمید کے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے چندہ جمع کیا۔ مزدور، دکاندار اور دوسرے لوگوں نے چندہ دیا۔ بعد میں پشاور میں حمید فوت ہو گیا، لیکن کم سے کم وہ مرتے وقت اپنے گھر والوں کے پاس تھا۔" اس واقعے کے بعد مزدور محبوب شاہ کی نیک دلی سے متاثر ہو کر اس کی بہت قدر کرنے لگے۔ انھوں نے محبوب شاہ کو فروٹ منڈی لیبر یونین کا پہلے خزانچی اور پھر صدر بنایا، اور ستمبر ۱۹۹۲ سے اب تک وہ یونین

کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ یونین کے ارکان کی تعداد ۷۸۶ ہے۔

۱۹۸۹ میں محبوب شاہ کو علاقے کی تنظیم ویلفیئر سوسائٹی فیڈریشن کا سیکرٹری چنا گیا۔ تنظیم کا دفتری کام، جس میں مختلف محکموں میں جا کر پیروکاری کرنا بھی شامل ہے، محبوب شاہ کے ذمے ہے۔ آبادی میں ہونے والی ہنگامی نوعیت کی سرگرمیاں، مثلاً کسی کی تدفین کا انتظام، پولیس سے لوگوں کو رہا کرانا، شناختی کارڈ بنوانا وغیرہ، دوسرے کارکن انجام دیتے ہیں۔ محبوب شاہ کی ٹیم میں نو کارکن ہیں جن میں اسمٰعیل آفریدی، شہید اللہ جان، بختیار خان، احسان اللہ راجہ، روزامیل خان اور ناصر برکی شامل ہیں۔

۱۹۹۰ میں محبوب شاہ کو کسی نے زہر دے دیا۔ وہ اس واقعے کے ذمہ دار کا نام نہیں لیتے لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں علاقے کے ایک بدنام منشیات فروش گل زرین کے آدمیوں کا ہاتھ تھا۔ محبوب شاہ چار دن تک بے ہوش رہے اور انھیں سترہ دن ہسپتال میں رہنا پڑا۔

آج کل محبوب شاہ سبزی منڈی کی شہر سے باہر منتقلی کے سلسلے میں فکرمند ہیں۔ نئی منڈی میں آڑھتی دکانوں کے خود مالک ہوں گے جبکہ موجودہ منڈی میں یہ دکانیں انھیں کے ایم سی سے کرائے پر حاصل ہوئی ہیں۔ اس سے یونین کی قوت کم ہو جائے گی کیونکہ وہ کے ایم سی یا کے ایم سی کی ایمپلائز یونین کے ذریعے آڑھتیوں پر دباؤ نہیں ڈال سکے گی۔ اس صورت حال کے ازالے کے لیے محبوب شاہ نے مزدوروں کو منظم کر کے انھیں ٹریڈ یونین کے طور پر رجسٹر کرالیا ہے اور آڑھتیوں کو ان کا ضمانتی بنوا دیا ہے۔ نئی یونین کو سوداکاری ایجنٹ کے طور پر تسلیم کرانے کی کوششیں جاری ہیں۔ ٹریڈ یونین کے طور پر رجسٹر کرانے کے لیے متعلقہ محکمے کے اہلکاروں کو ۴۵ ہزار روپے بطور رشوت ادا کیے گئے۔ سوداکاری ایجنٹ کے طور پر رجسٹر کرانے کے لیے ۲۵ ہزار روپے مزید طلب کیے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اب ہر مزدور کے پاس رجسٹریشن کارڈ ہے۔ ہر کارڈ کے لیے ۳۰۰ روپے رشوت دی گئی ہے۔ منڈی کے تین ہزار مزدوروں کے لیے یہ رقم نو لاکھ روپے بنتی ہے۔

وکیل صاحب (کارکن کسٹوڈین کمپاؤنڈ)

وکیل صاحب کا خاندان جودھپور سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے وکالت پاس کی تھی۔ ان کا خاندان ۱۹۴۲ میں کراچی منتقل ہوا۔ وہ خود ستمبر ۱۹۴۷ سے کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں رہ رہے ہیں۔ ۱۹۴۶ سے ۱۹۵۸ تک انھوں نے ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری میں ٹائم کیپر کے طور پر ملازمت کی۔ ۱۹۵۸ میں وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۷۰ سے وہ ایک قانونی فرم کی جانب سے، جس کا دفتر کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں واقع ہے، وکالت کر رہے ہیں۔

وکیل صاحب کو اس بات سے اتفاق نہیں کہ کسٹوڈین کمپاؤنڈ ایک کچی آبادی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس جگہ جو ۲۶ آشرم قائم تھے ان کی جگہ ۵۰ مکان تعمیر ہوئے۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ میں رہنے والے بیشتر لوگ مشرقی پنجاب کے مہاجر ہیں۔ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ یہ قانونی آبادی ہے جبکہ ویلفیئر کالونی، کرنال بستی، پیر بخاری کالونی اور محبوب شاہ کا علاقہ سب تجاوزات ہیں۔ وہ سندھ کچی آبادی اتھارٹی سے لیز حاصل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ان کے پاس کاغذات موجود ہیں جو ۱۹۴۷ میں ان کے خاندان کو جاری کیے گئے تھے۔

وکیل صاحب نے دوسرے علاقوں کے کارکنوں کے ساتھ کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لیا۔ کسٹوڈین کمپاؤنڈ کے ۵۰ گھروں پر وکیل صاحب کا اثر ہے کیونکہ ان کے پاس ۱۹۴۷ کی الاٹمنٹ کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔

نتائج

ویلفیئر کالونی کے مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

- ویلفیئر کالونی بے دخلی کے خلاف اور شہری سہولتیں حاصل کرنے کے لیے موثر جدوجہد اس وجہ سے کر سکی کہ اس کے سبزی منڈی کی مزدور یونین کے ساتھ گہرے روابط ہیں۔ ان روابط کے باعث اسے نقد رقم تک رسائی، سرکاری محکموں سے معاملہ کرنے کی اہلیت رکھنے والے رہنما، سیاست دانوں سے رابطہ رکھنے والے کارکن اور بہت سی منظم تنظیموں اور یونینوں کی حمایت حاصل ہوئی ہے جن کو کسی مشکل وقت میں مدد کے لیے طلب کیا جا سکتا ہے۔
- ویلفیئر کالونی کی مثال سے واضح ہوتا ہے کہ لوگ خواہ انفرادی یا خاندانی طور پر غریب ہی کیوں نہ ہوں، سرکاری اہلکاروں (یا سیاست دانوں) کو رشوت دینے یا ترقیاتی سرگرمیوں کا خرچ اٹھانے کے لیے اجتماعی طور پر بڑی بڑی رقمیں اکٹھا کر سکتے ہیں۔
- دیہی علاقوں سے شہری علاقوں کو منتقل ہونے والے خاندانوں کی سماجی صورت حال اور طرز فکر میں بیس سال کے عرصے میں گہری تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں سب سے زیادہ خاندانوں کے مرد ارکان میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تاہم

اپنے خاندان کی عورتوں کے بارے میں ان مردوں کے خیالات کے بدلنے میں بہت طویل عرصہ لگتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ان خاندانوں کی عورتیں وہ آزادی اور تحرک بھی کھو بیٹھتی ہیں جو انھیں شہر آنے سے پہلے گاؤں کی زندگی میں حاصل تھا کیونکہ ان کے مرد رشتے دار سمجھتے ہیں کہ وہ شہر میں اکیلے آنے جانے کے قابل نہیں اور کسی حادثے کا شکار ہو سکتی ہیں۔ اس حقیقت سے بھی ان کے سوچنے کے انداز پر فرق نہیں پڑتا کہ شہر میں آباد دوسری برادریوں کی عورتیں ہر جگہ آسانی سے آتی جاتی ہیں۔

- عورتوں کے بارے میں طرز فکر میں تبدیلی نہ آنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مرد کم عمر میں شادی کر لیتے ہیں اور جلد ہی بچوں کے باپ بن جاتے ہیں۔ اس طرح انھیں اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے فوری طور پر روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے اور وہ تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ یوں ان کا پرانا سماجی نظام جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ اس بات کا مشاہدہ کیا گیا کہ دیر میں شادی کرنے والے مرد بہت مختلف رویہ رکھتے ہیں۔
- کسی مقامی تنظیم کا اداراتی کلچر اس کے فعال کارکنوں کے کردار اور زندگی کے تجربے پر منحصر ہوتا ہے۔ ویلفیئر کالونی میں تنظیم کے کارکن یونین میں کام کرنے کا پس منظر رکھتے ہیں جس کے باعث وہ احتجاج، مذاکرات اور احتجاج کے طریقے اور اتفاق رائے سے فیصلہ کرنے کے عمل سے مانوس ہیں۔ پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک اپنے ارکان کو تعلیم دینے کا کلچر رکھتی ہے۔ ان خصوصیات سے نہ صرف ویلفیئر کالونی کی تنظیموں کا کردار بلکہ تنظیم اور علاقے کے باشندوں کے درمیان رشتہ بھی متعین ہوا ہے۔
- ایک فرض شناس اور دیانت دار افسر سرکاری محکمے کی کارکردگی میں بہتری پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم وہ سرکاری اہلکاروں کے طرز فکر یا اپنے محکمے کے اداراتی کلچر میں تبدیلی نہیں لا سکتا۔ یہ تبدیلی صرف وقت گزرنے کے ساتھ اور مقامی آبادی کی شرکت اور حمایت سے آ سکتی ہے۔ یہ بات ویلفیئر کالونی میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی کے کیے ہوئے کام سے ظاہر ہوتی ہے۔
- سرکاری ادارے مارکیٹوں اور دوسری شہری سہولتوں کی منصوبہ بندی کرتے وقت بعض اہم سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کو نگاہ میں نہیں رکھتے جو مزدور طبقے کی زندگی پر منفی اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کا اصل مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انھیں انتظام کرنے، چلانے اور دیکھ بھال کرنے میں (ان کے نقطہ نظر سے) آسانی ہو اور مالی فائدہ ہو۔ کے ایم سی نے جس طرح نئی سبزی منڈی میں آڑھتیوں کو مالکانہ حقوق پر دکانیں فراہم کی ہیں اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں آڑھتی اس دباؤ سے مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے جو منڈی کی لیبر یونین کے ایم کی یونین کے ساتھ مل کر ان پر ڈال سکتی تھی۔
- کسی بحران یا شدید ضرورت کی صورت میں کم آمدنی والے علاقوں میں مسائل کو تنظیم کے کارکنوں کے سرکاری اہلکاروں یا سیاست دانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بنیاد پر حل کیا جا سکتا ہے۔ متبادل صورت میں ایسے مسائل سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر حل کیے جاتے ہیں۔ کچی آبادی کے مکینوں اور سرکاری محکموں کے درمیان تعلقات قوانین و ضوابط یا طریق کار کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتے۔
- لوگ مقامی تنظیم کے رہنماؤں اور کارکنوں کی جتنی بھی حمایت کریں، قومی یا بلدیاتی انتخابات میں وہ اپنے نسلی یا سیاسی پس منظر کے مطابق ہی ووٹ دیتے ہیں۔ قومی یا شہری سطح کی سیاست محلے کی سطح کے معاملات پر حاوی ہو جاتی ہے۔

منظور کالونی

بستی کا خاکہ

۳

منظور کالونی

سلیم علیم الدین

بستی

منظور کالونی کراچی کے ضلع جنوبی میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں کراچی ایڈمنسٹریٹو ایمپلائیز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (کے اے ای سی ایچ ایس) اور مغرب میں پاکستان ایمپلائیز کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس) واقع ہے جبکہ جنوب میں کورنگی اور مشرق میں ملیر ندی ہے۔ یہ آبادی ۱۲۹۵ ایکڑ رقبہ پر آباد ہے اور نو عدد سیکٹروں میں منقسم ہے۔ منظور کالونی میں ہی ہل ٹاؤن اور رحمان کالونی نامی دو اور کچی آبادیاں بھی شامل ہیں۔ مجموعی آبادی تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جو بیس ہزار مکانات میں رہتے ہیں۔

منظور کالونی اس زرعی اراضی کی غیر قانونی تقسیم در تقسیم سے وجود میں آئی جو سرکار کی ملکیت تھی۔ ۱۹۶۹ تک یہ اراضی زرعی مقاصد کے لیے ہی استعمال ہوتی تھی پھر اس کو غیر سرکاری طور پر دو یا تین قبضہ گیروں کے ہاتھ 'فروخت' کر دیا گیا۔ اس کام میں محکمہ زراعت، پولیس اور کے ایم سی کے اہلکاروں کا ہاتھ تھا۔ قبضہ گیروں نے بڑے قطعات اراضی کو ۲۰۰ اور ۴۰۰ گز کے مختصر پلاٹوں میں تقسیم کر دیا۔

ان پلاٹوں کو جیکب لائنز اور خداداد کالونی کے ان باشندوں نے خرید لیا جن کو اس وقت نئی کراچی منتقل کر دیا گیا تھا جب شاہراہ قائدین تعمیر کی گئی۔ تاہم، ان میں سے زیادہ تر نے نئی کراچی میں ملنے والے پلاٹ بیچ کر منظور کالونی میں آباد ہونا پسند کیا کیوں کہ یہ ان کی اصلی رہائش اور کام کی جگہ کے نزدیک واقع تھی۔

جوں جوں زمین کی مانگ بڑھتی گئی زمین کو مزید ۱۲۰ گز کے چھوٹے چھوٹے پلاٹوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کالونی کی نقشہ بندی گرڈ آئرن پیٹرن پر کی گئی جس میں بنیادی، ثانوی، ثلثی سڑکوں اور گلی کوچوں کے مراتب کا خیال رکھا گیا۔ ۱۹۸۶ میں

بلدیہ کراچی کے کچی آبادی ڈائریکٹریٹ (کے اے ڈی) نے منظور کالونی کو کچی آبادی کا درجہ دینے کا اعلان کردیا۔ آبادی کو باقاعدگی سے لیز تقسیم کرنے کا کام ابھی جاری ہے۔

باشندے

منظور کالونی کی آبادی مختلف نسلی اور سماجی گروہوں پر مشتمل ہے۔ ان میں زیادہ تر نچلی درمیانی آمدنی والے لوگ ہیں جو مزدوری کرتے ہیں یا نجی اور سرکاری اداروں میں نچلے درجے کے ملازم ہیں۔ اس گروہ کی اوسط ماہانہ آمدنی ڈھائی ہزار روپے ہے۔ اس علاقے میں چنیوٹ (صوبہ پنجاب) کے ماہر کاریگروں کے سو سے اوپر فرنیچر بنانے کے کارخانے بھی کام کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ قالین سازی اور سنگ مرمر کا سامان بنانے کی ورکشاپس بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ جو باشندے دستکار ہیں یا دستکاری سے متعلق کاموں سے منسلک ہیں پنجاب سے آئے ہیں۔ اس طبقے کی اوسط ماہانہ آمدنی کوئی چار ہزار روپے ہے۔

آج کل اس آبادی کی سماجی بہبود کی تمام سرگرمیاں انجمن فلاح و بہبود انجام دیتی ہے جو مقامی آبادی کی ایک تنظیم ہے۔ انجمن فلاح و بہبود (اے ایف بی) روز مرہ کے تمام سماجی اور ترقیاتی مسائل کے حل میں بلا تفریق ہر طبقے کی خدمت کرتی ہے۔

منظور کالونی میں وڈیرا، ملا، سردار اور چودھری جیسے روایتی رہنماؤں میں سے کسی کا بھی زور نہیں چلتا۔ کمیونٹی میں پیدا ہونے والے مسائل اے ایف بی یا مقامی پولیس افسران کے ذریعے ہی فیصل ہوتے ہیں اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ اے ایف بی کے بیشتر ارکان بااثر اور متمول مقامی باشندے ہیں۔ خواتین اور کمیونٹی کے غریب افراد کو شاذونادر ہی پالیسی ساز کمیٹیوں میں شامل کیا جاتا ہے۔

منظور کالونی کی بڑی سڑک کا منظر

منظور کالونی کی کمیونٹی نسلی اعتبار سے ملی جلی (ہزارہ وال، پنجابی، بلوچ) ہے اور دیہی پس منظر رکھتی ہے۔ مختلف گروپوں کی خواتین میں بہت کم میل جول ہے۔ محلے میں کیا ہو رہا ہے اس کا پتا خواتین کو صرف اپنے گھر کے مردوں سے ہی چلتا ہے۔

باشندوں کی کثیر تعداد کرائے کے مکانوں میں رہتی ہے۔ تاہم چند ایسے بھی ہیں جو پلاٹوں کے مالک ہیں جن پر انھوں نے مکان بنالیے ہیں۔ پلاٹوں کے اصل مالکان، بظاہر باضابطہ علاقوں میں منتقل ہوچکے ہیں اور انھوں نے کالونی میں اپنے مکانات کو کرائے پر اٹھادیا ہے۔ آبادی کا تعلق طرح طرح کی آمدنی والے گروپوں اور

منظور کالونی: پس منظر میں کراچی ایڈمنسٹریٹو سوسائٹی

منظور کالونی: اہم تاریخیں

۱۹۶۹ منظور کالونی کی زمین کو غیر قانونی طور پر پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۹۷۲ پہلی بار بجلی فراہم کی گئی۔

۱۹۷۳ پانی کی تقسیم کا نظام حاصل کیا گیا۔

۱۹۸۶ منظور کالونی کے ریگولرائزیشن کے قابل کچی آبادی ہونے کا نوٹیفکیشن جاری کیا گیا۔

۱۹۸۸ انجمن فلاح و بہبود، سیکٹر ۱، قائم ہوئی۔

۱۹۸۹ ینگ کرسچین سوشل ویلفیئر سوسائٹی قائم ہوئی۔ سڑکوں کی تعمیر کے لیے پیروکاری کا کام شروع کیا گیا۔

۱۹۹۰ این جی او آر سی نے منظور کالونی میں مقامی تنظیموں کی صلاحیت کاری کا پروگرام شروع کیا۔

۱۹۹۰ سیوریج سسٹم کے لیے او پی پی کی اعانت حاصل کی گئی۔ پہلی میٹنگ جون میں ہوئی۔ سینی ٹیشن نظام کے نقشے اور تخمینے جولائی میں تیار ہوئے۔ تعمیراتی کام شروع کیا گیا۔ آبادی میں پانی، نکاس اور سڑکوں کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے کے ایم سی کو ۳ء۸ ملین روپے کی رقم مہیا کی۔

۱۹۹۱ ملیر ندی میں کچرا جلانے کے خلاف پیروکاری کا آغاز ہوا۔

۱۹۹۱ مئی میں میئر کے نام ایک خط لکھا گیا جس میں پانی کی فراہمی بحال کرنے کی درخواست کی گئی۔ آکس فیم سے مالی اعانت حاصل ہوئی۔

۱۹۹۲ جنوری میں انجمن فلاح و بہبود کو محتسب اعلیٰ کے ادارے کے بارے میں معلوم ہوا اور اس نے کے ڈبلیو ایس بی کے خلاف محتسب کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ سڑکوں کی تعمیر شروع ہوئی (جواب بھی جاری ہے)۔ مارچ میں محتسب کی عدالت میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ اکتوبر میں منظور کالونی کے باشندوں کے حق میں فیصلہ ہوا۔ اسپورٹس کمپلیکس کی تعمیر کا منصوبہ کے ایم سی کو پیش کیا گیا۔

۱۹۹۳ اسپورٹس کمپلیکس کی تعمیر کا کام تین ٹھیکے داروں کے سپرد کیا گیا۔

۱۹۹۵ ملیر ندی میں کچرا جلائے جانے کے بارے میں وزیر اعلیٰ سندھ کو خط لکھا گیا۔ اسی مسئلے پر جنوری میں کمشنر کراچی اور متعلقہ شعبوں کے سربراہوں کے ساتھ میٹنگ کی گئی۔

صوبوں سے ہے۔ پیشوں، قبیلوں، زبان اور ذاتوں کے اعتبار سے بہت کم باتیں مشترک ہیں۔

اس کچی آبادی میں کوئی کمیونٹی سینٹر نہیں ہے جہاں لوگ اپنی فرصت کے لمحات مل جل کر گزار سکیں یا تقریبات منعقد کر سکیں۔ تازہ ہوا اور تفریحات کے لیے کوئی پارک بھی نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے اے ایف پی ملیر ندی بند کے کنارے زمین حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پانی اور صفائی کی سہولیات

شروع میں نکاس کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ لوگ بیت الخلا میں کونڈے استعمال کرتے تھے جن کا فضلہ باہر گلیوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔

کچھ لوگوں نے ۵۵۰ روپے فی سوک پٹ کے حساب سے سوک پٹ بنا لیے تھے۔ گندا پانی گلیوں میں بہتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ تو سوک پٹ ٹھیک ٹھاک رہے مگر آگے چل کر ہر ۱۲ سے پندرہ دن بعد ان کو سو، ڈیڑھ سو روپے خرچ کر کے خالی کروانا ضروری تھا۔ اس گند کو اُٹھا کر لے جانے والی گاڑیاں آسانی سے دستیاب نہ تھیں۔ گاڑی کے انتظام میں ہی پورا دن لگ جاتا تھا۔ چنانچہ زیادہ تر لوگوں نے خاکروبوں کے ذریعے سوک پٹ خالی کرانا بہتر سمجھا جو بالٹیاں بھر بھر کر گندگی کو گلیوں میں پھینک دیتے تھے۔

تاہم، سوک پٹ کی وجہ سے زیر زمین پانی کی سطح بلند ہو گئی اور گلیوں میں گندگی پھیلنے کی وجہ سے لوگ بیمار ہونے لگے تو صحت کے مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مکانات کو بھی نقصانات پہنچا کہ پانی کی سطح بلند ہونے کی وجہ سے سیل نے دیواروں کو چاٹنا شروع کر دیا۔ علاقہ نشیبی ہے اور ملیر ندی کے کنارے واقع ہے اس لیے بارش کے دنوں میں صفائی کی صورت حال اور گمبھیر ہو جاتی کیونکہ پانی ان مکانات میں داخل ہو جاتا جن کے فرش اونچے نہیں ہوتے۔ اس پانی کو پمپ کے ذریعے نکالنا پڑتا۔ اس صورت حال نے وہاں کے باسیوں کو صفائی اور نکاسی آب کے مسائل کا حل سوچنے

ٹاس کی بڑی لائن کی تعمیر سے پہلے ایک سڑک کی حالت

پر مجبور کیا۔

منظور کالونی کے لوگوں نے بستی کے آباد ہوتے ہی فراہمی آب کے لیے ہم خیال کاری شروع کر دی تھی۔ چند سرگرم کارکنوں کی وجہ سے جو حکمران جماعت پی پی پی سے منسلک تھے وہ ۱۹۷۴ میں تقسیم آب کا نیٹ ورک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ کام بلدیہ کراچی کے سالانہ ترقیاتی فنڈ کے ذریعے ہوا۔

تقسیم کا نیٹ ورک موجود ہوتے ہوئے بھی پانی کی سپلائی ایک مسئلہ ہی رہی اور زیادہ تر لوگوں کو پانی کے ٹینکروں سے پانی حاصل کرنا پڑا۔ چند کاروباریوں نے پانی کے بڑے بڑے حوض بنا لیے تھے۔ وہ ۱۵۰ سے ۲۰۰ روپے کے حساب سے ٹینکروں سے پانی خرید کر ان حوضوں میں ذخیرہ کر لیتے اور بستی والوں کو گدھا گاڑی کے ذریعے ۳۰ روپے فی گدھا گاڑی کے حساب سے فروخت کرتے۔ اس سارے کاروبار میں وہ کافی منافع کما لیتے۔

تعلیم

علاقے میں تین سرکاری اسکول ہیں۔ ان میں سے ایک دسویں جماعت تک اور باقی دو آٹھویں جماعت تک تعلیم فراہم کرتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک میں دوسری شفٹ لڑکیوں کے لیے لگتی ہے۔ یہ اسکول صرف ۲۰ فی صد اسکول جانے والے بچوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ ۶۰ فیصد بچے کالونی کے باہر پرائیویٹ اسکولوں میں جاتے ہیں جبکہ باقی ماندہ ۲۰ فیصد بچے کالونی میں موجود پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پرائیویٹ اسکولوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

درجہ	اسکولوں کی تعداد
نرسری	۵
آٹھویں جماعت تک	۱۰
دسویں جماعت تک	۲
بارہویں جماعت تک	۱

پرائیویٹ اور سرکاری اسکولوں میں جو سہولیات میسر ہیں ان سے آبادی کے لوگ مطمئن ہیں۔ سائنس کی تعلیم دینے والے سرکاری مدرسوں میں تجربہ گاہیں ہیں۔ چار پرائیویٹ اسکولوں نے اپنے طلبا کے لیے کمپیوٹر کی تعلیم کا پروگرام شروع کیا ہے۔ پرائیویٹ اسکولوں کا قیام افراد کی ذاتی پیش قدمی کا مرہون منت ہے، سوائے ایک کے جو ایک ایجوکیشن سوسائٹی یا ٹرسٹ نے قائم کیا ہے اور اسی کے زیر انتظام

ٹاس کا نظام تعمیر ہونے سے پہلے ایک گلی کی حالت

ایک پرائیویٹ اسکول

ہے۔ یہ اسکول فی طالب علم ۳۰ سے ۱۰۰ روپے تک ماہوار فیس وصول کرتے ہیں۔ ان اسکولوں نے تین چار کمروں سے آغاز کیا اور بتدریج اپنی وسعت میں اضافہ کرتے گئے۔

اسکول جانے والے بچوں، لڑکوں اور لڑکیوں کی اکثریت اسکول جاتی ہے۔ علاقے میں بہت سی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو روزانہ اسکول اور کالج آتے جاتے دیکھا جاسکتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے میں تو خواتین کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے مگر کہیں کام کرنے میں ان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ تعلیم دلوانے کی یہ خواہش غالباً سماجی مرتبہ بڑھانے کا معاملہ ہے۔ دس سے پندرہ فیصد لڑکے کتائی، سلائی صنعتوں، آٹو گیراجوں، شفاخانوں، دکانوں اور دیگر کاروبار میں جز وقتی کام بھی کرتے ہیں جو صدر اور پی ای سی ایچ ایس جیسے پرانے شہری مراکز میں واقع ہیں۔

منظور کالونی میں کمیونٹی تنظیمیں

علاقے میں ۱۳ کمیونٹی تنظیمیں ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

۱- انجمن فلاح و بہبود (اے ایف بی) سیکٹر آئی
۲- تنظیم جاناں
۳- ینگ کرسچین ویلفیئر سیکٹر سی
۴- 'سی' ویلفیئر
۵- محمدی ویلفیئر سیکٹر ای
۶- انجمن راجپوت سیکٹر بی اور ای
۷- اخوت سیکٹر سی
۸- انجمن پٹھانان گڈانیا سیکٹر ایف
۹- راجستھان ویلفیئر سیکٹر جی
۱۰- انجمن ارائیاں سیکٹر جی
۱۱- انجمن اتحاد ہزارہ سیکٹر ایچ
۱۲- انجمن فلاح و بہبود، رحمانیہ کالونی
۱۳- عوامی ویلفیئر سیکٹر آئی

مندرجہ بالا تنظیموں میں سے صرف چار فعال ہیں۔ اکثر تو منظور کالونی کے کسی خاص سیکٹر میں اپنی اپنی برادری کی خدمت کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ ان تنظیموں کی کارکردگی کو مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

اے ایف بی سیکٹر آئی ہی صرف وہ تنظیم ہے جس کی کارکردگی کسی ایک علاقے یا کسی ایک برادری تک محدود نہیں۔ اس کی تنظیم اور کارکردگی کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔

تنظیم جاناں ایک مخصوص برادری کی تنظیم ہے۔ حالانکہ اس کے مقاصد میں پوری کالونی کی خدمت شامل ہے مگر اس نے اپنی مدد آپ کے تحت جاری نکاس پروگرام سے قبل ایسی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ علاقے میں نکاس کے نظام کی تکمیل کی خاطر تنظیم جاناں نے اے ایف بی سے اشتراک کیا تاہم وہ اپنی ذمہ داری

ایک پرائیویٹ اسکول میں کلاس کا منظر

پوری نہ کر سکے اور ان کے علاقوں میں ناقص کام ہوا۔ چنانچہ اے ایف بی نے نکاس کے جاری کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تنظیم جاناں کا تعلق ختم ہو گیا۔

نکاس کی بڑی بڑی لائنیں پڑ جانے کے بعد تنظیم جاناں کے اراکین نے این جی او آر سی کی طرف سے منعقد کردہ استعدادکاری ورک شاپس میں شرکت کی۔ این جی او آر سی نے تنظیم جاناں کو دعوت دی کہ وہ اے ایف بی کے ساتھ مل کر آکس فیم (OXFAM) کی مہیا کردہ امدادی رقم (سینتیس ہزار روپے) کی مدد سے صفائی کے منصوبے کی تکمیل کی ذمہ داری اٹھائیں۔ انھوں نے انکار کر دیا اور بعد میں اے ایف بی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ رقم تو پوری منظور کالونی کے لیے دی گئی تھی مگر اے ایف بی نے خرد برد کر دی۔ اس طرح دونوں تنظیموں کے ایک ساتھ مل کر کام کرنے کی مزید حوصلہ شکنی ہوئی۔ بعد میں تنظیم جاناں کے رہنماؤں میں آپس میں اختلافات پیدا ہو گئے اور نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ بدقسمتی سے نئی قیادت کو سماجی کاموں کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور وہ تنظیم کے کام کو آگے نہ بڑھا سکے۔ سوائے اے ایف بی کے سالانہ اجلاس عام میں سابق صدر کی شرکت کے انھوں نے دیگر کمیونٹی تنظیموں سے کوئی ربط نہیں رکھا۔ یہ تنظیم اب تقریباً غیر متحرک ہے۔

ینگ کرسچین ویلفیئر سوسائٹی (وائی سی ڈبلو ایس) ان تین تنظیموں میں سے ایک ہے جنہوں نے صفائی کے پروگرام میں اے ایف بی کے ساتھ مل کر کام کیا۔ بعد میں یہ تنظیم اس پروگرام سے علیحدہ ہو گئی۔ اس تنظیم کی سرگرمیاں سیکٹر سی کی اقلیتی مسیحی کمیونٹی تک محدود ہیں۔ وائی سی ڈبلیو ایس کا نمائندہ بھی اے ایف بی کے سالانہ جلسہ عام میں شرکت کرتا ہے۔ یہ صرف مسیحی آبادی کے لیے پانی کے ٹینکروں کا انتظام کرتی ہے۔

سیکٹر سی ویلفیئر جو سیکٹر سی سے متعلق ہے نے ایک بار شجرکاری مہم میں اے ایف بی کے ساتھ کام کیا تھا۔ انہوں نے گھر گھر میں پودے لگانے کے لیے تقسیم کرنے میں مدد دی تھی اور اب ان پیڑوں کی نگہداشت گھر والے خود کرتے ہیں۔

سیکٹر ای کی محمدی ویلفیئر بہبود اور ترقی کا کام انجام نہیں دیتی۔ وہ الیکشن کے دنوں میں ہی فعال ہوتی ہے اور اپنی پسند کے سیاستدان یا پارٹی کے لیے مہم چلاتی ہے۔

سیکٹر بی اور ای کی انجمن راجپوت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے راجپوت برادری کی خدمت کرتی ہے اور الیکشن کے زمانے میں ہی سرگرم نظر آتی ہے۔

سیکٹر سی کی اخوت یک فردی تنظیم ہے اور انجمن راجپوت اور محمدی ویلفیئر کی طرح الیکشن کے زمانے میں سرگرم ہوتی ہے۔

انجمن پٹھانانِ گڈانیہ سیکٹر ایف میں کام کرتی ہے۔ اس کی نمائندگی ایک ہی شخص کرتا ہے جو اے ایف بی کے سالانہ جلسۂ عام میں بھی شریک ہوتا ہے۔ تنظیم گڈانیہ کے دیہی علاقے سے آئے ہوئے پٹھانوں کی خدمت کی داعی ہے۔

سیکٹر جی میں راجستھان ویلفیئر راجستھانی برادری کی خدمت کے لیے قائم ہوئی تھی مگر اب بالکل فعال نہیں ہے۔

سیکٹر جی میں ایک اور برادری تنظیم انجمنِ ارائیاں ہے۔ یہ ایک ڈسپنسری چلاتی ہے جس سے برادری کے لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔ تاہم یہ خط و کتابت اور منظور کالونی کے ترقیاتی امور کے سلسلے میں مختلف سرکاری محکموں سے ملاقاتیں کرنے میں انجمن فلاح و بہبود کی مدد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خواتین کے لیے ایک ووکیشنل سینٹر بھی چلاتی ہے۔

انجمن فلاح و بہبود کے عہدے دار انجمن کے دفتر میں

انجمن اتحاد ہزارہ منظور کالونی میں مقیم ہزارہ (صوبہ سرحد) کے لوگوں کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کا دفتر سیکٹر ایچ میں ہے۔ اے ایف بی کے محبت خان جو خود بھی ہزاروی ہیں اس تنظیم کے رکن ہیں۔ وہ اے ایف بی کے لیے کام کرتے ہیں کیونکہ ان کی خواہش ہے کہ منظور کالونی کے تمام باشندوں کو خدمات مہیا کریں۔ یہ تنظیم اپنے آس پاس کی آبادی میں گندگی کے نکاس کا انتظام کرتی ہے۔

انجمن فلاح بہبود رحمانیہ کالونی نے چند مقامی سرکاری محکموں کے خلاف احتجاج سے اپنا آغاز کیا تاکہ کمیونٹی میں ان کا اعتبار قائم ہو جائے تاہم وہ اپنے مقاصد

حاصل کرنے میں ناکام رہی اور اب بے جان ہے۔

سیکٹر آئی میں عوامی ویلفیئر کا اے ایف بی سے کاروباری اشتراک ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی بلائی گئی میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں اور دونوں مل جل کر مقامی سرکاری محکموں سے خط و کتابت اور ملاقاتیں کرتے ہیں۔ عوامی ویلفیئر کے دو افراد اے ایف بی کے بھی رکن ہیں۔

انجمن فلاح و بہبود

انجمن فلاح و بہبود سیکٹر آئی سوشل ویلفیئر ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ محبت خان اے ایف بی کے صدر ہیں۔ ہر دو سال بعد انتخابات ہوتے ہیں۔ اے ایف بی کی ایک خواتین شاخ اور تنظیم نوجوانان بھی ہے۔ ممبروں کی ہنگامی امداد اور عہدیداروں کے چندوں سے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔

اے ایف بی میں درجن سے زیادہ کمیٹیاں قائم ہیں جو لیز، صحت، شجر کاری، پانی، صفائی، بجلی، ٹیلیفون، گیس، استقبالیوں، پنچائت، ٹرانسپورٹ، الیکشن، سڑکوں اور کھیل کود جیسے امور کو دیکھتی ہیں۔ انجمن میں ایک ایڈمنسٹریٹر ایک قانونی مشیر اور پانچ عمومی مشیر ہیں۔ ہر کمیٹی میں ۵ تا ۱۴ ممبر ہوتے ہیں اور اے ایف بی کا صدر ہونے کی حیثیت سے محبت خان ہر کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ خاص خاص مسائل میں متعلقہ کمیٹی کے ایک یا دو ممبر محبت خان کی مدد کرتے ہیں۔

اپنی مدد آپ کے تحت نکاس کی لائنوں کی تعمیر جیسے بڑے بڑے فیصلے تمام کمیٹیوں کے ممبران کی میٹنگ میں اکثریتی رائے سے کیے جاتے ہیں۔

اے ایف بی تین سطحوں پر مصروف عمل ہے۔ پہلی سطح کمیونٹی کی بہبود ہے جس میں علاقے کے تمام باشندوں کو مناسب خدمات مہیا کرنے کے لیے ممبران کی طرف سے علاقے کی ترقی کی کاوشیں شامل ہیں۔ دوسری ہے پنچائت کمیٹی کی کارکردگی۔ ۱۹۹۰ سے اس نے اپنی کارگزاری کا ریکارڈ رکھا ہے۔ اس نے زبردستی کی شادیاں رکوائیں، حبس بے جا سے خواتین کو رہائی دلوائی اور دھوکا بازیوں کو بے نقاب کیا۔ لوگ اے ایف بی کی پنچائت کمیٹی کی طرف اپنے ذاتی اور مالی قضیے فیصلہ کرانے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ تیسری سطح پر کاروبار کمیٹی کی کارکردگی جس میں حصہ داروں کا ایک امداد باہمی گروپ شامل ہے (ہر حصے دار کا حصہ تقریباً دس ہزار روپے) جو کمیونٹی کے اندر جائیداد کی خرید و فروخت کرتا ہے اور منافع آپس میں تقسیم کرلیتا ہے۔ اس کاروبار کے منافع کا ۲ فیصد خواتین اور بچوں کی بہبود کے لیے مختص ہے اور اسی سے اے ایف بی کا ٹیوشن سینٹر بھی چلایا جاتا ہے۔

اے ایف بی نے ابھی تک کمیونٹی کی خواتین کے لیے کوئی پروگرام شروع نہیں کیا ہے مگر مستقبل قریب میں ایک سلائی سینٹر قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ عورتوں کے ارادوں اور منصوبوں کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کی رائے نہیں لی گئی ہے۔

کمیونٹی کی جدوجہد

پانی کی فراہمی

یہاں کے باشندوں نے ۱۹۷۴ میں پانی کی تقسیم کا نیٹ ورک حاصل کرلیا تھا مگر فی الحال چھ سیکٹروں میں سے صرف تین سیکٹروں (ڈی، ای، اور ایف) میں ہی ٹھیک ٹھاک پانی پہنچتا ہے۔

انجمن کے ارکان اپنے پروگراموں پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے

محبت خان کے کہنے کے مطابق فراہمی آب کے موجودہ نظام میں خرابی یہ ہے کہ واٹر بورڈ نے مین اور سب مین لائنوں میں (ٹی) کنکشن نہیں دیے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ اپنے اپنے گھروں تک کنکشن لے سکیں۔ ہر گلی کے لوگوں کو کنکشن لینے کے لیے مین لائن میں سوراخ کرنا پڑتا ہے جس کی

وجہ سے پانی رستا ہے اور نتیجتاً پانی کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ منظور کالونی کو قیوم آباد کے پمپنگ اسٹیشن سے ۱۲ انچ قطر کی لائن کے ذریعے پانی مہیا کیا جاتا ہے جہاں کا والومین اپنا فرض پورا نہیں کرتا۔ اے ایف بی کا منصوبہ ہے کہ پمپنگ اسٹیشن پر اپنا والومین مقرر کرے۔ بالائی ٹنکی کی تعمیر بھی زیر غور ہے۔ اے ایف بی نے ایک تحریری درخواست مقامی ایم این اے کو دی ہے جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتا ہے اور وہ حکمران جماعت پی پی پی کی مخالف جماعت ہے۔ چونکہ ایم این اے اقتدار میں نہیں ہے اس لیے وہ کوئی کام کروانے کے لیے سرکاری اداروں پر دباؤ نہیں ڈال سکتا۔

اے ایف بی نے وارڈ مسلم لیگ کے صدر کے ساتھ ایم این اے سے ملاقات کرنے کی کئی بار کوشش کی مگر وہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس کے ساتھ بلدیہ کراچی کے دفتر جا کر منظور کالونی کے لیے علیحدہ فنڈ حاصل کریں اور بالائی اور زیرزمین ٹینکوں کی تعمیر کی اس تجویز پر جو پہلے ہی کے ایم سی کے ایڈمنسٹریٹر کو پیش کی جاچکی تھی، گفت و شنید کریں۔ ایم این اے چونکہ ملتا نہیں تھا اس لیے اے ایف بی کو ازخود اس مسئلے کی پیروی کرنی پڑی۔ کے ایم سی کے سابقہ اور موجودہ ایڈمنسٹریٹروں کے ساتھ انہوں نے متعدد ملاقاتیں کیں۔ کے ایم سی نے اصولی طور پر اس بات سے اتفاق کر لیا ہے کہ منظور کالونی کے لیے ترقیاتی بجٹ کا تعین اب کے ایم سی اور اے ایف بی کی شراکت میں کیا جائے گا۔

تنظیم کے مشورے سے سیکٹر جی اور آئی کی ۳۰ گلیوں کے مکینوں نے باقاعدہ کنکشن حاصل کیے ہیں۔ یہ کام ایک پلمبر نے مزدوری ٹھیکے کی بنیاد پر پورا کیا۔ ضروری سامان خود گلیوں کے مکینوں نے فراہم کیا۔ دیگر سیکٹروں میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا اور وہاں کسی دوسرے آدمی نے اس کا ٹھیکہ لیا۔ مجموعی طور پر ۵۰ گلیوں میں یہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ لوگوں نے ۵۵ ہزار روپے لگائے اور تین فٹ قطر کی مین لائن کو ۷۰۰ فٹ اور آگے تک بڑھایا۔

مئی ۱۹۹۱ میں اے ایف بی نے کے ایم سی کے میئر کو لکھا کہ منظور کالونی کے باشندوں نے اپنی مدد آپ کے تحت دس لاکھ روپے خرچ کر کے نکاس کی لائن ڈال دی ہے اور کے ایم سی سے درخواست کی کہ وہ اس کی دیکھ بھال کا ذمہ لے، اور پانی کی سپلائی کو بحال کرے تاکہ نالے نالیاں بہتی رہیں اور گندگی پھنسنے نہ پائے۔ ہر ماہ اے ایف بی اور میئر کے درمیان میٹنگز ہوتی رہیں۔ اس گفت و شنید میں محبت خان اور واٹر اینڈ سیورج کمیٹی کے ایک یا دو اراکین شرکت کرتے تھے۔ ان میٹنگز میں بس یہ باور کرایا گیا کہ کے ایم سی کے پاس صفائی کا عملہ اتنا نہیں کہ لوگوں کے تعمیر کیے ہوئے نالے نالیوں کی دیکھ بھال پر متعین کیا جاسکے اور پانی کی فراہمی کے ایم سی کی نہیں واٹر بورڈ کی ذمہ داری ہے۔ اے ایف بی نے کراچی واٹر بورڈ کے افسران سے ملاقات کی بار بار کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی کیونکہ افسران بہت مصروف تھے۔

مشترکہ نل سے پانی بھرتے ہوئے بچے

جنوری ۱۹۹۲ میں اے ایف بی کو ایک مقامی اخبار کے ذریعے محتسب کے ادارے کا علم ہوا۔ اے ایف بی کی واٹر اینڈ سیورج کمیٹی نے دیگر ممبران کے ایما سے کراچی واٹر بورڈ کے خلاف مقدمہ درج کرانے کا فیصلہ کیا۔ محبت خان اور جنرل سکریٹری نے مل کر ایک درخواست تیار کی جس میں اہل محلّہ نے جو کچھ کام کروایا تھا اس کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد اس کی دیکھ بھال اور فراہمی آب کی بحالی کی مانگ کی گئی تھی کہ اس کے بغیر پورے نظام کے بیٹھ جانے کا خطرہ تھا۔

ایک ماہ کے اندر اندر اے ایف بی کو محتسب کے سیکریٹری کی طرف سے اطلاع دی گئی کہ ان کا مقدمہ درج کرلیا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۹۲ میں دوسرا مراسلہ ملا کہ اے ایف بی کے نمائندے محتسب کی عدالت میں حاضر ہو کر کراچی واٹر بورڈ کی طرف سے اُٹھائے گئے مندرجہ ذیل اعتراضات کا جواب دیں جو اس نے سہولیات مہیا کرنے میں اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے دیے ہیں:

۱۔ آبادی غیر قانونی ہے۔

۲۔ سیورج کا جو کام لوگوں نے خود کروایا ہے غیر معیاری ہے اور کراچی واٹر بورڈ کے لیے اس کی دیکھ بھال کرنا مناسب نہیں۔

مئی ۱۹۹۲ سے اکتوبر ۱۹۹۲ تک چار پیشیاں ہوئیں مگر واٹر بورڈ کا کوئی نمائندہ حاضر نہیں ہوا جس کی وجہ سے کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔ اس مقدمے میں محتسب کے مشیر نے فیصلہ دیا کہ بستی چونکہ غیر قانونی ہے اس لیے سہولتیں طلب کرنے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ اے ایف بی نے کراچی واٹر بورڈ کے پہلے اعتراض کو غلط ثابت کرنے کے لیے تین چار دن کی مہلت مانگی۔ اے ایف بی نے کراچی واٹر بورڈ کے اعتراضات کو غلط ثابت کرنے کے لیے دستاویزی ثبوت فراہم کیے۔ عدالت کے سامنے کے ایم سی کے کچی آبادی ڈائریکٹوریٹ کی جانب سے جاری کردہ نوٹی فکیشن سرٹیفکیٹ پیش کیا گیا جس میں منظور کالونی کو ایسی کچی آبادی کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا جس کو باقاعدہ کیا جانا تھا۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں اے ایف بی نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کا سرٹیفکیٹ پیش کیا جس میں بتایا گیا کہ نکاس کی لائنیں ڈالنے کا سارا کام ان کی نگرانی میں انجام کو پہنچا ہے اور عمدہ معیار کا ہے۔ اس پیشی میں کراچی واٹر بورڈ کی طرف سے علاقے کا ایگزیکٹیو انجینئر موجود تھا۔ محتسب کی عدالت نے آخر کار اہالیان منظور کالونی کے حق میں فیصلہ سنایا اور حکم دیا کہ کراچی واٹر بورڈ پانی کی سپلائی بحال کرے اور لوگوں کی تعمیر کردہ نکاس کی لائنوں کی دیکھ بھال اپنے ہاتھ میں لے۔ اس مقدمے کی پیروی، محبت خان، اے ایف بی کے جنرل سیکریٹری اور واٹر اینڈ سیوریج کمیٹی کے ممبران نے خود کی۔ کسی پیشہ ور وکیل کی خدمات حاصل نہیں کی گئیں۔

گلیوں میں پانی گدھا گاڑیوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے

بجلی

اس کچی آبادی کو عام ترقیاتی طریقہ کار کے تحت پہلی بار بجلی ۱۹۷۲ میں ملی۔ تاہم جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہوا یہ کم پڑتی گئی اور بجلی میں خلل عام ہوتا گیا۔ سیکٹر آئی کی ۱۷ گلیوں کے لیے شروع میں صرف ایک پی ایم ٹی تھا۔ آج تین پی ایم ٹی ہیں جن میں سے دو (۵۰۰ میگاواٹ اور ۲۵۰ میگاواٹ) چالو حالت میں ہیں۔ ۲۵۰ میگاواٹ کا تیسرا ایم پی ٹی ابھی چالو نہیں ہے۔ علاقے کے سرگرم کارکنوں کے تعاون سے اے ایف بی ایک ایسا نظام

پانی کی کمی کی وجہ سے لوگ بجلی کی موٹریں استعمال کرتے ہیں

قائم کرنے کے لیے مصروف ہے کہ جس کے تحت تمام سیکٹروں میں بوجھ کی تقسیم معقول ہو۔ اگر ایک سیکٹر میں تعطل ہو تو دوسرے سیکٹروں میں بجلی آتی رہے۔ ان کا منصوبہ ہے کہ ہر سیکٹر کے لیے پانچ پانچ پی ایم ٹی نصب کیے جائیں۔ تنظیم نے ہر ہر سیکٹر کی خامیوں کو نوٹ کرلیا ہے اور علاقے کے ایگزیکٹیو انجینئر سے کئی بار ملاقاتیں کی ہیں اور بجلی کی فراہمی کا تخمینہ لگانے کے لیے سروے کرنے کی درخواست بھی داخل کی ہے۔ محبت خان کے مطابق نئے پی ایم ٹی نصب ہونے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگے گا۔

اس منصوبے کے ساتھ ہی ساتھ عام سپلائی فیل ہونے کی صورت میں متبادل کے طور پر زیرزمین کیبل ڈالنے کا کام بھی جاری ہے۔ سرکاری اہلکاروں سے تعلقات بنائے رکھنے اور تمام کارروائیوں پر مسلسل نظر رکھنے کے لیے اے ایف بی کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دفاتر کے چکر

نکاس کا نظام تعمیر کرنے کے سلسلے میں ایک میٹنگ جس میں مقامی تنظیم، این جی او، آر سی اور او پی پی آر ٹی آئی نے شرکت کی

لگاتے رہتے ہیں۔ یہی طریقہ کار کے ای ایس سی کے ایگزیکٹیو انجینئر سے تعلقات بڑھانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ اے ایف بی کا کہنا ہے کہ افسران کے بار بار کے تبادلے ایک بڑا مسئلہ ہیں۔ باقاعدہ دستاویز سازی اور فائلنگ سسٹم کی مدد سے اے ایف بی کسی حد تک اس مسئلہ پر قابو پالیتی ہے۔

نکاس کا نظام

اس آبادی میں گندے پانی کے نکاس کے مسئلے کی نشان دہی سب سے پہلے این جی او آر سی نے کی تھی۔ یہ تنظیم ۱۹۸۳ میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۹۰ سے اس نے منظور کالونی کی مقامی تنظیموں کے لیے استعداد کاری کا پروگرام شروع کیا۔ این جی او آر سی نے اربن ریسورس سینٹر سے اس مسئلے پر مشورہ طلب کیا اور یو آر سی نے رابطہ کار این جی او آر سی کو مشورہ دیا کہ نکاس کے مسائل پر اورنگی پائلٹ پروجیکٹ والے تعاون کرسکتے ہیں۔

این جی او آر سی نے تین مقامی تنظیموں کے نمائندوں کے لیے او پی پی کے دورے کا انتظام کیا جہاں انھوں نے او پی پی کے نمائندوں سے ملاقات کرکے او پی پی کے طریقہ کار پر گفت و شنید کی اور ان نکاس کی لائنوں کا مشاہدہ کیا جو اورنگی کے لوگوں نے تعمیر کی تھیں۔ اس کے بعد اے ایف بی نے علاقے کی صفائی کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں او پی پی سے تکنیکی تعاون کی درخواست کی۔

درخواست ملتے ہی او پی پی کی ٹیم نے اس بستی کا سروے شروع کردیا۔ مقامی تنظیموں کے نمائندوں نے بھی سروے میں ہاتھ بٹایا۔ اس کام کے لیے دو ٹیمیں بنائی

منظور کالونی کے باشندے او پی پی آر ٹی آئی کے فراہم کردہ نکاس کے نظام کے ڈیزائن اور تخمینے پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے

گئیں۔ پہلی ٹیم او پی پی اسٹاف پر مشتمل تھی جن کا کام علاقے میں سطحوں کو ناپنا تھا۔ اور دوسری ٹیم میں مقامی تنظیموں کے نمائندے شامل تھے جن کے سپرد سڑکوں کی لمبائی کی پیمائش اور ہر سڑک پر واقع مکانات کی گنتی کا کام تھا۔ اس سارے عمل سے کمیونٹی نے نکاس کے نظام کو ڈیزائن کرنے کا طریقہ کار سیکھ لیا۔ پلاننگ کے مرحلے سے لے کر تعمیری کام شروع ہونے تک کمیونٹی تنظیموں کے نمائندوں نے او پی پی کے متعدد دورے کیے اور این جی او آر سی اور ان تنظیموں کے باہمی اشتراک سے ترغیبی میٹنگز منعقد کی گئیں۔ منظور کالونی میں اس نوع کی پہلی میٹنگ جون ۱۹۹۰ میں منعقد ہوئی جس میں یو آر سی کے احمد سعید، این جی او آر سی کے قدیر بیگ اور او پی پی کے سلیم علیم الدین شریک ہوئے۔ او پی پی کی کارگزاری، صفائی کے پروگرام اور دیگر پروگراموں کے بارے میں لوگوں کو پوری طرح آگاہ کیا گیا۔ علاقے کا پورا جائزہ لے کر گندگی کے اخراج کے لیے ممکنہ مقامات کا تعین کیا گیا۔ علاقے کے معائنے کے دوران اور بعد میں کمیونٹی تنظیموں سے تبادلۂ خیالات کے دوران، کچھ ممبران نے (جو خود تعمیری ٹھیکیدار تھے) اس بات پر اصرار کیا کہ قدرتی نالے میں گندگی کا اخراج ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ مطلوبہ نکاس کی لائنوں کی گہرائی کے مقابلے میں کم گہرا ہوگا۔ تاہم او پی پی کے انجینیئر نے بتایا کہ سطح پیمائی کے آلات استعمال کر کے اور مناسب منصوبہ بندی سے اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔

مقامی تنظیم کا کارکن او پی پی سے تربیت حاصل کر کے نکاس کا نظام تعمیر کرتے ہوئے

دو دن بعد تین کمیونٹی تنظیموں کے ۱۲ نمائندے او پی پی کے دفتر گئے۔ او پی پی کے سماجی تنظیم کار نے ان کو سمجھایا کہ او پی پی کا طریقہ کار یہ ہے کہ اور گلی سے باہر کے کاموں میں ان کا کردار منصوبہ اور تخمینہ تیار کرنے، ابتدا میں چند گلیوں میں کام کی نگرانی، کارکنوں کی تربیت، اوزاروں اور سانچوں کی فراہمی تک محدود ہے۔ اس کے بعد کمیونٹی تنظیمیں از خود اپنا کام انجام دیں۔ اس بات کو سن کر تنظیم جاناں کے مسٹر شریف نے کہا، "گویا اب سب کچھ ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ کو صرف رقم دے دی جائے گی اور باقی کام آپ ہمارے لیے کریں گے۔" اگلے دن او پی پی کے سینی ٹیشن کے عملے، ڈائریکٹر، انجینیئر، سماجی تنظیم کار اور تکنیکی عملے نے آکر موقع کا تفصیلی جائزہ لیا اور رائے دی کہ بغیر کسی دشواری کے یہاں زیرِ زمین نکاس کا نظام تعمیر کرنا ممکن ہے۔

بعد میں تبادلۂ خیالات کے دوران محبت خان نے او پی پی سے درخواست کی کہ وہ سیکٹر آئی سے لیول کی پیمائش کا آغاز کریں۔ (محبت خان سیکٹر آئی میں رہتے تھے) اور یہ بھی کہا کہ وہ اپنے ذرائع سے پندرہ ہزار روپے لگا کر کام فوراً شروع کر سکتے ہیں جو بعد میں کمیونٹی سے وصول کر لیے جائیں گے۔ او پی پی کے اراکین نے ان پر کمیونٹی کے کام اور ٹھیکیدار کے طریقہ کار کا فرق واضح کیا اور اس کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔

او پی پی کی جانب سے نقشہ اور تخمینہ تیار ہو جانے کے بعد اے ایف بی اور تنظیم جاناں کے اراکین جولائی ۱۹۹۰ میں او پی پی کے دفتر

نکاس کے زیرِ زمین نظام کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ایک صاف ستھری گلی

گئے۔ نقشہ اور تخمینہ ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ کیمونٹی تنظیموں کے اراکین نے کہا کہ وہ کونسلر اور زیڈ ایم سی کے چیئرمین سے مل کر نکاس کے نالے بنانے اور منظور کالونی کے قدرتی نالے کی مٹی نکال کر گہرا کرنے کو کہیں گے۔ اس میٹنگ میں او پی پی نے سلائیڈوں کی مدد سے او پی پی کے طریقۂ کار اور اور نگی میں لوگوں کے کیے ہوئے کام کو دکھایا اور سمجھایا۔ تنظیم جاناں کے ایک اور رکن نے علاقے کی دس اور گلیوں کے لیولز لینے کے لیے او پی پی سے درخواست کی کہ وہ اس علاقے میں بااثر تھا۔ او پی پی نے بتایا کہ او پی پی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ منظور کالونی جا کر دس گلیوں کا سروے کرے کیونکہ لیولز کی پیائش تو اسی وقت ہوگی جب علاقے میں تعمیری کام شروع ہونے والا ہوگا۔ تاہم اس نے تخمینہ لگانے کی پیشکش کی بشرطیکہ وہ ان گلیوں کی لمبائی اور ہر ایک میں مکانوں کی کل تعداد مہیا کر دے۔ پیشکش قبول کر لی گئی۔ مین ہولوں کے سائز اور گہرائی، پائپوں کے قطر، رکاوٹوں کے احتمالات وغیرہ کے بارے میں بہت سارے تکنیکی سوالات کے جوابات او پی پی کے عملے نے دیے۔ او پی پی نے تجویز پیش کی کہ اے ایف بی والے بذات خود یہ سوالات براہ راست ان لوگوں سے پوچھ لیں جو خود اور نگی کے محلوں میں یہ کام انجام دے چکے ہیں۔

اپنی مدد آپ کی بنیاد پر بچھائی ہوئی نکاس کی لائنوں کی دیکھ بھال علاقے کے لوگ خود کرتے ہیں: مین ہولوں کے ڈھکن تیار کیے جا رہے ہیں

اس مدت میں او پی پی نے آبادی کے سیکٹر جی، سی او آئی کی اے گلیوں کے لیے ابتدائی نالیوں کے ۲۶۷۷۷ رواں فٹ اور ثانوی نالیوں کے ۳۸۶۸ رواں فٹ کے پلان اور تخمینے پیش کیے۔ ابتدائی نالیاں بنانے کی لاگت کا تخمینہ ۱۱۶،۲۶۷ روپے تھا۔

منظور کالونی کی کیمونٹی تنظیموں نے وارڈ کونسلر سے رابطہ کیا اور پلان پیش کر کے بتایا کہ لوگ خود اپنی گلیوں میں نکاس کی نالیاں بنانے اور اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں، بس آپ ثانوی نالیاں بنوا دیں۔ کونسلر نے کہا کہ لوگ از خود جو نالیاں بنائیں گے وہ کام نہیں دیں گی کیونکہ لوگوں کو تکنیکی معلومات نہیں ہیں۔ اس کو بتایا گیا کہ لوگ یہ کام او پی پی کی تکنیکی رہنمائی میں کریں گے۔ اس نے مقامی تنظیموں کے نمائندوں سے کہا کہ دیکھتے ہیں کیا کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی میٹنگ میں کونسلر نے بتا دیا کہ اس کے پاس زیر زمین نالیوں پر خرچ کرنے کے لیے بجٹ نہیں اور اے ایف بی کے اراکین کا اس کے پاس آنا فضول ہے۔ اے ایف بی کے کمیٹی ممبروں اور کرسچین اور جاٹوں کی تنظیم کے نمائندوں کی ایک میٹنگ طلب کی گئی اور اکثریت کی رائے سے یہ طے کیا گیا کہ لوگ ثانوی نالیوں کی تعمیر کا خرچ بھی خود ہی برداشت کریں کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ تخمینوں پر نظر ثانی کی گئی اور ثانوی نالیوں کی لاگت ہر گھر پر تقسیم کی گئی تو فی گھر ۱۰۰ سے ۱۵۰ روپے تک خرچ آیا۔

لوگوں میں اعلیٰ درجے کا میل ملاپ اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ دیکھنے میں آیا جو اس بات کا مظہر تھا کہ وہ خود ہی اپنے مسائل کے حل کے لیے کام کرنے کو تیار ہیں۔ اسی میٹنگ میں تمام تنظیموں کے نمائندوں نے ایک اور فیصلہ کیا کہ پہلے ثانوی نالیاں بنائی جائیں۔ تمام گلیوں کے نمائندوں کی میٹنگ بلائی گئی اور کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی گلیوں سے اس مقصد کے لیے رقم جمع کریں۔

ستمبر ۱۹۹۰ میں او پی پی کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں اے ایف بی نے بتایا کہ ثانوی نالیوں کی تعمیر میں درکار رقم کا ۵۰ فی صد جمع ہو چکا ہے اور وہ پہلے ثانوی نالیاں تعمیر کریں گے۔ او پی پی نے اس خیال کی تعریف کی اور کہا اس طرح گلیوں کے مکینوں پر جلد سے جلد اپنی گلی کی نالی تیار کرنے کے لیے سماجی دباؤ ڈالا جا سکے گا اور تکنیکی اعتبار سے ہر گلی کی نالی کی گہرائی اور ڈھلان کا تعین کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔

علاقے کی کیمونٹی تنظیموں اور اے ایف بی کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں او پی پی نے محسوس کیا کہ دیگر دو تنظیموں کے رویہ کی وجہ سے مسیحی برادری اس ساری کارروائی سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ نکاس کے نظام کے بہاؤ کی طرف کے باسی مسیحی برادری کو اپنے منصوبے میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے مین نالے پر بہت زیادہ بوجھ پڑے گا۔ وائی سی ڈبلیو ایس نے بھی اس منصوبے سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ ان کو بھی نظر آ گیا تھا کہ گندی کے نکاس کا مقام

ان کے علاقے سے دور تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے ان کو دوسروں کی نسبت زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ ایک سماجی اور سیاسی کارکن انور بلوچ نے وائی سی ڈبلیو ایس کے صدر رشید گل کے ساتھ مل کر نکاس کے متبادل مقام کی تلاش شروع کی اور انھیں ایک ۳۳ انچ قطر کا ٹرنک نالہ دریافت کرنے میں کامیابی ہوئی جو ان کے محلّے سے گزرتا تھا اور ملیر ندی میں فضلہ پہنچاتا تھا۔ انھوں نے اپنے نکاس کے نظام کو اس نالے سے منسلک کر دیا۔

ثانوی نالیوں کی تعمیر کا کام ستمبر ۱۹۹۰ میں شروع ہوا۔ اس کام کے دوران دو بڑے مسئلے ابھرے۔ ابتدا میں او پی پی نے مقامی تنظیموں کے نمائندوں کو مشورہ دیا تھا کہ قدرتی نالے کو ۲ سے ۳ فٹ تک گہرا کیا جائے تاکہ ثانوی نالیاں ایک خاص گہرائی تک بنائی جاسکیں، مگر نالی ڈالنے کے دن معلوم ہوا کہ او پی پی کے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ تنظیموں نے او پی پی کو یقین دلایا کہ نالے سے مٹی نکال دی جائے گی۔ صورت حال سے نپٹنے کے لیے متفقہ طور پر طے کیا گیا کہ نالی کو نالے سے آگے اس مقام پر ڈالا جائے جو اتنا گہرا ہے کہ نالیوں کو معقول نشیب مل جائے۔

تنظیموں کے نمائندے تخمینے میں دیے گئے پائپ ڈالنے کے نرخوں سے الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے فی پائپ کے حساب سے ڈالنے کی مزدوری دے کر مزدور لگانے کا منصوبہ بنایا جب کہ او پی پی کے تخمینے میں فی رواں فٹ کے حساب سے مزدوری رکھی گئی تھی۔ انھوں نے او پی پی سے کہا کہ پائپ ڈالنے کے نرخ بہت کم رکھے گئے ہیں اور اتنی مزدوری پر کام کرنے والے نہیں ملتے۔

اس غلط فہمی کو دیکھتے ہوئے تنظیموں کے نمائندوں نے مشورہ دیا کہ دو کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ایک حساب کتاب کے لیے اور دوسری نگرانی کے لیے۔ اکاؤنٹ کمیٹی کے ذمے مکینوں سے رقم جمع کرنا، سامان خریدنا اور حساب کتاب رکھنا کیا گیا۔ اس کمیٹی نے ہر گلی کے مکینوں سے اپنا اپنا لین منیجر منتخب کرنے کو کہا۔ بعض صورتوں میں لین منیجر رقم اکٹھا کرنے کے بعد کمیٹی کے پاس جمع کرا دیتے تھے۔ دیگر لین منیجروں کے پیچھے کمیٹی کو بھاگنا پڑتا تھا کہ جلدی رقم اکٹھا کریں۔ رقم اکٹھا کرنے میں دشواری کے کئی اسباب تھے۔ مثلاً ایک آدمی کے کئی کئی پلاٹ تھے اور وہ ان تمام کے لیے رقم دینے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔ اکثر مکین کرائے پر رہتے تھے، اس لیے رقم دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ چند پلاٹ خالی پڑے تھے۔ ان تمام دشواریوں پر قابو پانے کے لیے تنظیموں نے آبادی کے مالداروں سے زیادہ رقم وصول کرنے کا فیصلہ کیا۔

نگران کمیٹی کا کام موقعے پر جاری کام کی نگرانی کرنا اور مزدوروں کا سنبھالنا تھا۔ اکتوبر ۱۹۹۰ میں ہونے والی میٹنگ میں تنظیموں نے فیصلہ کیا کہ ورکس کمیٹی کے رکن محبت خان کو اس کام کی تربیت دلوائی جائے۔ انھوں نے سرگرمی سے اس عمل میں حصہ لیا اور او پی پی کے تکنیکی کارکن نے (جو اس منصوبے پر مقرر کیا گیا تھا) ان کو نکاس لائنوں کی تعمیر اور اس کی نگرانی کے بارے میں تربیت دی۔ تربیت کی تکمیل کے بعد اس کام کے انصرام اور نگرانی کی کل ذمہ داری ان کو سونپ دی گئی۔ جیسے ہی او پی پی نے باقاعدہ نگرانی ختم کی محبت خاں نے چارج لے لیا۔ اب تمام ثانوی نالیاں مکمل ہو چکی ہیں اور ۸۵ گلیوں کو ان سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ان ۸۵ گلیوں میں سے ۷۵ محبت خاں کی نگرانی میں بنی ہیں۔ لوگوں کے کل ملا کر ۱،۵۶۰،۰۰۰ روپے اس پر خرچ ہوئے ہیں۔

محبت خان پہلے تعمیراتی ٹھیکیدار تھے اس لیے سینیٹری فٹنگ کے بارے میں جانتے تھے۔ او پی پی کے تکنیکی کارکن سے ایک ماہ کی تربیت لینے کے بعد ان کی پہلی مہارتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اب وہ ڈھلان چیک کرنے کے لیے اسپرٹ لیول استعمال کر سکتے ہیں، مناسب جوڑ لگا سکتے ہیں اور مطلوبہ ڈھال پر نالی کو سیٹ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے او پی پی کے تیار کردہ مین ہول ڈھکنوں کے ڈیزائن میں بھی تبدیلیاں کی ہیں، ان کی موٹائی ۴ سے بڑھا کر ۶ انچ کر دی ہے اور بیرونی سرے پر فولادی حلقے کا اضافہ کیا ہے۔ یہ مین ہول کے ڈھکنوں کی مضبوطی میں اضافے کے لیے کیا گیا ہے جو پانی کے ٹینکر گزر جانے سے اکثر ٹوٹ جاتے تھے۔

۱۹۹۱ میں اے ایف بی کو آکس فیم کی طرف سے سروے کے آلات، اوزار اور مین ہول کے سانچے خریدنے کے لیے ۳۷،۰۰۰ روپے کی مالی امداد ملی۔ اس کے بعد اے ایف بی نے ۱۶۰ کلو میٹر دور حیدر آباد ڈویژن میں واقع بچل خان گوٹھ کے مکینوں کے لیے نکاس کی لائنوں کی تعمیر میں مدد دی اور برائے نام حق خدمت وصول کیا۔ اس بستی میں ۳۰۰ مکانات ہیں۔ بستی والوں نے بارہ گلیوں میں زیر زمین نکاس کی لائنیں ۲۸،۰۰۰ روپے کی لاگت سے محبت خان کی نگرانی میں تعمیر کروائیں۔ اس کام کے دوران ہی ایک مقامی شخص کو تربیت دی گئی تاکہ باقی ماندہ نکاس کی لائنوں کی تعمیر کے کام کی آزادانہ نگرانی کر سکے۔

۱۹۹۲ میں اے ایف بی نے مزید ثانوی نالیوں کی تعمیر کے لیے جن کی پیمائش ۲،۷۹۰ رواں فٹ تھی او پی پی سے نقشہ اور تخمینہ تیار کرنے کی درخواست کی۔ اس کام کی لاگت کا اندازہ ۱،۲۰۱،۱۹۵ روپے تھا۔ یہ ثانوی نالیاں ۳۶ گلیوں کے لیے گندگی کے نکاس کے مقام تک پہنچنا ممکن بنا دیں گی۔ پہلے اے ایف بی کا منصوبہ تھا کہ ثانوی نالیاں کے ایم سی بنا کر دے مگر اب طے کر لیا ہے کہ کمیونٹی کو متحرک کر کے اپنی مدد آپ کے تحت خود ہی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچائے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ او پی پی کا تیار

کردہ پلان اور تخمینہ جب ۱۹۹۳ میں زیڈ ایم سی ساؤتھ کو پیش کیا گیا تو اس کو قبول نہیں کیا گیا اور کارروائی کے لیے کراچی واٹر بورڈ کے محمود آباد ڈویژن کے ایگزیکٹیو انجینئر کو بھیج دیا گیا۔ محبت خان اور سیور یج کمیٹی کے ایک یا دو ممبران ایگزیکٹیو انجینئر کے دفتر کے ہفتے میں ایک بار چار ماہ تک چکر لگاتے رہے۔ اس مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر اسٹاف کو لیولز کی پیمائش کے لیے بھیجا گیا۔ ڈیزائن اور تخمینہ پیش کیا گیا۔ اس ساری کارروائی میں چار ماہ لگ گئے مگر تب ہی اے ایف بی کو اطلاع دی گئی کہ کراچی واٹر بورڈ کے پاس یہ کام کروانے کے لیے فنڈز نہیں ہیں۔ صورتِ حال سے مجبور ہو کر اے ایف بی نے اپنے کمیٹی ممبران کی میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں اتفاق رائے سے طے کیا گیا کہ یہ کام بھی اپنی مدد آپ کے تحت کیا جائے۔

اکتوبر ۱۹۹۳ میں لوگوں کو ترغیب دلانے اور متحرک کرنے کے لیے اے ایف بی نے ایک مہم چلائی جو پندرہ دن جاری رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پارلیمانی انتخابات ہونے والے تھے اس لیے چند سیاسی دلالوں نے اپنی مدد آپ کے تصور کی مخالفت شروع کردی اور وعدہ کیا کہ الیکشن کے بعد وہ کے ایم سی سے یہ کام کروا کردیں گے۔ نتیجتاً لوگوں کو متحرک کرنے کی یہ مہم پھیکی پڑ گئی۔ تاہم کمشنر کراچی ڈویژن کے ساتھ ہونے والی ایک میٹنگ میں جو جنوری ۱۹۹۵ میں ہوئی تھی ایگزیکٹیو انجینئر نے اس بات سے اتفاق کیا کہ منظور کالونی کی گلیوں اور بیرونی نالیوں کی حفاظت کے لیے ۱۹۹۵-۱۹۹۶ کے بجٹ میں رقم مختص کی جائیگی۔

۱۹۹۰ میں ایس کے کے اے نے کے ایم سی کو ۸۳ لاکھ روپے منظور کالونی میں نکاس، پانی اور سڑکوں کے انفراسٹرکچر کو ترقی دینے کے لیے دیے تھے۔ بجٹ سال کے اندر اندر یہ رقم پوری طرح استعمال نہیں کی گئی اور ساقط ہو گئی۔

اس عرصے میں اے ایف بی نے نالے سے مٹی نکالنے کے مسئلے کو ترک نہیں کیا جس کو اب تک کے ایم سی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ اے ایف بی نے او پی پی سے درخواست کی ہے کہ نالے کی بہتری کے لیے ڈیزائن اور تخمینہ تیار کریں۔ او پی پی نے نالے کے ۲۳۰۰ رواں فٹ حصے کو تعمیر کرنے کی ایک اسکیم تیار کی ہے۔ اسکیم میں نالے کے فرش کو پختہ کرنا، اس کے دونوں اطراف کنکریٹ کی دیواریں بنانا، نالے کے اوپر سلیب لگانا اور نالے کی تہہ کے ساتھ ایک ٹرنک نالہ ڈالنا سب کچھ شامل ہے۔ اس پوری اسکیم کی لاگت کا تخمینہ ۱۴ لاکھ روپے ہے۔ اے ایف بی اور این جی او آر سی کے نمائندوں نے کئی بار میئر سے ملاقاتیں کیں مگر اسکیم کے لیے فنڈ دینے پر انھیں قائل نہ کر سکے۔ کیونکہ اس اسکیم کی لاگت کو پورا کرنا ان کی مالی استطاعت سے کہیں زیادہ ہے اس لیے اے ایف بی نے تہیہ کر لیا ہے کہ اسکیم کی منظوری تک وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اے ایف بی اور این جی او آر سی کے نمائندوں اور متعلقہ سرکاری اداروں کے درمیاں پے در پے ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نالے کی تعمیر کا منصوبہ ورلڈ بینک کی امداد سے ہونے والے کراچی اسپیشل ڈیولپمنٹ پروگرام میں شامل کر لیا گیا ہے۔

لیز اور ریگولرائزیشن

بستی کی مستقلی کے لیے لیز چارجز کے مسئلے پر اے ایف بی کام کر رہی ہے۔ اے ایف بی کی کوششوں سے منظور کالونی کو ریگولرائزیشن کے لیے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایک بار جب کوئی مجاز ادارہ (یہاں ڈائریکٹوریٹ آف کچی آبادی، کے ایم سی) کسی کچی آبادی کو مستقل کرنے کا اعلان کر دیتا ہے تو مستقلی کی اسکیم تیار کی جاتی ہے۔ اس کام کے لیے کچی آبادی کا مکمل زمینی سروے کیا جاتا ہے اور نقشہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس نقشے کے ذریعہ پلاٹوں کی تعداد، علاقے میں زمین کے استعمال کی خصوصیات (کھلی زمینوں سمیت) اور موجود رفاہ عام کی سہولیات کی نوعیت اور سطح کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

مستقلی کے منصوبے میں موجود رفاہی خدمات جیسے فراہمی آب، نکاسی آب، بجلی، گیس اور راہوں کی بہتری اور سدھار کا منصوبہ بھی شامل ہوتا ہے ریگولرائزیشن اسکیم میں کوشش کی جاتی ہے کہ کم سے کم مکینوں کو بے گھر کرنا پڑے۔ مستقل کیے جانے والے علاقے میں مکینوں سے ایک مقررہ مدت کے اندر اندر منصوبے پر اپنے اپنے اعتراضات داخل کرنے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ مکین اپنے اپنے اعتراضات ایک کمیٹی (جس میں ڈائریکٹوریٹ کے افسران شامل ہوتے ہیں) کے سامنے پیش کرتے ہیں اور فیصلے کا انتظار کرتے ہیں۔

آج کل اے ایف بی اس سے متعلق دو دیگر مسائل پر توجہ دے رہی ہے۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اب تک لوگوں نے نکاس کی لائنیں ڈلوانے میں جو رقم خرچ کردی ہے (حالانکہ اس کام کی ذمہ داری کے ایم سی کی تھی) وہ ان لیز اور ترقیاتی چارجز میں سے جو لوگوں سے وصول کیے جائیں گے منہا کی جائے۔ کے ایم سی نے یہ معاملہ کراچی وارڈ کے سپرد کر دیا ہے جہاں اس پر فیصلہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔ اے ایف بی نے یہ مسئلہ محتسب کے سامنے بھی پیش کر دیا ہے۔ محتسب کی عدالت میں اب تک تو محبت خان اور جنرل سیکریٹری ہی پیروی کر رہے ہیں مگر اب وہ پیشہ ور وکیل کی خدمات حاصل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ دوسرا مسئلہ جس کی جانب اے ایف بی توجہ دے رہی ہے منظور کالونی کے سیکٹر جی، ایچ اور آئی، رحمٰن کالونی اور بل ٹاؤن کی بہتری

اور سدھار کے لیے پلان تیار کروانا ہے۔ ان علاقوں کے لیے پلان تیار نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اب تک یہ زمین بورڈ آف ریونیو نے جس کی یہ ملکیت ہے کے ایم سی کے نام منتقل نہیں کی ہے۔ اس کاروائی کو جلد از جلد مکمل کرنے کے لیے اے ایف بی نے ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں۔

کھلی جگہیں

اس علاقے میں تین سے چار ایکڑ پیمائش کا ایک کھیل کا میدان ہے جو کے ایم سی کی ملکیت ہے۔ اس کے اندر فٹ بال کے گول پوسٹس ہیں، کرکٹ پچ ہے، ایک چھوٹا سا کمرہ اور چہار دیواری ہے۔ اس کھیل کے میدان کی دیکھ بھال کے ایم سی کرتی ہے۔ اس میدان میں اگر کچھ باقاعدگی سے ہوتا ہے تو وہ بدھ بازار کا لگنا ہے۔ ۱۹۹۲ میں اے ایف بی نے کے ایم سی کے ایڈمنسٹریٹو ڈائریکٹر بجٹ، مالیات اور ڈائریکٹر پارکس کے ساتھ تین چار میٹنگیں کیں۔ اے ایف بی نے اس میدان کے لیے ایک ترقیاتی پلان پیش کیا۔ اس پلان میں کرکٹ اور فٹ بال اسٹیڈیم، سوئمنگ پول، ڈریسنگ رومز اور چہار دیواری تعمیر کرنے کی تجاویز پیش کی گئی تھی۔ محکمہ نے ڈائریکٹر پارکس سے مجوزہ پلان کا تخمینہ تیار کرنے کے لیے کہا۔ محبت خان اور ایک دو دیگر افراد نے کے ایم سی کے بہت سارے چکر لگائے اور متعلقہ انجینئر کے ساتھ تخمینہ لگانے کے لیے بیٹھے۔

۱۹۹۳ میں اسٹیڈیم کا کام تین حصوں میں ٹینڈر کیا گیا جس میں سے چہار دیواری اور ڈریسنگ رومز کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے تیسرے حصے کا کام تا حال شروع نہیں ہوا ہے کیونکہ ٹھیکیدار کے پچھلے حسابات کے ایم سی نے بے باق نہیں کیے ہیں اور اس نے آگے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ محبت خان نے ٹھیکیدار کو کے ایم سی آفس میں پکڑا تو ٹھیکیدار نے ۸۰ لاکھ روپے کے بل دکھائے جو اس وقت تک کے ایم سی کو ادا کرنے تھے۔ اس نے محبت خان سے وعدہ کیا کہ وہ کام چالو کر دے گا بشرطیکہ محبت خان اس رقم کا ۱۰ فی صد ہی کے ایم سی سے دلوا دے۔ نئے ایڈمنسٹریٹر کے چارج لے لینے تک کام شروع نہ ہو سکے گا۔ موجودہ ایڈمنسٹریٹر نے نئی پالیسی رائج کی ہے کہ جن پروجیکٹس کی تکمیل کی مقرر کردہ مدت کے اندر ۳۵ فیصد بجٹ بھی استعمال نہیں ہو گا وہ خود بخود منسوخ ہو جائیں گے۔ اس پالیسی کے تحت کھیل کے میدان اور اسٹیڈیم کا کام بھی منسوخ ہو گیا۔ اے ایف بی از سر نو جدوجہد کر رہی ہے کہ یہ کام دوبارہ منظور ہو اور اس سلسلے میں ایڈمنسٹریٹر سے چند ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔

ٹرانسپورٹ

منظور کالونی میں ٹرانسپورٹ کے لیے زیادہ تر منی بسیں استعمال ہوتی ہیں۔ بستی کو شہر کے بڑے بڑے علاقوں سے ملانے کے لیے آٹھ روٹوں پر منی بسیں چلتی ہیں کورنگی ایکسپریس وے کی تعمیر کے بعد جو کہ منظور کالونی کے حاشیے کے ساتھ ساتھ ہے منی بسوں نے آبادی کے اندر آنا بند کر دیا جس کی وجہ سے منظور کالونی میں رہنے والوں کو منی بس پکڑنے کے لیے کافی فاصلہ چل کر آنا پڑتا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ۸ مارچ ۱۹۹۳ کو اے ایف بی ٹرانسپورٹ کمیٹی نے تمام منی بس روٹوں کے مالکان کو تحریری دعوت بھیجی کہ وہ ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ کو اے ایف بی آفس میں آکر میٹنگ میں شریک ہوں۔ دعوت نامے دستی تقسیم کیے گئے۔ میٹنگ میں منی بس مالکان نے منظور کالونی کے اندر سڑکوں کی بگڑتی حالت کی وجہ سے گاڑیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۳ کو ڈی سی ساؤتھ اور سیکریٹری، ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی (آر ٹی اے) سے دوبارہ شکایت کی گئی۔ سیکریٹری آر ٹی اے نے اسی دن تمام بس مالکان کو طلب کیا۔ اس میٹنگ میں ڈی سی ساؤتھ بھی موجود تھے۔ دونوں نے منی بس مالکان کو اپنی گاڑیاں منظور کالونی کے اندر چلانے کا حکم دیا۔ اے ایف بی نے ایک ٹریفک چیک پوسٹ کی بھی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ منی بسیں منظور کالونی کے اندر چلنے لگیں مگر چند ماہ بعد پھر سے رک گئیں۔ ٹرانسپورٹروں نے سڑکوں کی خستہ حالی کا مسئلہ اٹھایا۔ اے ایف بی نے اس بابت ان لوگوں سے گفت و شنید بھی کی مگر منظور کالونی کے اندر منی بسیں چلوانے میں ناکام رہی۔

جنوری ۱۹۹۵ میں انجمن فلاح و بہبود نے اسی مسئلے کے بارے میں محمود آباد (جہاں منظور کالونی کا علاقہ لگتا ہے) کے ٹریفک انچارج کے نام مراسلہ بھیجا مگر ابھی تک مسئلہ حل نہیں ہوا اور جوں کا توں ہے۔

سڑکیں

۱۹۸۹ میں محبت خان نے سڑکوں اور گلیوں کو پختہ کروانے میں ذاتی دلچسپی لی تھی۔ اے ایف بی کی تمام ورکنگ کمیٹیوں کے چیئرمین کی حیثیت سے وہ ہر ہفتے تین چار بار زیڈ ایم سی کے ایڈمنسٹریٹر سے جا کر مل آتے تھے۔ اس طرح محبت خان نے دفتر کے تقریباً ہر اہلکار سے ذاتی تعلقات پیدا کر لیے۔ اسی بنیاد پر انھوں نے زیڈ ایم سی کے ایڈمنسٹریٹر سے خود چل کر منظور کالونی کی سڑکوں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لیے کہا۔ محلے کے کونسلر کو اے ایف بی کی اس کاروائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ

اے ایف پی کے ممبران سے اس کے سیاسی اختلافات تھے۔

کونسلر نے رحمان کالونی اور بل ٹاؤن کی تمام سڑکوں اور گلیوں کو پختہ کروادیا تھا مگر منظور کالونی کے تمام سیکٹروں کے لیے بقول اس کے بجٹ نہیں تھا۔ رحمان کالونی اور بل ٹاؤن کی سڑکوں کو کونسلر نے کے ایم سی فنڈ سے اپنے ذاتی تعلقات استعمال کر کے اس وقت پختہ کروادیا تھا جب ۱۹۹۱ میں وہ کونسل کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ کالونی کے مختلف سیکٹروں میں ادھر ادھر کے فنڈ استعمال کر کے کیا گیا یہ کام مئی ۱۹۹۴ میں ہونے والی بارشوں میں تباہ ہو گیا کیونکہ غیر معیاری تھا۔ فی الحال ڈیڈا یم سی ساؤتھ کی کونسل کے چیئرمین نے ۳۰۰۰ رواں فٹ سے زیادہ طویل ایک شاہراہ کی منظوری دی ہوئی ہے جو زیر تعمیر ہے۔ تین دیگر ذیلی شاہراہیں بھی جن کی لمبائی ۳۶۰۰ رواں فٹ ہے زیر تعمیر ہیں۔ منظور کالونی کو کے اے ای سی ایچ ایس سے ملانے والی ایک شاہراہ کراچی ایڈمنسٹریشن ویمن ویلفیئر سوسائٹی اور اے ایف پی کی مشترکہ کوششوں سے بنائی جارہی ہے۔ اس شاہراہ کی لمبائی کوئی ۲۷۰۰ رواں فٹ ہے۔

محبت خاں نے مطالبہ کر کے کے ایم سی سے تمام شاہراہوں کے دونوں کناروں پر کھلی نالیاں منظور کرائیں تاکہ پانی کھڑا ہو کر شاہراہوں کو تباہ نہ کر سکے۔ کل ۷۵۰ رواں فٹ بیرونی نالیاں زیر تعمیر ہیں۔

ایک شخص ٹرانسپورٹ تک پہنچنے کے لیے پی پی آر جی حفاظتی ریلنگ کو پھلانگ کر جا رہا ہے

صحت کے حالات

اس علاقے میں کوئی سرکاری اسپتال نہیں ہے۔ سال میں ایک بار کے ایم سی کی طرف سے ٹیکہ لگانے والی گشتی ٹیم آجاتی ہے وہ بھی اے ایف پی کی کوشش اور زور ڈالنے سے۔ کوڑے کے ڈھیروں اور سڑکوں پر کھڑے پانی کے اوپر سال میں ایک دو بار کیڑے مار دوائیوں کا چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے جو قطعی بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ صحت سے متعلق تکالیف میں عام طور پر لوگ باگ شہر کے سرکاری اسپتالوں سے رجوع کرتے ہیں۔ جن لوگوں میں استطاعت ہوتی ہے وہ پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکس میں جاتے ہیں جو کالونی سے کچھ فاصلے پر واقع ہیں۔

حفظان صحت کے منافی حالات موجود ہیں۔ کھلے نالے میں گندا پانی بہتا رہتا ہے اور ملیر ندی کے قرب کی وجہ سے جہاں شہر کے متمول علاقوں کا کوڑا کرکٹ جلایا جاتا اور اس کا دھواں اور بخارات بستی پر راست حملہ کرتے ہیں۔ قریب کی ریفائنری سے نکلنے والی آلودگی بھی علاقے پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسی طرح بستی میں سے گزرنے والی ریلوے لائن بھی آلودگی کا باعث ہے۔ چند مکانات میں درخت لگے ہیں مگر یہ ناکافی ہیں اور لوگوں کا خیال ہے کہ سڑکوں کے ساتھ ساتھ درخت لگانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

بچوں میں عام بیماریاں اسہال اور سانس کی متعدی بیماریاں ہیں۔ شاید اس کا سبب نامناسب فراہمی آب اور علاقے میں سو سے زیادہ لکڑی اور فرنیچر کے کارخانوں کی موجودگی ہو۔ سڑکیں پختہ نہ ہونے کی وجہ سے گرد بھی عام مقدار سے زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ مریض کی دیکھ بھال عورتوں کا کام ہے اس لیے بچوں کے بار بار بیمار پڑنے سے عورتوں کا کافی وقت تیمارداری پر خرچ ہوتا ہے اور یوں ان پر گھریلو کاموں کا بوجھ مزید بڑھ جاتا ہے۔

علاج معالجے پر فی کنبہ ماہانہ اوسط خرچ کوئی ۵۰۰ سے ۸۰۰ روپے تک ہے جو روز بہ روز بڑھ رہا ہے۔ کسی ایم این اے یا ایم پی اے نے اپنے حلقے کے لیے دیے گئے فنڈز کے ذریعے صحت سے متعلق مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

صحت کی نگہداشت میں غیر رسمی سیکٹر بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ منظور کالونی میں ۸۰ نجی مطب ہیں جن میں سے تین میں حفاظتی ٹیکے لگانے کی سہولیات ہیں اور صرف ۶ سند یافتہ ڈاکٹروں کی ملکیت ہیں جنھوں نے اپنے اپنے گھروں میں مطب قائم کر رکھے ہیں۔ باقی سب دکانوں میں قائم ہیں جنھیں ڈسپنسر اور عطائی چلا رہے ہیں۔ سند یافتہ ڈاکٹروں کے مطب میں مریضوں سے ہر بار ۳۰ روپے لیے جاتے ہیں جبکہ دیگر ہر مریض سے ہر باری کے ۵ تا ۱۰ روپے وصول کرتے ہیں۔ ان ۸۰ دواخانوں میں سے چار اے ایف پی کے تحت چلتے ہیں اور چند دوسرے اے ایف پی کے کھاتے

بیچتے اراکین یا علاقے کے مالدار باشندوں کے چندوں سے چلتے ہیں۔

مستقبل کے لیے اے ایف بی کا منصوبہ ہے کہ ملیر ندی میں کوڑا جلانا بند کروادیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے کے ایم سی کے ایڈمنسٹریٹر اور ڈائریکٹر ہیلتھ پر دباؤ ڈالا ہے۔ اس موضوع پر اے ایف بی نے سندھ کے وزیر اعلیٰ کو بھی لکھا

انجمن فلاح و بہبود کی کوششوں سے تعمیر ہونے والی ایک سڑک

ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کو پیش کردی کہ کوڑا بستی سے فاصلے پر جلایا جاتا ہے اس لیے نقصان دہ نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ زیڈ ایم سی ساؤتھ کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاکروبوں کو وہاں کوڑا جلانے سے روکے۔ اسی ماہ اے ایف بی کو ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی طرف سے مراسلہ ملا جس میں کہا گیا تھا کہ متعلقہ محکمے کو ہدایت دے دی گئی ہے کہ "وجہ

ہے اور اس کی نقول متعلقہ محکموں کے سربراہوں کو بھی بھیجی ہیں جن میں کمشنر کراچی، ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی، ڈائریکٹر ہیلتھ کے ایم سی، انسپکٹر جنرل پولیس اور کلفٹن کنٹونمنٹ بورڈ کے ایگزیکٹو آفیسر شامل ہیں۔

اے ایف بی نے دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کمشنر کراچی سے تمام متعلقہ محکموں کے سربراہوں کی میٹنگ بلانے کی درخواست کی۔ اس میٹنگ کی کارروائی کی رپورٹ اے ایف بی نے حاصل کی اور اب اس مسئلے کی پیروی میں اس کو ہتھیار بنالیا ہے۔ ۱۹۹۱ میں زیڈ ایم سی ساؤتھ کے چیئرمین کے نام خط لکھا گیا جس نے ہیلتھ آفیسر کو حکم دیا کہ ملیر ندی میں کوڑا جلانا بند کیا جائے۔ اس حکم کی پابندی صرف ڈیڑھ ماہ کی گئی۔ جب کوڑا دوبارہ جلایا جانے لگا تو ۱۹۹۲ میں اے ایف بی نے دوسرا خط کے ایم سی کے ڈائریکٹر ہیلتھ کے نام لکھا۔ اس نے بھی کوڑا نہ جلانے کا حکم دیا۔ گو اس کے حکم پر عمل درآمد آج تک نہیں ہوا کیونکہ کارکنوں کی یونین بہت طاقت ور ہے اور ڈائریکٹر ہیلتھ ڈرائیوروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتا جو ملیر ندی میں ہی کوڑا پھینکنے پر مصر ہیں۔

محبت خان صفائی کمیٹی کے دیگر ممبران کے ساتھ ہر مہینے کم سے کم دس بار کے ایم سی آفس جاتے ہیں مگر کوئی پیش رفت نہیں ہوتی۔ اے ایف بی نے ہیلتھ آفیسر اور ڈائریکٹر ہیلتھ کو بھیجے گئے خطوط کی بابت کمشنر کراچی کو بھی خط بھیجا۔ کمشنر کے دفتر سے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ جنوری ۱۹۹۵ میں اے ایف بی نے وزیر اعلیٰ کو اس خط و کتابت سے آگاہ کیا جنھوں نے ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کو اور اس نے چیف فائر آفیسر کو حکم دیا کہ اس معاملے کی چھان بین کریں۔ چیف فائر آفیسر نے اپنی رپورٹ

شکایت کا ازالہ کرے۔" اے ایف بی کی طرف سے پانچ سال سے جاری جدوجہد کے باوجود کوڑا اب بھی ملیر ندی میں پھینکا اور جلایا جاتا ہے۔

اے ایف بی کو یقین ہے کہ اوپی پی نے نالے کو بہتر بنانے کے لیے جو منصوبہ پیش کیا ہے جس میں نالے کو مٹی نکال کر گہرا کرنا، اس کے کناروں پر پتھروں کی چنائی کرنا اور اس کے دونوں اطراف درخت لگانا شامل ہے نالے سے پیدا ہونے والے مسئلوں اور اسہال، ملیریا، نمونیہ، دمہ اور تپ دق جیسی بیماریوں کو کم کرنے میں مددگار ہوگا۔ اے ایف کی طبی کمیٹی نے ۱۹۹۶ میں جو سروے کیا تھا اس کے مطابق بستی کا ہر دسواں فرد ان میں کسی نہ کسی بیماری کا شکار ہے۔ مزید بر آں امراض قلب، خون کا دباؤ اور ذیابطیس جیسے امراض میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

حکومت سندھ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت منظور کالونی اور اعظم بستی (جو متصل ہے) کے درمیان ایک پچاس بستروں کا سرکاری اسپتال زیر تعمیر ہے۔ یہ بستی والوں کے لیے ناکافی ہوگا کیونکہ اس چھوٹے سے اسپتال کو ۳ لاکھ نفوس کی ضروریات پوری کرنی ہوں گی۔

سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانا

فی الحال سوکھے کچرے کو ٹھکانے لگانے کی صورت بہت تشویشناک ہے۔ منظور کالونی کے لیے کے ایم سی کی طرف سے ۳۸ خاکروب مقرر کیے گئے ہیں جن میں سے صرف ۱۸ سے ۲۰ تک کام پر آتے ہیں۔ اے ایف بی نے کے ایم سی سے میٹنگیں کر کے علاقے کے لیے مزید ۶۰ خاکروبوں کے تقرر کی مانگ کی مگر نئی بھرتیوں پر

حکومت کی پابندی کی وجہ سے اس مطالبہ پر غور نہیں کیا گیا۔

اے ایف بی نے خود ہی ۱۲ خاکروبوں کا انتظام کیا تاکہ وہ گھر گھر جاکر گندگی اٹھائیں اور فی گھر ۲۰ روپے ماہانہ اجرت مقرر کردی۔ اب اے ایف بی کی مقرر کردہ اجرت پر کوئی بھی گھر خاکروب کی خدمت حاصل کرسکتا ہے۔ خاکروب گھروں سے گندگی اکٹھا کرکے ہاتھ گاڑیوں کے ذریعے کے ایم سی کی طرف سے مہیا کی گئی ٹرالی میں ڈال دیتے ہیں۔ جب یہ ٹرالی بھر جاتی ہے تو وہاں سے اٹھالی جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری خالی رکھ دی جاتی ہے۔ اے ایف بی کی صفائی کمیٹی کے ایم سی کی طرف سے ان ٹرالیوں کے اٹھائے جانے پر نظر رکھتی ہے۔

کے ایم سی ہیلتھ ڈپارٹمنٹ کی غفلت کے باعث ایک گلی میں گندگی جمع ہے

لوگوں نے خود بھی ایسا نظام قائم کرلیا ہے جس میں خاکروب ماہانہ اجرت پر گھروں سے گندگی اُٹھاکر قریب ترین کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آتے ہیں۔ اکثر تو یہ نالے میں پھینکا جاتا ہے۔

آئندہ کے منصوبے

اے ایف بی کی کاوشوں کے نتیجے میں ۸ لاکھ روپے کی لاگت سے ۲۲۰۰ رواں فٹ سڑک کی تعمیر کا کام جلد ہی انتظامی منظوری کے بعد شروع ہو جائے گا۔ اور اگلے بجٹ میں دیگر سڑکیں اور ۶۰۰۰ رواں فٹ کھلی نالیاں جن کا تخمینہ ۱۸ لاکھ روپے ہے بنائی جائیں گی۔

اے ایف بی کی راہ کی رکاوٹیں

دیگر کمیونٹی تنظیموں کے اپنے مفادات: اگر کوئی کام اے ایف بی کے زیرِ اہتمام انجام پاتا ہے تو دیگر تنظیمیں اس میں کیڑے نکالتی ہیں اور کام رکوانے کی کوشش کرتی ہیں۔

سیاستدانوں کے ذاتی مفادات: جب واٹر سپلائی والا مقدمہ اے ایف بی نے محتسب کی عدالت سے جیتا تو عرفان اللہ مروت پارلیمانی الیکشن لڑ رہے تھے اور اے ایف بی کی اس کامیابی کا سہرا انہوں نے اپنے سر باندھ لیا۔ اس طرح اے ایف بی کی کارگزاری پر خاک ڈال کر اس کی جڑ کاٹ دی گئی۔

ایسے ہی ایک اور واقعے میں کے ایم سی مشاورتی کونسل کے موجودہ رکن جن کو حکومت نے نامزد کیا ہے ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ انھوں نے سڑک کی تعمیر کے ٹینڈر رکوادیے ہیں اور وہ اس کام کو ان اسکیموں میں شامل کروانے کی کوشش کررہے ہیں جن کا انحصار اس فنڈ پر ہے جو صوبائی حکومت نے انھیں استعمال کے لیے دیا ہے۔ نتیجتاً کام میں دیر ہو رہی ہے اور یہاں کے مکین تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

منظور کالونی کے لیے مخصوص واحد گاربیج ٹرک، کورنگی ایکسپریس وے پر رکھا ہوا ہے

محبت خان نے کے ایم سی کو تجویز دی ہے کہ ٹینڈر کیمونٹی تنظیموں کے نام سے جاری کیے جائیں اور ایسے قواعد وضع کیے جائیں کہ فنڈز پھر کسی دوسری پارٹی کے نام منتقل نہ ہوں۔ مزید انھوں نے تجویز پیش کی کہ کیمونٹی تنظیموں کو حکومت اختیارات دے تاکہ وہ ایم پی اے، ایم این اے، کونسلروں اور دیگر سیاسی دلالوں کی مداخلت سے آزاد ہو کر کام کرسکیں۔

قبضہ گیر: سڑکوں، کوچوں اور کھلے میدانوں میں غیر قانونی طور پر بس جانے والے عدالتوں سے حکم امتناعی لے لیتے ہیں اور جاری ترقیاتی کاموں میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اس علاقے کی زمین مافیا عموماً ایسے کاروبار کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

قانون نافذ کرانے والے ادارے: جب کبھی لوگ نکاس یا پانی کی لائن ڈالنے کے لیے کسی سڑک یا گلی کی کھدائی کرتے ہیں تو پولیس آ کھڑی ہوتی ہے اور ان کو رشوت دینا پڑتی ہے تاکہ کام جاری رکھا جاسکے۔

کے ایم سی کے ٹرک سے جمع شدہ کچرا دریائے ملیر میں جلایا جارہا ہے

دسویں جماعت تک اور دو اسکول آٹھویں جماعت تک قائم کیے۔ انھی میں سے ایک اسکول میں لڑکیوں کے لیے دوسری شفٹ لگتی ہے۔ یہ سرکاری اسکول صرف ۲۰ فیصد آبادی کے لیے کافی ہیں۔ ان تین اسکولوں میں سے ایک میں سائنسی مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے لیے تجربہ گاہیں بھی ہیں۔

بجلی منظور کالونی میں ۱۹۷۲ میں آئی۔ سیکٹر آئی کی ۷ اگلیوں کے لیے صرف ایک پی ایم ٹی تھا مگر اب تین پی ایم ٹی ہیں۔ بجلی کی سپلائی میں اضافے اور سپلائی فیل ہونے کی صورت میں متبادل انتظام کے لیے کام جاری ہے۔

۱۹۹۰ میں سندھ کچی آبادی اتھارٹی نے کے ایم سی کو بنیادی سہولیات کی ترقی کے لیے ۸۳ لاکھ روپیہ دیا۔ اس میں سے بہت ہی معمولی رقم استعمال کی گئی اور باقی ماندہ ساقط ہو گئی۔

کے ایم سی کے کچی آبادی ڈائریکٹوریٹ نے حال ہی میں جی، ایچ اور آئی سیکٹروں، رحمان کالونی اور بل ٹاؤن کے لیے ایک طبعی نقشہ مرتب کیا ہے۔ ان سیکٹروں کی بہتری اور سدھار کے لیے منصوبے تیار کیے جارہے ہیں۔ اس سدھار کے منصوبے کی منظوری کے بعد مکینوں کو لیز تقسیم کرنے کا عمل شروع ہوگا۔

کمیونٹی کی طرف سے جب نکاس کی لائنیں بچھانے کا کام مکمل ہوگیا تو نشیبی گلیوں کی بھرائی کے لیے زیڈ ایم سی سائوتھ نے ۱۰۰ ٹرک ملبہ فراہم

بیرونی مداخلت

سرکاری ادارے

کے ایم سی کے سالانہ ترقیاتی منصوبے کے تحت ۱۹۷۴ میں منظور کالونی کے اندر پانی کی تقسیم کا نظام قائم کیا گیا تھا۔ مگر آبادی کے روزافزوں اضافے کی وجہ سے سپلائی مسئلہ ہی رہی اور لوگوں کو دیگر ذرائع استعمال کرنا پڑے۔ ۱۹۹۲ میں جب اے ایف پی نے کراچی واٹر بورڈ کے خلاف صوبائی محتسب کی عدالت سے مقدمہ جیتا تب کہیں کراچی واٹر بورڈ نے سپلائی بحال کی۔ تعلیم کے لیے حکومت نے ایک اسکول

تجاوزات اور کچرا پھینکنے کی وجہ سے قدرتی نالے کی چوڑائی کم ہو گئی ہے

کیا۔ ترغیب دلانے کے لیے کے ایم سی نے ان گلیوں کو پختہ کرادیا جہاں نکاس کی لائنوں کا کام مکمل ہو چکا تھا۔

کے ایم سی نے زیڈ ایم سی ساؤتھ کی معرفت ۳۰۰۰ رواں فٹ لمبی ایک شاہراہ تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کی لاگت سے بنوادی۔ ۳۶۰۰ رواں فٹ لمبی دیگر سڑکیں بھی تعمیر کی جا رہی ہیں۔ پانی کی نکاسی کے لیے ان نئی تعمیر شدہ سڑکوں کے دونوں اطراف کھلی نالیاں بھی بنائی گئی ہیں۔

چار ایکڑ رقبہ میں پھیلا ایک کھیل کا میدان جس میں فٹ بال کے گول پوسٹ، کرکٹ پچ، چھوٹا سا ڈریسنگ روم اور چہار دیواری ہے کے ایم سی کی طرف سے مہیا کیا جا رہا ہے۔ روڈ ٹرانسپورٹ اتھارٹی نے منی بس کے روٹ مقرر کیے ہیں جو منظور کالونی کو شہر کے مختلف حصوں سے ملاتے ہیں۔

صحت کی سہولیات بہت محدود ہیں جن میں فقط کے ایم سی کی حفاظتی ٹیکے لگانے کی گشتی ٹیمیں ہی ہیں۔ حکومت سندھ کی طرف سے منظور کالونی اور اعظم بستی کے درمیاں ایک پچاس بستروں کا اسپتال زیر تعمیر ہے۔

بین الاقوامی ادارے

این جی او آرسی: این جی او آر سی آغا خان فاؤنڈیشن کا ایک پروجیکٹ ہے جس کا مقصد موجود وسائل کے استعمال میں غیر سرکاری تنظیموں کی استعداد کاری میں اضافہ کر کے پاکستان کی ترقی میں ہاتھ بٹانا ہے۔ این جی او آر سی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تربیت، نیٹ ورکنگ، تجزیہ اور دستاویز سازی کو استعمال کرتی ہے۔ منظور کالونی کی ترقی میں اس کے کردار کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

آکس فیم: آکس فیم مالی امداد دینے والا برطانوی ادارہ ہے۔ اے ایف بی کے آکسفیم سے روابط بس خط وکتابت تک محدود ہیں۔ آکسفیم کے نمائندے صرف دو مرتبہ اے ایف بی آئے ہیں اور انھوں نے ایک لیول مشین اور سانچے خریدنے کے لیے مالی امداد دی ہے۔ آکسفیم نے ہی حیدر آباد کے نزدیک واقع بچل خاں گوٹھ کا رابطہ محبت خان سے وہاں نکاس کی لائنیں بچھوانے کی خاطر کروالیا۔

خواتین کا کردار

یہ حصہ نورا فرنانڈس نے لکھا ہے اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی صنوبر بشر اور سلمٰی کے لیے ہوئے انٹرویوز کی مدد سے معلومات میں اضافہ کیا گیا ہے۔

پس منظر

منظور کالونی کے باشندوں کی اکثریت پنجاب سے وارد ہوئی ہے اور موروثی دستکار ذاتوں سے تعلق رکھتی ہے جو مرتبے میں کاشتکار ذاتوں سے کم تر سمجھی جاتی ہے۔ اس طبقے کی تقریباً تمام خواتین پنجاب کے دیہاتوں میں پیدا ہوئیں اور اپنی شادی کے بعد پندرہ بیس سال قبل کراچی آئی ہیں۔ دیہاتوں میں ان کے لیے اسکول نہیں تھے چنانچہ زیادہ تر باقاعدہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ تاہم ان میں سے اکثر نے گھر یا مسجد مکتبوں میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ چند ایسی ہیں جن کو ان کے والدین نے قریب کے قصبوں میں اسکول اور کالج بھی بھیجا تھا۔

تقریباً تمام الگ الگ خاندان ہیں، جن میں بچوں کی تعداد ۲ سے ۶ تک ہے۔

آمدنی اور گھریلو مشاغل سے وابستگی

اے ایف بی کو معلوم نہیں کہ حقیقتاً کتنی خواتین آزادانہ یا اپنے مردوں کے شانہ بشانہ آمدنی پیدا کرنے والی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ ہم کو بتایا گیا کہ چند خواتین بستی کے باہر جاکر بھی کام کرتی ہیں۔ شاید یہ بات درمیانی یا کم آمدنی والے طبقے کے بارے میں ہو کہ غریب کنبوں کی بہت سی خواتین بستی کے باہر آس پاس کی زیادہ آمدنی والی کے ڈی اے ای سی ایچ ایس اور دیگر آبادیوں میں جاکر گھریلو ملازمت کرتی ہیں۔

خواتین میں سب سے نمایاں مشغلہ سلائی ہے۔ اکثر تو اپنے گھر پر ہی کپڑے سی کر اپنے مردوں سے زیادہ کماتی ہیں۔ تہواروں کے زمانے میں سلائی سے کمائی بہت ہو سکتی ہے۔

بہت سی خواتین نے جن کا انٹرویو لیا گیا یہ بتایا کہ مکان کی تعمیر میں زیادہ رقم انھوں نے لگائی تھی اور اس کے ڈیزائن اور بعد میں ہونے والے اضافے کے بارے میں ان سے مشورہ لیا گیا تھا تاہم حتمی فیصلہ مردوں ہی کا تھا۔

منظور کالونی میں ان خواتین کو جو کمائی کے مشاغل سے وابستہ ہیں بچوں کی دیکھ بھال میں خاندان کی بڑی بوڑھیوں اور بڑے بچوں سے خاصی مدد مل جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ گھریلو کام کاج کے بجائے دیگر کاموں کے لیے وقت دے سکتی ہیں۔ رشتہ داروں کے ذریعہ نونہالوں کی پرورش ہمیشہ مناسب طور پر نہیں ہو پاتی اور اکثر اوقات چھوٹے بچے توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بچوں کی عارضی کھلائی، باورچن

اور معاشی مشاغل میں مددگار کی حیثیت سے لڑکیاں ماؤں کے لیے انمول ہوتی ہیں۔ ماں کو کوئی اور مددگار میسر نہیں۔

غیر رسمی بچت کا نظام

بیسی کے ذریعے بچت کرنا اور اکٹھا بڑی رقم حاصل کرنا خواتین میں عام ہے۔ صرف جن خواتین کی آمدنی اپنی ضروریات سے زیادہ ہے وہی بیسی کی مدد سے یا سونے کے زیورات خرید کر (جن کو وقت پڑنے پر وہ اکثر فروخت کرکے رقم حاصل کرتی ہیں) بچت کرلیتی ہیں۔

بیٹوں، بیٹیوں کی شادی کے وقت اکثر اسی بیسی کی بچت سے کام نکالا جاتا ہے۔ بیٹیوں کا جہیز ایک لاکھ تک ہو سکتا ہے اور اتنی بڑی رقم صرف بیسی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔

منظور کالونی میں بیسی میں شامل ہونے والی خواتین کی تعداد ۱۰۰ تک ہو سکتی ہے مگر ۵۰ کی تعداد عام ہے۔ کیمونٹی کی کوئی ایک خاتون رقم جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیتی ہے۔ یہ خاتون محلے والوں کی جانی پہچانی ہوتی ہے جو جاکر اس کے پاس رقم جمع کراتے ہیں (۵۰ ممبروں والی بیسی ۲ سال تک جاری رہ سکتی ہے)۔ بیسی میں مرد اور خواتین دونوں حصہ لیتے ہیں۔

سماجی رسومات جو خواتین پر اثر انداز ہوتی ہیں

اگرچہ جتنی خواتین کا انٹرویو لیا گیا ان میں سے زیادہ تر کی شادیاں ۱۶ سے ۲۰ سال کی عمر میں ہوئیں مگر اب رجحان یہ ہے کہ لڑکی کی شادی اس وقت ہو جب وہ بیس برس کی ہو جائے اور اس نے تعلیم مکمل کرلی ہو۔ تاہم تمام خواتین پرائمری اسکول سے آگے نہیں پڑھ پاتیں اور فوراً ہی کسی کمائی کے دھندے یا گھریلو کام میں لگ جاتی ہیں۔ جن خاندانوں کا انٹرویو لیا گیا ان کی تمام بچیاں پرائمری اسکول جاتی ہیں اور تقریباً ۳۰ فی صد پرائمری اسکول سے آگے کے مدارج میں ہیں۔ شادیاں عموماً والدین طے کرتے ہیں اور برادری کے اندر ہی کی جاتی ہیں۔ شادیاں برادری سے باہر بھی ہوتی ہیں مگر بزرگ اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

خواتین خریداری کرنے جاتی ہیں، سماجی تقریبات میں شریک ہوتی ہیں اور اگر کہیں باہر کام کرتی ہیں تو اکثر و بیشتر پیدل ہی جاتی ہیں۔ تاہم جب لڑکی ۱۲ برس کی ہو جاتی ہے تو اس کو محلے سے باہر اکیلے نہیں جانے دیا جاتا۔ اکثر خواتین باہر جاتے وقت چادریں استعمال کرتی ہیں جبکہ کچھ برقع بھی پہنتی ہیں۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد کوئی خاتون شاذ و نادر ہی بغیر کسی مرد کو ساتھ لیے باہر نکلتی ہے۔

مرد پسند نہیں کرتے کہ ان کی خواتین اکیلی بازار جائیں مگر چونکہ وہ اپنے اپنے روزگار کی وجہ سے تمام دن گھر پر نہیں ہوتے اس لیے سودا سلف خریدنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ خواتین خود جائیں۔

تفریح میں زیادہ تر میل ملاقات، ٹیلی ویژن دیکھنا اور رسائل کی ورق گردانی شامل ہیں۔ آخری دو مشاغل خواتین کی طرز زندگی اور رویوں پر اثر کر رہے ہیں اور ان کو شہری کلچر کے قریب لا رہے ہیں۔

خواتین کے کردار کا تجزیہ

پیوستگی: سماجی بہبود کی خاطر خواتین کے اپنی مدد آپ والے گروپ سے آبادی متنوع ہونے کی وجہ سے ناپید ہیں۔ دوسری طرف اے ایف بی کے ممبران میں جو مختلف النسل ہونے کے علاوہ مختلف صوبوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں بظاہر عمدہ میل جول ہے۔

ایسے ہی فورم جو کیمونٹی کے مردوں میں ربط وضبط بڑھانے میں مددگار ہیں خواتین کے لیے موجود نہیں۔ بازاروں، گلیوں، پرچون کی دکانوں اور شفاخانوں کے علاوہ خواتین کے لیے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر وہ اپنے سماجی مسائل پر اجتماعی غور و فکر کر سکیں۔

کیمونٹی کی بنیاد پر نکاس کی لائنیں بچھانے کی کارروائی اور اس سلسلے میں سارے گھرانوں کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کارروائی بھی بظاہر ہر گھر کے سربراہ کی سطح پر ہی کی گئی۔ تاہم خود گھر کے اندر نالیوں کی دیکھ بھال، گندگی کا نکاس، صفائی اور پانی جمع کرنا خواتین کی ذمہ داری ہے۔ جن خواتین سے ہم نے گفتگو کی ان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ نکاس کے لائنوں، زمین اور پانی کی سپلائی کے لیے اے ایف بی نے در حقیقت کیا کیا کیا۔ تاہم سب کو حاصل ہونے والے مثبت نتائج کا احساس ہے اور اس سے خوش ہیں۔

غیر رسمی بچت کا نظام: جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، منظور کالونی میں خواتین بھی بیسی جیسے غیر رسمی بچت نظام میں حصہ لیتی ہیں۔ بظاہر تو اس نظام کو خواتین ہی چلاتی ہیں مگر کچھ مرد بھی شریک ہوتے ہیں۔ بچت کی وجوہات میں پلاٹ کی خریداری، مکان کی مرمت، بیٹے بیٹیوں کی شادی کی ضروریات، بچی کا جہیز، زیورات (قابل فروخت اثاثہ) کی خرید شامل ہیں۔

ان سب کے لیے پچاس ہزار یا اس سے زیادہ کی رقم مطلوب ہوتی ہے۔ لوگوں

کو اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے لیے عموماً چند روایتی ذرائع جیسے ساہوکار یا کوئی دوست یا مالدار عزیز یا کیمونٹی کے کسی بااثر شخص کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ تاہم بیسی میں ادائیگی ایک طویل مدت تک مقررہ قسطوں میں کی جاتی ہے اور اپنی باری پر بڑی رقم یکمشت مل جاتی ہے یا اشد ضرورت ہو تو کہہ سن کر مقررہ وقت سے پہلے بھی لی جاسکتی ہے۔

کیمونٹی میں بیرونی تنظیموں کی وابستگی کی اے ایف بی مزاحمت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ صرف ان سرگرمیوں کو جاری رہنے دیا جاتا ہے جو اے ایف بی کی راست نگرانی میں ہوں یا جن پر وہ نظر رکھ سکیں۔ جن کا اے ایف بی سے آزاد ہو جانے کا امکان ہو ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے (جیسے اوپی پی کے قرضہ پروگرام اور ایک مقامی ڈاکٹر کی کوششوں کے ساتھ ہوا)۔ خواتین کے لیے ایسی تنظیمیں اور وسائل شہر میں تو موجود ہیں جو ان کے گھریلو اور بستی کے ماحول کو بہتر بنانے میں مدد دے سکیں مگر منظور کالونی میں ان کا وجود نہیں۔ کسی فورم یا تنظیم کے بغیر ان سب کے بارے میں معلومات خواتین تک نہیں پہنچائی جاسکتیں۔

موجودہ صورت حال کی رو سے تو اے ایف بی کو کیمونٹی کے ترقیاتی امور میں خواتین کو شامل کرنے کے لیے، ان کا بھرپور اعتماد حاصل کرنے میں ابھی کئی سال لگیں گے۔

بہر حال خواتین کو طویل مدتی ترقیاتی پروگرام سے وابستہ کرنے کے لیے اب بھی امکانی راستے موجود ہیں مثلاً وہ اسکول جو تین بلوچ خواتین چلا رہی ہیں یا وہ دو سلائی کی تربیت کے مراکز جو کیمونٹی کی خواتین نے قائم کیے ہیں۔

تصورات

غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر اداروں کے بارے میں کمیونٹی کا تصور: محبت خان محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تنظیم اور این جی او آر سی جیسی دیگر تنظیمیں، غیر سرکاری تنظیموں کے ایک بڑے کنبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ این جی او آر سی ایک بڑی تنظیم ہے جبکہ اے ایف بی ایک چھوٹی تنظیم ہے۔ این جی او آر سی سے مربوط ہو کر اے ایف بی نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اول یہ کہ این جی او آر سی نے نکاس کے پروجیکٹ کے ذریعے جو اوپی پی کی تکنیکی رہنمائی میں تیار ہوا ان کو سڑکوں پر بہتی گندگی سے چھٹکارا پانے میں مدد دی۔ دوم این جی او آر سی نے ترقیاتی کاموں سے متعلق تجاویز تیار کرنے اور ایسی تجاویز کو سرکاری محکموں کے سامنے مناسب انداز میں پیش کرنے کے طریقوں کی تربیت فراہم کی۔ تنظیم اور اس کے امور کو منظم کرنے اور باقاعدہ ریکارڈ رکھنے اور دستاویز سازی کی بھی تربیت این جی او آر سی نے فراہم کی۔ اس تربیت کے بعد ہی اے ایف بی نے مختلف امور کے لیے الگ الگ کمیٹیاں بنائیں اور یوں کاموں میں باقاعدگی آئی۔

این جی او آر سی نے آکسفیم کے ساتھ رابطے میں اے ایف بی کی مدد کی اور اس سے اے ایف بی کو لیول کی پیمائش کا آلہ اور سانچے خریدنے کے لیے مالی امداد دلوائی، حیدر آباد کے نزدیک واقع بچل شاہ چانڈیو گوٹھ کو اے ایف بی سے متعارف کرایا، اور محبت خان کا رول بدل کر تربیت حاصل کرنے والے کے بجائے تربیت کار بنادیا۔ اعلیٰ سرکاری افسران سے ملاقاتوں کے سلسلے میں این جی او آر سی ملاقات کے لیے وقت لینے اور بستی کے مسائل کو مناسب انداز میں ان کے سامنے پیش کرنے میں اے ایف بی سے تعاون کرتی ہے۔

شروع شروع میں کیمونٹی تنظیموں کو اپنے نکاس کے مسائل کو اپنی مدد آپ کی بنیاد پر حل کرنے کے لیے جیسے اورنگی والوں نے اوپی پی کی تکنیکی امداد اور سماجی رہنمائی سے کیا تھا، متحرک کرنے میں این جی او آر سی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ این جی او آر سی کے رابطہ کار نے روزانہ کئی کئی گھنٹے منظور کالونی کی مختلف مقامی تنظیموں کے اراکین کے ساتھ گذارے اور ان کے نکاس کے مسائل اور ان کے حل کرنے کے امکانات پر گفتگو کی۔

"ہم نے اپنی بستی کے لیے بہت کچھ کیا ہے"، اے ایف بی کے ایک رکن صابر نے کہا۔ "میں نے اپنی مدد آپ کے ذریعے نکاس کی لائنیں بچھوائیں، گلیوں کی بھرائی کروائی مگر برسات میں گلیوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور گلیوں میں چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو رقم ہم لگا چکے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے کونسلر یا کے ایم سی بھی رقم خرچ کرے اور ہماری گلیوں کو پختہ کرادے اور نالے کی حالت سدھار دے۔"

ایک اور مکین نے بتایا کہ علاقے کے صرف وہی مسائل کسی حد تک حل ہو سکے ہیں جن کو بستی کے رہنے والوں نے دلچسپی لے کر این جی او آر سی کی رہنمائی اور اوپی پی کی تکنیکی معاونت سے حل کیا۔ "علاوہ ازیں ہم نے ذاتی طور پر گھروں سے گندگی اٹھانے کے لیے خاکروب مقرر کر رکھے ہیں۔ مین واٹر لائن کراچی واٹر بورڈ نے ڈال دی مگر گلیوں کی لائنیں ہم نے خود ہر گھر سے چندہ لے کر بچھوائی ہیں۔ پھر بھی پانی کا دباؤ مین لائن میں کم ہے اور بعض اوقات ہم کو پانی کے ٹینکر ۳۰۰ روپے فی ٹینکر کے حساب سے منگوانا پڑتے ہیں۔ بڑی شرم کی بات ہے یہ!"

واٹر سپلائی اب بھی مسئلہ ہی ہے کہ کالونی کے صرف چند سیکٹروں میں ہی خاطر خواہ پانی آتا ہے۔ آپ لوگوں سے اس بارے میں بات کریں تو ہر ایک مختلف وجوہات بتاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا سبب بستی کے مختلف علاقوں کی بلندیوں کا فرق ہے، کچھ اس کا ذمہ دار پمپ آپریٹر اور کراچی واٹر بورڈ کے والو مین کو ٹھہراتے ہیں، کچھ کا کہنا ہے کہ پانی کا رساؤ اور لوگوں کے لیے ہوئے غیر قانونی کنکشن اس کا سبب ہیں۔ پوری کمیونٹی میں پانی کے مسئلے کی حقیقی وجہ کے بارے میں درست سوجھ بوجھ نہیں۔

مستقبل کے بارے میں محبت خان کہتے ہیں کہ ترقیاتی کاموں میں رکاوٹ کے لیے انجینئروں اور سرکاری افسران کے پاس فنڈز کی کمی اہم بہانہ ہے۔ التوا کی دیگر بڑی وجہ افسران کے باربار کے تبادلے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ افسروں کو کم سے کم تین سال تک ایک ہی جگہ رکھنا چاہیے۔

تمام خواتین نے جن کا انٹرویو لیا گیا یہی بتایا کہ حکومت نے کمیونٹی کی خواتین کے حالات سدھارنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ آمدنی بڑھانے والے پروگرام اور قرضوں کی سہولیات ان کی مانگیں ہیں۔

محبت خان کا کہنا ہے کہ اوپی پی نے اپنے قرضہ پروگرام کو بستی کے لوگوں میں متعارف کرانے کی پیشکش کی تھی مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے خیال میں منظور کالونی کے لوگوں کو 'بیرونی' روپے کی ضرورت نہیں۔ جب ان کو بتایا گیا کہ چند خواتین نے قرضے کی خواہش ظاہر کی تھی تو انھوں نے جواب دیا کہ اے ایف بی اپنے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی اہل ہے۔

جن عورتوں کا انٹرویو لیا گیا ان میں سے کسی کو بھی یاد نہیں کہ باہر کی کسی تنظیم نے کبھی ان سے رابطہ کیا ہو اور خواتین کے لیے خدمات یا پروگرام پیش کیا ہو۔ تاہم ایک نے بتایا کہ ۸ سال قبل آغا خان یونیورسٹی اسپتال نے کمیونٹی کی صحت کی حالت جاننے کے لیے گھر گھر جا کر ایک سروے کیا تھا۔ منظور کالونی کی ایک خاتون نے بہبود سینٹر (کراچی کی ایک غیر سرکاری تنظیم) سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر حاملہ ہونے کی وجہ سے اسے لوٹا دیا گیا۔

غیر سرکاری تنظیموں اور دیگر اداروں کے خود اپنے پروگراموں اور کمیونٹی کے بارے میں تصورات

کے ایم سی: کے ایم سی کے کچی آبادی کے ڈائریکٹر کہتے ہیں کہ سرکاری اداروں اور امداد دینے والے اداروں کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ ترقیاتی کاموں میں وہ عوام کی شریک کار ہیں کیونکہ بلدیاتی اداروں کے لیے لوگوں کو ضروری سہولیات مہیا کرنا ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ جو سرکاری افسران اس شراکت کے تصور پر یقین نہیں رکھتے ان کو بھی غیر سرکاری تنظیموں نے جیسے اورنگی کی اوپی پی جس نے لوگوں کو خود اپنے بل پر اپنے مسائل حل کرنے میں مدد دے کر کامیابی حاصل کی اپنا قائل کر لیا اور اب وہ حکومت کو 'فراہم کنندہ' کا رول ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔

منظور کالونی کی اے ایف بی کے بارے میں انھوں نے کہا سرکار اور کمیونٹی کے درمیان رابطے کے لیے وہ اوپی پی کی سطح کی غیر سرکاری تنظیم چاہتے ہیں۔

بعض اوقات سرکاری اداروں کے لیے مقامی تنظیموں یا سرگرم کارکنوں سے بات کرنا دشواری پیدا کرتا ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومت اور عوام دونوں نے پہلے اس طرح شرکت میں کام نہیں کیا ہے۔ یقیناً ایک دوسرے کو پر اعتماد تال میل کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ اس وقت تک کے لیے دونوں کے درمیان مفاہمت کروانے والی کوئی تیسرا فریق ہونا ضروری ہے۔

کے ایم سی کے کچی آبادی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر کہتے ہیں کہ سرکاری ادارے اپنی انتظامی ساخت اور وسائل کی تنگی کی وجہ سے کسی علاقے کی آبادی سے معاملہ کرنے میں کچھ حدود کے پابند ہوتے ہیں جبکہ کمیونٹی تنظیمیں آبادی میں موجود ہونے کی وجہ سے آبادی کی طبعی حالت اور لوگوں کی ضروریات کا بہتر علم رکھتی ہیں۔

کراچی واٹر اینڈ سیورج بورڈ: متعلقہ ایگزیکٹو انجینئر کہتے ہیں کہ پانی اور نکاس کے لیے جو بجٹ منظور کیا جاتا ہے وہ عوامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لیے ہر سال لائنیں بچھانے کے بہت سے عوامی مطالبے مسترد کر دیے جاتے ہیں۔ فنڈز کی کمی کی وجہ سے پرانی لائنوں کی مرمت تک ممکن نہیں ہوتی۔ لوگوں کی تسلی کے لیے نکاس کی لائنوں کی درستی کے سلسلے میں صفائی ٹیمیں روانہ کر دی جاتی ہیں تاکہ پھنسی ہوئی گندگی کو نکال کر صفائی کر دیں جبکہ ایگزیکٹو انجینئر جانتا ہے کہ یہ مستقل حل نہیں۔ پانی کی لائنوں کی حد تک درستی صرف رساؤ کو بند کرنے تک محدود ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ قانون کی رو سے کسی علاقے میں کیے جانے والے کام کی نشان دہی ہر مالی سال میں منتخب کونسلر کرتے ہیں اور ہر کونسلر کو اس کام کے لیے کے ایم سی فنڈز الاٹ کر دیتی ہے۔ اب اگر لوگوں کے مطالبات (جو کمیونٹی تنظیمیں پیش کرتی ہیں) کونسلر کے مطالبات سے نہیں ملتے تو ہمارے لیے کمیونٹی تنظیم کی خواہش پوری کرنا دشوار ہے۔ یہ ان تمام سرکاری اداروں کی جائز دشواری ہے جو کسی نہ کسی قسم کا ترقیاتی کام کر رہے ہیں۔ ان کے خیال

میں کمیونٹی کے لیڈروں اور مقامی تنظیموں کے نمائندوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

او پی پی : نکاس کے نظام کا منصوبہ تیار کرنے کے لیے لیول سروے کے دوران لوگوں سے ملنے جلنے پر یہ بات سامنے آئی کہ کمیونٹی اور کمیونٹی تنظیموں کے درمیان ابلاغ کی کمی تھی کیونکہ لوگوں کو اکثر ان فیصلوں کا علم ہی نہیں جو یہ کمیونٹی تنظیمیں کرتی تھیں۔ اے ایف بی اور کمیونٹی کے درمیان اس ابلاغی خلا کی وجہ سے اکثر وبیشتر کمیونٹی کے باشندوں میں او پی پی کے کردار کے بارے میں غلط فہمی رہتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ او پی پی ٹھیکیدار ہے جو پیسے لے کر ان کا سارا کام کرے گی۔

او پی پی کو پلان کو آخری شکل دیتے وقت کمیونٹی سے کافی فیڈ بیک ملا۔ کمیونٹی نے بہت سارے تکنیکی سوالات نالی کے قطر اور اس کی گہرائی، مین ہول کے سائز، جنکشنوں پر سانچے لگانے اور دیگر باتوں کے بارے میں دریافت کیے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ لوگ علاقے کے نکاس کے مسائل سے آگاہ تھے اور او پی پی کی مدد سے پہلے بھی اپنے مدد آپ کے تحت حل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس صرف تکنیکی مہارت کی کمی تھی۔ او پی پی کا تیار کردہ پلان ملتے ہی وہ اتنے ہوشیار تھے کہ فوراً ہی کونسلر کے پاس پہنچ گئے تاکہ مین لائن بچھوانے کے لیے کونسلر کو ملنے والے فنڈ کو استعمال میں لایا جائے۔ جب کونسلر نے ان کی مانگ مسترد کر دی تب انھوں نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر یہ کام بھی خود کروانے کا فیصلہ کیا۔

این جی او آر سی: این جی او آر سی کو یقین ہے کہ کسی ترقیاتی پیش قدمی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں اور حکومت کا تعاون لازمی ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے این جی او آر سی نے اے ایف بی اور سرکاری محکموں کے درمیان سلسلہ جنبانی میں مدد دی۔

این جی او آر سی تنظیموں کو ترقی دینے اور ان کا انتظام چلانے کی تربیت کے علاوہ چند شعبہ جاتی تربیت بھی دیتی ہے۔ اگر خالص تکنیکی نوعیت کی کوئی نازک ضرورت در پیش ہو تو این جی او آر سی مناسب وسائل رکھنے والی تنظیم کو تلاش کر کے کمیونٹی تنظیم کو اس کے ساتھ جوڑنے میں معاونت کرتی ہے۔

دیگر مددگار تنظیموں کے برعکس این جی او آر سی غیر سرکاری تنظیموں کے لیے مالی امداد کو بنیادی مسئلہ نہیں سمجھتی اور اسی لیے وہ تنظیموں کو مالی امداد دینے میں ملوث نہیں ہوتی۔ تاہم جہاں ضرورت آپڑتی ہے تو وہ مالی امداد دینے والی تنظیموں سے کمیونٹی تنظیم کا تعارف کرانے میں معاونت کرتی ہے۔

این جی او آر سی کی طرف سے دی گئی استعدادکاری کی تربیت نے منظور کالونی کی کمیونٹی تنظیموں کے اندر خود اعتمادی بڑھانے میں مدد دی ہے۔

ایک سرگرم کمیونٹی کارکن کا خاکہ

محبت خان کا خاندان اوائل ۱۹۵۰ میں ضلع ہزارہ صوبہ سرحد سے نقل مکانی کر کے کراچی آیا تھا۔ وہ خود یہیں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے وہ محمود آباد میں رہا کرتے تھے مگر ۱۹۶۳ میں منظور کالونی میں آبسے۔ ان دنوں منظور کالونی ملیر ندی کے کنارے کھلی زرعی اراضی تھی۔

محبت خان نے اپنی اسکول کی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ وہ مویشیوں کی افزائش اور ڈیری فارمنگ کے اپنے خاندانی کاروبار میں کام کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ میں وہ کویت چلے گئے جہاں انھوں نے ایک مقامی صنعتی ادارے کے سیلز مین کی حیثیت سے کام کیا۔ وہاں کے قیام کے دوران ان کو اپنے ساتھی محنت کشوں خصوصاً ہم وطن پاکستانیوں کی مشکلات کا احساس ہوا۔ ان کے مسائل کے حل کے لیے ایک تنظیم قائم کرنے میں ان کا ہاتھ رہا۔

۱۹۸۴ میں محبت خان پاکستان واپس آگئے اور بستی کی غیر رسمی ترقی میں حصہ لینے لگے۔ انہوں نے جائیداد کی خرید وفروخت کا اپنا کاروبار قائم کیا۔

اس وقت تک منظور کالونی کو قانونی طور پر پکی آبادی کا درجہ نہیں دیا گیا تھا کیونکہ یہ زرعی اراضی کی غیر قانونی تقسیم سے وجود میں آئی تھی۔

ان کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ ان کا کاروبار صرف اسی وقت پنپ سکتا ہے جب ان کو مقامی انتظامیہ، پولیس اور سرکاری محکموں کے اہل کاروں کی سرپرستی حاصل ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جو اس طرح کے کاروبار کے لیے لازمی ہیں اور مقامی سرکاری محکموں کے کلچر سے واقف ہو گئے۔

محبت خان نے دیکھا کہ منظور کالونی میں سماجی سہولیات اور خدمات کی حالت خراب ہے۔ ان کے کاروبار کے لیے لازم تھا کہ بستی کے حالات بہتر ہوں۔ انھوں نے بستی کی طبعی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک فلاحی تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا۔ انھوں نے انجمن فلاح و بہبود قائم کی تاکہ پانی، نکاس اور بجلی جیسی بنیادی سہولیات کے لیے کے ڈی اے، کے ایم سی، کے ڈبلیو ایس بی اور کے ای ایس سی سے ہم خیال کاری کی جائے۔ آجکل محبت خاں انجمن فلاح و بہبود کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں۔

منظور کالونی میں نکاس نظام کی تعمیر میں محبت خان نے نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے اس سارے عمل میں سرگرمی سے حصہ لیا اور او پی پی سے اس کے انتظام اور نگرانی کی تربیت حاصل کی۔ کل ۸۵ گلیوں میں نالیاں تعمیر کی گئیں جن میں سے ۷۵ گلیوں کی نالیاں محبت خان کی نگرانی میں تعمیر ہوئیں۔ پانچ گلیوں میں انھوں نے ٹھیکے پر کام کیا اور منافع حاصل کیا۔ ان کی لوگوں کو منظم کرنے کی قابلیت اور کاروباری سوجھ بوجھ بہت کام آئی۔ بطور اسٹیٹ ایجنٹ سرکاری اہلکاروں سے کام نکالنے کا جو تجربہ انھیں حاصل تھا وہ سماجی ترقیاتی کاموں میں ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ محبت خاں آس پاس کی بستیوں کو بھی کم قیمت سیوریج نظام تعمیر کرنے پر اکساتے ہیں۔

نتائج

اس مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

- کیونٹی تنظیمیں ترقیاتی کاموں یا سرکاری اداروں کے ساتھ موثر ہم خیال کاری میں اس وقت تک شریک نہیں ہو سکتیں جب تک ان کو غیر سرکاری تنظیموں، باخبر پیشہ وروں، کارپردازوں، تکنیکی امداد اور انتظامی قابلیت کی تربیت سے معاونت نہ حاصل ہو۔ اے ایف بی کے سلسلے میں این جی او آر سی نے تعاون فراہم کیا، او پی پی سے ان کا تعارف کرایا، ان کو محتسب کے ادارے سے آگاہ کیا اور سرکاری محکموں سے مذاکرات میں معاونت کی۔
- ہم خیال کاری کا عمل اسی وقت موثر ہوتا ہے جب اس کی امداد کے لیے متبادلات، لاگت کے تخمینوں اور تکمیلی طریق عمل کو؛ یعنی کیونٹی کے اندر موجود تکنیکی ہنر مندی کے ذریعے عمل درآمد جیسے حقائق کی کمک موجود ہو۔
- زیادہ متمول، بہتر تعلیم یافتہ اور بہتر پہنچ والے (سیاستدانوں اور سرکاری عملداروں تک) افراد اکثر و بیشتر کیونٹی تنظیموں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ کیونٹی کے لوگ تنظیم کی قیادت سے الگ تھلگ ہو جاتے ہیں یا پھر اس کے دست نگر بن جاتے ہیں۔ منظور کالونی کے معاملہ میں کیونٹی تنظیم پر محبت خان کا غلبہ ہے۔
- جب کوئی رہنما کسی کیونٹی تنظیم کا غالب جز بن جاتا ہے تو اس کی زیادہ توانائی اپنے غلبہ کو برقرار رکھنے میں صرف ہوتی ہے اور وہ اس وقت خوف محسوس کرتا ہے جب علاقے میں کوئی ایسا پروگرام یا تنظیم متعارف ہو جس کو وہ براہ راست قابو میں نہ رکھ سکے۔ اسی وجہ سے منظور کالونی میں او پی پی کے قرضہ پروگرام کا داخلہ محبت خان کو منظور نہیں۔
- مقامی کیونٹی تنظیم کے رہنماؤں اور سیاستدانوں کے درمیان مفادات کی شدید کشمکش موجود ہے۔ کیونٹی تنظیم کے رہنما ترقی چاہتے ہیں چاہے اپنی مدد آپ کے ذریعے ہی ہو جبکہ سیاستدان ترقی سرکاری خرچ سے چاہتے ہیں تاکہ ان کو ووٹ ملیں۔ سیاستدان بذات خود کیونٹی کی کوششوں کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ ترقی کے لیے جھوٹے وعدے کرکے ایسی پیش قدمیوں کو دبا دیتے ہیں۔ جب کبھی ایسی کاوشیں بار آور ہو جاتی ہیں تو لیڈر اس کی ساری نیک نامی بٹورنے کے لیے آگے آجاتے ہیں۔ اس کشمکش کا صرف ایک ہی حل ہے کہ خود کیونٹی تنظیم کے رہنما مقامی کونسلر بن جائیں۔
- شراکتی منصوبہ بندی اور ترقیات کے لیے سرکاری محکموں کے ارادے بس باتوں کی حد تک ہیں۔ اس کام کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے سرکاری محکموں میں منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کے طریق کار اور اخراجات کی منظوری، تفویض اور استعمال کے ڈھنگ کو یکسر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ کہ تمام سرکاری افسران اور سیاستدانوں کے تمام صوابدیدی اختیارات کے ساتھ ساتھ تمام متوازی ترقیاتی پروگرام ختم کر دیے جائیں۔
- سرکاری محکموں میں تکنیکی اور مالی وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کیونٹی تنظیموں کو تربیت دے کر باخبر کیا جائے تاکہ وہ ان وسائل سے فائدہ اٹھا سکیں۔
- ہم خیال کاری کے عمل میں کیونٹی کے صرف مالدار ممبران ہی شراکت کر سکتے ہیں کیونکہ یہ کام بہت دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ وقت بھی بہت لیتے ہیں۔ منظور کالونی کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم خیال کاری ایک کل وقتی مشغولیت ہے۔ اس وجہ سے بہت سے ایسے لوگ جو اس کام کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں روزی کمانے کی مصروفیات کے باعث اس کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔ سرگرم کارکنوں کی کفالت کے لیے فنڈز کا ہونا لازمی ہے۔
- ملی جلی سوسائٹی کی ان خواتین تک جن کا پس منظر دیہی ہو کیونٹی تنظیم کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان پر کلیتاً مردوں کا غلبہ ہے۔ مردوں کے غلبے والی تنظیموں کو خواتین کے مسائل سے شاذ و نادر ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے سرکاری اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے خواتین کی ترقی کے لیے جو مخصوص پروگرام تیار کیے جاتے ہیں ان کی رسائی منظور کالونی جیسی بستیوں تک

نہیں ہوپاتی۔

- اس بات کی ضرورت ہے کہ سوسائٹی میں صنفوں سے تعلق رکھنے والے جو تغیرات رونما ہورہے ہیں، ان کو، ان کے اسباب اور عملیہ کو شناخت کیا جائے۔ اگر یہ تغیرات سمجھ میں آجائیں تو ان کی حمایت کرنا اور دیہی وڈیرہ شاہی سے شہری سوسائٹی کی جانب پیش رفت میں لگنے والے جھٹکوں اور سراسیمگی کو کم کرنا اور اس عمل کو تیز کرنا ممکن ہوگا۔

- سرکاری اداروں میں دستاویز کاری، نگرانی اور نظارت کا کوئی کارگر نظام نہیں۔ اسی باعث ان کی کارکردگی کی نہ تو جواب طلبی ہوسکتی ہے اور نہ اس میں شفافیت ہے۔ اس صورت حال کے سدھار کی ایک ہی صورت ہے کہ عوام غیر سرکاری تنظیموں اور پیشہ ورانہ تعاون کی حامل کیمونٹی تنظیموں کے ذریعے دباؤ ڈالتے رہیں۔
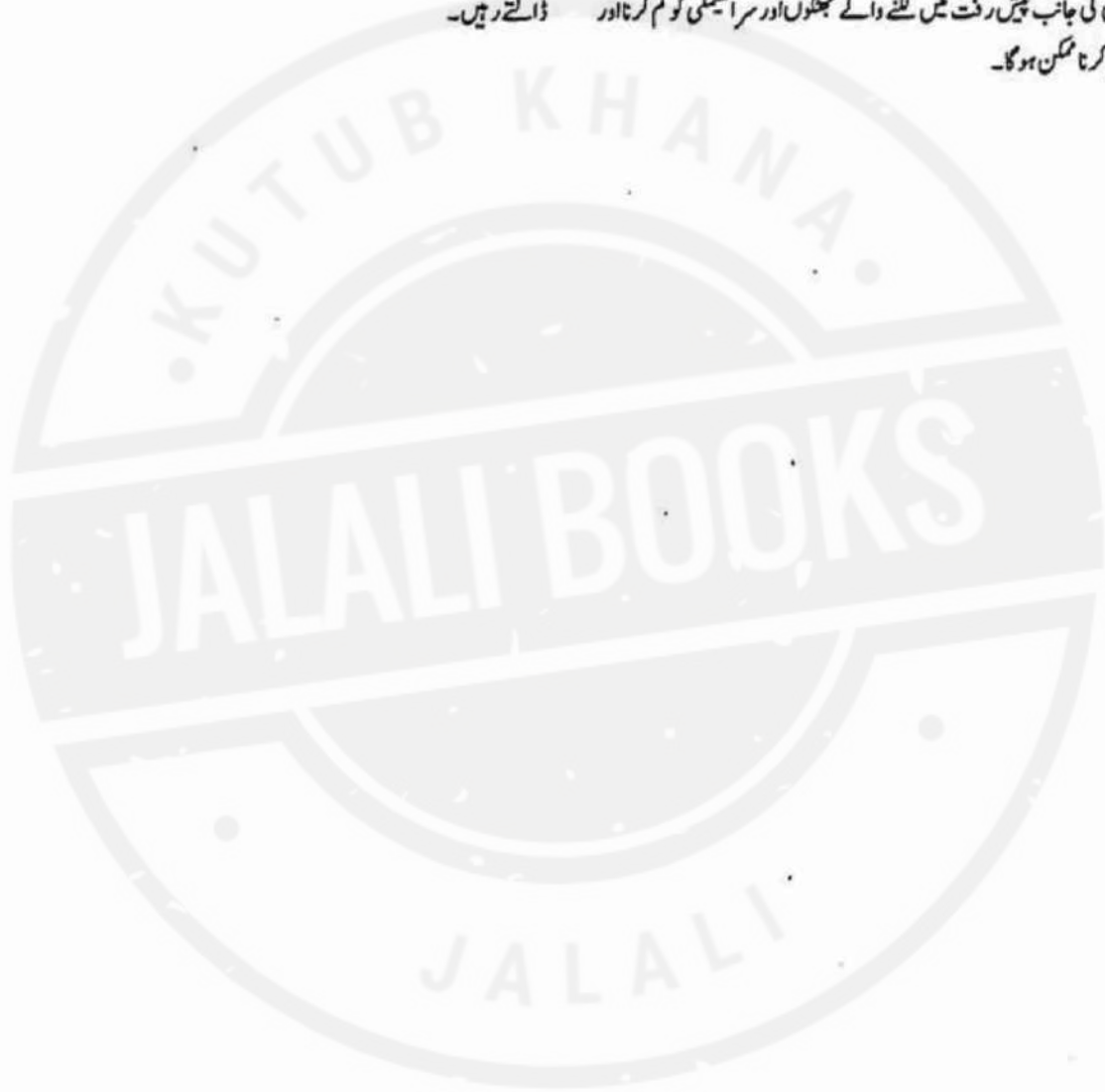
غازی آباد، اورنگی

بستی کا خاکہ

۴
غازی آباد، اورنگی

انور راشد

بستی

غازی آباد، اورنگی ٹاؤن شپ میں ایک کچی آبادی ہے جس کا زیادہ حصہ پہاڑی علاقے پر واقع ہے۔ یہ آبادی چھ ذیلی محلوں، مجاہد کالونی، گرین ٹاؤن، مسلم میواتی کالونی، ابو بکر صدیق کالونی، کشمیر کالونی اور کرسچین کالونی پر مشتمل ہے۔ غازی آباد نے زمین کا تقریباً ۱۵۴ ایکڑ رقبہ گھیر رکھا ہے۔ سوائے کرسچین کالونی کے جو بلوچ برادری کی زمین پر واقع ہے، باقی زمین سرکاری (سینٹرل بورڈ آف ریونیو کی) ملکیت تھی۔ پلاٹوں کا اوسط رقبہ ۱۲۰ مربع گز ہے۔ بعض پلاٹوں کا رقبہ ۴۰۰ مربع گز بھی ہے۔ کل ۳۲۴ گلیاں اور ۳۳۳۶ مکانات ہیں۔ مکینوں کی اکثریت سابق مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلہ دیش) سے آئے ہوئے مہاجرین کی ہے۔ یہ مہاجر جو "بہاری" کہلاتے ہیں، غازی آباد میں اس لیے آبسے کہ اس علاقے میں کم قیمت پر زمین میسر تھی۔ اکثر نے تو پلاٹ مفت میں حاصل کیے۔

پانی ٹینکروں کے ذریعے ملتا ہے۔ کوئی ۶۷ گلیوں میں زیر زمین سیوریج لائنیں بچھی ہیں جو لوگوں نے خود اپنے خرچ پر بچھائی ہیں۔ شاہراہیں اور لنک روڈز کے ایم سی نے پختہ کروائی ہیں۔ مکانات میں بجلی کے غیر قانونی کنکشن موجود ہیں۔ کنبوں کی اوسط ماہانہ آمدنی ۲۰۰۰ روپے ہے جن میں گھر کے دو سے زیادہ افراد کماتے ہیں۔

غازی آباد کی بستی ۱۹۸۱ میں بسنا شروع ہوئی۔ اس زمانے میں غاروں کے کناروں پر زمین کی جھتیں ڈال کر بنگالیوں کے ۲۰ سے ۲۸ کنبے یہاں مقیم تھے۔ زیادہ تر علاقہ خالی پڑا تھا حالانکہ دلالوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ دلالوں کا پولیس اور کے ڈی اے کے اہل کاروں سے گٹھ جوڑ تھا۔ لوگوں نے زمین یہاں دلالوں سے ۲۰۰ تا ۱۲۰۰ روپے فی ۱۲۰ مربع گز پلاٹ کے حساب سے خریدی۔ ۱۹۸۳ تک بسنے والے بہت کم

تھے۔ تاہم رفتہ رفتہ علاقہ آباد ہونے لگا۔ ابتدائی باشندوں کی اکثریت، عمارتی مزدوروں، راج مزدوروں، فیکٹری مزدوروں، محنت کشوں اور دکانداروں پر مشتمل تھی۔ کرسچین کالونی کو کیتھولک ریلیف سروس کے فادر ڈی سوزا نے مقامی بلوچ برادری سے زمین خرید کر بسایا۔ یہ انتظام انہوں نے ۱۹۸۱ کے سیلابوں میں تباہ ہونے والے پکھ (اندرون سندھ) کے ۱۰۰ عیسائی کنبوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے کیا۔ ہر گھرانے نے فی پلاٹ ۱۰۰ روپے ادا کیے۔ بعد میں کراچی کے دیگر عیسائی خاندان بھی کرسچین کالونی میں آبسے۔ آج اس کالونی میں تقریباً ۵۰۰ عیسائی خاندان آباد ہیں۔ پادری اور دیگر عیسائی تنظیموں کی سرگرمیاں اسی علاقے تک محدود ہیں۔

اس بستی کے ابتدائی ایام میں علاقے میں تمام بنیادی سہولتوں کا فقدان تھا۔ یہ حقیقتاً ایسی جگہ نہیں تھی جہاں انسان رہ سکیں، مگر متبادل صورت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ مجبوراً یہاں رہنے لگے۔ پورے غازی آباد میں یہاں وہاں ۲۰۰ سے ۵۰۰ مکانات پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے کے ایک سرگرم کارکن محمد شمیم اختر ابتدائی باشندوں کے مصائب اور مسائل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: "شروع شروع میں ہم کو پانی کے لیے سخت دشواریوں کا سامنا تھا۔ روزانہ کی ضرورت کا پانی حاصل کرنے کے لیے ہم کو سیکٹر ۱۴ میں دو کلو میٹر دور شاہ فیصل چوک تک جانا پڑتا تھا۔"

ایک اور کارکن محمد شمس الدین یاد کرتے ہیں: "ان دنوں نہ پانی تھا اور نہ نکاس کا نظام۔ لوگوں نے گھر کے نزدیک ہی گڑھے کھود لیے تھے جس میں گندگی جمع ہو جاتی تھی۔ ایک گڑھا بنانے میں ۱۲۰۰ سے ۱۳۰۰ روپے تک کی لاگت آتی تھی۔ خاکروب بھی نہیں تھے جو اس کو صاف کرتے۔ اس صورت حال سے ہم خاصے پریشان تھے۔"

کئی برسوں میں جا کر یہاں کے لوگوں نے اپنی بچت یا ٹھیلے والے کے قرضوں سے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے مکانات تعمیر کیے۔ انھوں نے ٹھیلے والے سے تکنیکی امداد

غازی آباد: اہم تاریخیں

۱۹۸۱ آبادی کا قیام۔
۱۹۸۱ پہلی مقامی تنظیم قائم ہوئی۔
۱۹۸۱ آبادی کے لیے کے ایم سی / کے ڈبلیو ایس بی نے پانی کے ٹینکر منظور کیے۔
۱۹۸۳ غازی آباد فلاحی کمیٹی قائم کی گئی۔
۱۹۸۵ کے ڈبلیو ایس بی نے علاقے کا سروے کیا۔
[illegible] غازی آباد فلاحی کمیٹی کے دوسرے انتخابات ہوئے۔
[illegible] غازی آباد فلاحی کمیٹی کے تیسرے انتخابات ہوئے۔
[illegible] بجلی کے کنکشن کے لیے چالان جمع کیے گئے۔
[illegible] پانی کے ہینڈ پمپ نصب کیے گئے۔
[illegible] میئر کراچی کے ساتھ میٹنگ کی گئی۔
[illegible] کے ایم سی نے علاقے کا نقشہ تیار کیا۔
[illegible] کے ایم سی کونسل نے علاقے کے نقشے کی منظوری دی۔
[illegible] بجلی کی فراہمی کے لیے سروے کیا گیا۔
[illegible] ایشیائی ترقیاتی بینک کی مالی امداد سے چلنے والے منصوبے میں اوپی پی آر ٹی آئی کو کے ایم سی کا مشیر مقرر کیا گیا۔
۱۹۹۰ بجلی کی فراہمی کا این او سی موصول ہوا۔
۱۹۹۳ ایشیائی ترقیاتی بینک کی مالی امداد سے چلنے والے منصوبے کا بیرونی کام مکمل کیا گیا۔
۱۹۹۳ کھلی کچہری ہوئی۔ اورنگی کے پروجیکٹ ڈائرکٹر اور کے ایم سی کے کچی آبادی ڈائرکٹر نے آبادی کے باشندوں سے ملاقات کی۔
۱۹۹۴ رکن قومی اسمبلی کو علاقے میں مدعو کیا گیا۔
۱۹۹۴ بجلی کے کھمبے نصب کیے گئے۔
۱۹۹۴ آبادی کے باشندوں کو زمین کے مالکانہ حقوق دینے کے لیے لیز کیمپ لگایا گیا۔
۱۹۹۵ علاقے میں مزید ہینڈ پمپ لگائے گئے۔

بھی حاصل کی۔ اب گھروں میں دو کمرے، پاخانہ، باورچی خانہ اور صحن موجود ہے۔ فی زمانہ ان مکانوں کی قیمت فروخت تقریباً ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک ہے۔ لوگوں نے اپنے مکانات بنانے میں زمین کی قیمت سمیت پچیس ہزار سے چالیس ہزار روپے تک لگائے ہیں۔ اب غازی آباد میں کوئی خالی پلاٹ موجود نہیں۔

غازی آباد کے ۸۰ فیصد باشندوں کا نجی روزگار ہے اور وہ بہت کارانداز ہیں۔ ہر گلی میں اوسطاً پانچ گھر ایسے ہوں گے جن میں کاریگروں کے چھوٹے چھوٹے یونٹ بنارسی، بنائی، چمڑے کا کام (جوتے، پرس اور والٹ)، زری کا کام یا کڑھائی کا کام کررہے ہوں گے۔ یہی چھوٹی چھوٹی کارگاہیں کمیونٹی کے افراد کے لیے تربیت گاہیں بھی ہیں۔ ان تمام کاروباروں کو مالکان نے اپنی چھوٹی چھوٹی بچتوں سے شروع کیا تھا۔ علاقے کے نو عمر افراد ان گھریلو صنعتوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور کام کرتے کرتے خود اس میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔

غازی آباد میں ترقیاتی کام کا ایک منظر

آبادی میں بچھائی گئی بڑی ٹرنک لائن

اول اول یہ سیکھنے والے دو ہفتوں سے لے کر چار ماہ تک بغیر اجرت کے کام کرتے ہیں جس کا تعین کام کی نوعیت پر منحصر ہے۔ تربیت کے ابتدائی دور کو گزارنے کے بعد عموماً وہ ۲۵ سے ۷۵ روپے روز تک کما لیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمائی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تربیت حاصل کرنے والے ۱۲ سے ۱۵ سال کی عمر سے سیکھنا شروع کرتے ہیں اور ۲ سے ۴ سال کی مدت میں پورے ماہر کاریگر بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود اپنا ذاتی کام شروع کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کاراندازوں کو رسمی سیکٹر سے قرضوں کی سہولیات یا تکنیکی رہنمائی کی شکل میں کوئی معاونت حاصل نہیں ہوتی۔ مال کی تیاری اور مارکیٹنگ کا فن وہ انھی موجود غیر رسمی اداروں سے سیکھتے ہیں جہاں وہ مال تیار کرتے ہیں۔

بستی میں چھ پرائمری اور پانچ سیکنڈری اسکول ہیں۔ تمام اسکول نجی سیکٹر کی ملکیت ہیں۔ اس علاقے میں کوئی سرکاری اسکول نہیں ہے۔ آٹھ عدد نجی مطب بھی ہیں۔

لوگوں میں شہری خواص ہیں کیونکہ وہ بنگلہ دیش کے شہری علاقوں سے ہجرت کرکے آئے ہیں۔

مقامی تنظیموں کا قیام

انجمن فلاح و بہبود، غازی آباد

۱۹۸۱ میں چند افراد، فخر عالم، حامد رضا، مرتضیٰ پیر اور حاجی حنیف نجی طور پر علاقے کے مسائل کے حل کے لیے آگے بڑھے اور کونسلر سے رابطہ کیا۔ کے ڈی اے اور کے ایم سی اہل کاروں سے ملے۔ سرکاری محکموں سے اپنی ہم خیال کاری کو موثر بنانے کے لیے انھوں نے انجمن فلاح و بہبود کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنے کا

فیصلہ کیا۔ غازی آباد میں یہ پہلی مقامی تنظیم تھی۔

اس کے عہدے دار مندرجہ ذیل تھے:

-	فیض اللہ شاہ	صدر
-	فخر عالم	جنرل سیکریٹری
-	حامد رضا	جوائنٹ سیکریٹری
-	حاجی حنیف	ممبر
-	مرتضیٰ پیر	ممبر
-	معین صدیقی	ممبر
-	معین الدین	ممبر
-	پنچھی میاں و دیگر	ممبران

حامد رضا اور فخر عالم کا کہنا ہے کہ انجمن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کا ووٹرز لسٹ میں اندراج کرایا جائے، کے ایم سی کی طرف سے علاقے میں پانی کی ایک ٹنکی لگوانے کی منظوری لی جائے اور علاقے کے باشندوں کے آپس کے تنازعات کو حل کیا جائے۔

آمدورفت اور دیگر اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ۲۵ روپے فی خاندان لے کر علاقے کے سینکڑوں خاندانوں کا اندراج ووٹرز لسٹ میں کروایا گیا۔ انجمن نے علاقے کے لیے پانی کی ٹینکر کے خدمات حاصل کیں۔ انجمن کو ٹینکر سروس کی منظوری بہ آسانی حاصل کرنے اور ووٹرز لسٹ میں لوگوں کے اندراج میں کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ چند ممبران علاقے کے کونسلر اور کراچی واٹر بورڈ کے اہل کاروں کے قریبی دوست تھے۔ اس سلسلے میں ان کو زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔

۱۹۸۳ میں انجمن بے اثر ہوگئی جب لوگوں میں اس کی ساکھ اس بنا پر ختم ہوگئی کہ اس کے چند عہدیدار منافع خوری میں ملوث پائے گئے۔ ایک واقعے میں انجمن کے چند عہدیداروں نے ایک شخص منصور کا پلاٹ ہتھیا کر ایک ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ چار ماہ بعد مالک کو علم ہوا کہ اس کا پلاٹ فروخت کر دیا گیا۔ وہ خود ابو بکر کالونی میں رہتا تھا اور خالی پلاٹ گرین ٹاؤن میں تھا۔ مالک نے علاقے کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اس دھوکے کو بے نقاب کیا۔ اس نے پولیس کی امداد بھی لینے کی کوشش کی مگر اس سب کے باوجود پلاٹ نہ مل سکا۔ تاہم لوگوں میں انجمن کی ساکھ بگڑ گئی۔

ایک اور واقعے میں مجاہد کالونی کے چند مکینوں، محمد شمس الدین، اختر امام، محمد یوسف اور محمد لطیف نے اپنے خاندان کا اندراج ووٹرز لسٹ میں چاہا تو فی خاندان ۲۵ روپے طلب کیے گئے اور جب انھوں نے رقم دینے سے انکار کیا تو انجمن نے ووٹرز لسٹ میں ان کا اندراج نہیں کروایا۔ شمس الدین اور ان کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ ان کے مسائل کا حل اس انجمن سے نہیں ہوگا۔ انھوں نے خود ہی منظم ہو کر کمیونٹی کی ترقی کے لیے کام کرنے کی ٹھانی۔

غازی آباد فلاحی کمیٹی

۱۹۸۴ کے اوائل میں محمد شمس الدین، جمال اختر، اختر امام، محمد یوسف اور محمد لطیف نے علاقے کے لوگوں سے بات چیت کی۔ انھوں نے حامد رضا سے بھی مل کر کمیٹی میں شامل ہونے کو کہا۔ حامد رضا بھی انجمن سے بدظن ہو چکے تھے اس لیے وہ راضی ہوگئے۔ ایک ماہ تک لوگوں سے گفت و شنید کے بعد ایک میٹنگ بلائی گئی جس میں ۵۰ مکینوں نے حصہ لیا۔ 'غازی آباد فلاحی کمیٹی' کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس میٹنگ میں ۱۸ انتظامی اراکین منتخب کیے گئے۔ باقی موجود افراد کو ممبر بنالیا گیا۔

ایک ماہ بعد پہلی رسمی میٹنگ میں ۱۸ انتظامی اراکین نے سات عہدیداروں کا انتخاب کیا۔

-	حامد رضا	صدر
-	محمد لطیف	سینئر نائب صدر
-	محمد شمس الدین	جنرل سیکریٹری
-	جمال اختر	جوائنٹ سیکریٹری
-	امین شیدائی	پبلسٹی سیکریٹری
-	پیر محمد	پروپیگنڈا سیکریٹری

یہ فیصلہ کیا گیا کہ انتظامی کمیٹی کے انتخابات ہر ۲ سال بعد کرائے جائیں۔

تنظیم کا اہم مقصد یہ تھا کہ پانی، نکاس، علاقے کی ریگولرائزیشن، سڑکوں کی تعمیر، بجلی، گیس، صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولیات کے لیے ہم خیال کاری کی جائے۔ فراہمی آب، نکاسی آب اور پلاٹوں کے نمبروں کے الاٹمنٹ کو ترجیح دی گئی۔

"نیا نیا کام شروع کیا تھا، ہم یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ سرکاری محکموں سے ہم خیال کاری کیوں کر کی جائے، اس لیے ہم نے طے کیا کہ کسی کی رہنمائی میں کام کریں۔ کوئی ہماری تنظیم کا سرپرست بھی ہو۔" انتظامیہ کے اراکین نے تنظیم کے سرپرست اعلیٰ کے لیے تین نام تجویز کیے۔ عفیف حسن علوی جو کے ای ایس سی کے ڈائریکٹر تھے اور ناظم آباد میں رہتے تھے۔ مسلم لیگی سرگرم رکن ڈاکٹر سرور سلطانہ، جن کا مطب اورنگی سیکٹروں میں تھا اور ناظم آباد میں رہتی تھیں۔ کونسلر ظہیر الدین

بابر جو کے ایم سی یونٹ ۱۱۹ کے کونسلر تھے اور غازی آباد یونٹ ۱۱۸ میں تھا۔ کونسلر ظہیر الدین بابر کو سرپرست کی حیثیت سے سب سے مناسب سمجھا گیا۔ وہ اورنگی سیکٹر ۸ میں مقیم تھے اور ہر وقت لوگوں کی پہنچ میں تھے۔ اس کے علاوہ وہ کونسلر اور سرکاری محکموں سے گفتگو کرنا اور کام نکالنا بھی جانتے تھے۔

۱۹۸۶ میں رکنیت ۵۰ سے بڑھ کر ۲۵۰ ہو گئی۔ انتظامیہ کے اراکین کی تعداد ۱۸ سے بڑھا کر ۳۰ کر دی گئی۔ انتظامیہ کا انتخاب جنرل باڈی میٹنگ میں کیا جاتا تھا۔ ۱۹۸۴ میں منتخب کردہ عہدیداروں کو انتظامیہ نے دوبارہ منتخب کر لیا۔

۱۹۸۸ میں انتخابات نہیں ہوئے کیونکہ غالب سیاسی جماعت ایم کیو ایم کی دھمکیوں کے بعد تنظیم کی سرگرمیاں بند ہو گئی تھیں۔ تیسرے انتخابات ۱۹۹۲ میں ہوئے۔ رکنیت بڑھ کر ۳۰۰ ہو گئی تھی۔ ۲۷ اراکین انتظامیہ اور پانچ عہدیدار منتخب کیے گئے۔

- حامد رضا — صدر
- اختر امام — نائب صدر
- محمد شمس الدین — جنرل سیکریٹری
- جمال اختر — جوائنٹ سیکریٹری
- امین شیدائی — پبلسٹی سیکریٹری

قیادت ۱۹۸۴ سے اب تک وہی ہے۔ "ہم نے مل جل کر کام کیا، ایک دوسرے سے تعاون کیا، کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی۔ ہم نے تمام مسائل پر میٹنگ میں تبادلۂ خیالات کیا اور فیصلے اتفاق رائے سے کیے۔ اسی باعث ہم لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے،" صدر کا کہنا ہے۔

عہدیداروں کا انتخاب یہ دیکھ کر کیا گیا کہ ان کے پاس تنظیم پر صرف کرنے کے لیے وقت اور فرصت بھی ہے۔ صدر حامد رضا راج ہونے کی وجہ سے ہر وقت علاقے میں ہی پائے جاتے تھے اور ان تک لوگوں کی رسائی ہو سکتی تھی۔ اختر امام دکاندار ہیں اور ان کی دکان بھی علاقے میں ہے۔ ہر وقت لوگ ان سے مل سکتے تھے۔ محمد شمس الدین کو ہر ماہ ۱۵ دن کے لیے دن کو فرصت ہوتی تھی کیونکہ پاکستان جوٹ مل میں ۱۵ دن وہ رات کی ڈیوٹی کرتے تھے۔

جمال اختر اور امین شیدائی صدر پوسٹ آفس میں ملازم ہیں۔ وہ تنظیم کی تمام خط و کتابت اور تحریری کام کے ذمہ دار ہیں اور شام چار بجے کے بعد فرصت میں ہوتے ہیں۔

کمیونٹی کے ترقیاتی اقدامات

لیز حاصل کرنے کے لیے جدوجہد

کراچی واٹر بورڈ کے ذریعے جون ۱۹۸۵ میں پلاٹ نمبر الاٹ کرنے کے لیے ایک سروے کیا گیا۔ کراچی واٹر بورڈ کے انسپکٹر مسٹر حیدر محمد شمس الدین کے دوست تھے۔ کمیٹی نے علاقے کے کونسلر کے ذریعے پلاٹ نمبر الاٹ کرنے کی درخواست دی۔ شمس الدین کہتے ہیں کہ "ذاتی تعلقات ہونے کے باوجود غازی آباد فلاحی کمیٹی کے عہدیداروں اور کارکنوں کو واٹر بورڈ کے دفتر میں دو ماہ صرف کرنے پڑے تب کہیں سروے کا اجازت نامہ حاصل ہوا"۔

کمیٹی کے کارکنوں نے کراچی واٹر بورڈ کے سرویئر کے ساتھ مل کر سروے کا کام کیا اور مکانات پر نمبر ڈالے۔ خالی پلاٹوں کو نمبر الاٹ کرنے کے لیے سرویئر کو ۵۰۰ روپے ادا کیے گئے۔ پلاننگ غازی آباد فلاحی کمیٹی نے کی۔ سڑکوں اور گلیوں کی نشان دہی کی گئی۔

نومبر ۱۹۸۵ میں، علاقے میں پانی نہ ہونے کے باوجود واٹر بورڈ سے ہر سروے شدہ پلاٹ کے نام کمیٹی کے اراکین نے پانی کے بل حاصل کر لیے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ پانی کے نلکے تو ہیں نہیں، یہ بل کیسے؟ کارکنوں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ اپنے بل سنبھال کر رکھیں بعد میں کام آئیں گے۔ پھر تمام بل جمع کر کے فوٹو کاپیاں بنوائی گئیں۔ کمیٹی نے میئر کو ایک مراسلہ روانہ کیا جس میں یہ فوٹو کاپیاں منسلک کر دی گئیں۔ درخواست میں کہا گیا کہ ساکنان غازی آباد کو پانی کے بل موصول ہوئے ہیں جن کی پشت پر درج ہے کہ اگر بل مقررہ تاریخ تک ادا نہیں کیے جائیں گے تو کنکشن منقطع کر دیا جائے گا۔ میئر سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ یہ کنکشن منقطع کروا دیں۔ میئر کو اس درخواست پر تعجب ہوا۔ انھوں نے علاقے کے کارکنوں کو ملاقات کے لیے بلایا اور اپنی بات سمجھانے کو کہا انھوں نے میئر کو بتایا کہ علاقے میں پانی کی کسی لائن کا وجود نہیں اس لیے بل ادا کرنا ان پر واجب نہیں۔ میئر نے تمام بل منسوخ کر دیے۔

اس طرح ان لوگوں نے پلاٹ پر اپنی ملکیت کا پکا ثبوت فراہم کیا جس نے بعد میں ان کے علاقے کی ریگولرائزیشن میں مدد دی۔ یہ ترکیب شمس الدین کے ایک دوست نے سجھائی تھی جو کراچی واٹر بورڈ میں ملازم تھے۔

بلدیاتی انتخابات

تاہم جلد ہی تنظیم کی سرگرمیاں تقریباً رک گئیں۔ ایک رکن کمیٹی بتاتے ہیں کہ "۱۹۸۵ کی ابتدا ہی سے ہم کو ایم کیو ایم کے مقامی لیڈر کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں کہ ہم علاقے کی ترقی کے لیے اپنی سرگرمیاں روک دیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے چپ ہو کر بیٹھ رہے۔"

۱۹۸۷ میں بلدیاتی اداروں کے الیکشن منعقد ہوئے۔ غازی آباد سے کونسلر کے لیے پانچ اشخاص۔ سید بدرالدین، حاجی حنیف، فخر عالم، محمد فخرالدین اور تاج محمد۔ مقابلہ کر رہے تھے۔ ویسے کے ایم سی کے یونٹ ۱۱۸ کے لیے کل ۱۸ امیدوار مقابلے میں تھے۔ ہر امیدوار تنظیم کے تعاون کا طالب تھا۔ تنظیم کی کوشش تھی کہ انتظامیہ کے ۳۰ ارکان اتفاق رائے سے کسی ایک امیدوار کا فیصلہ کر لیں مگر ایسا ہو نہ سکا اور اس طرح ۱۲ اراکین مختلف کیمپوں میں بٹ گئے۔

انتظامیہ کے ۱۸ اراکین۔ حامد رضا، محمد شمس الدین، اختر امام، جمال اختر، امین شیدائی، آصف جمال اور محمد سلیمان۔ نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ غازی آباد کے تمام چھ کے چھ محلوں سے ۱۲۰۷ افراد نے اس جلسے میں شرکت کی۔ انھوں نے لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ خود کسی ایک امیدوار کا فیصلہ کریں اسی کو ووٹ دیے جائیں۔ لوگوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ غازی آباد کا ہی کوئی امیدوار انتخاب لڑے۔ انھوں نے محمد شمس الدین کو امیدوار کی حیثیت سے منتخب کیا اور ان کی مہم کے لیے ۷۰۰۰ روپے جمع کیے۔

محمد شمس الدین نے اپنی الیکشن مہم کے لیے ۵۰ روپے چندہ دیا۔ کاغذات نامزدگی آخری دن جمع کروائے گئے۔ تین امیدواروں نے شمس الدین کو تیس ہزار سے پچاس ہزار روپے تک بیٹھ جانے کے لیے پیش کیے مگر پیشکش قبول نہیں کی گئی۔ ایم کیو ایم کے نمائندے شمیم احمد کو گیارہ سو ووٹ ملے اور وہ انتخاب جیت گئے۔ شمس الدین کو ۳۷۵ ووٹ ملے اور وہ چوتھے نمبر پر رہے۔ اس کی وجہ سے بعد میں کونسلر اور غازی آبادی فلاحی کمیٹی کے درمیان کشمکش بڑھ گئی۔

۱۹۸۷ میں شمیم احمد علاقے کے کونسلر منتخب قرار پائے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اب ایم کیو ایم کے علاوہ کوئی دوسری تنظیم اس علاقے میں کام نہیں کرے گی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اب ایم کیو ایم اقتدار میں آگئی ہے اور وہی علاقے کے تمام کام کرے گی۔ "ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آپ ہی ہمارے علاقے میں آیئے اور ہمارے مسائل حل کرایئے،" غازی آباد فلاحی کمیٹی ممبر نے بتایا۔

"اس زمانے میں چار سال کی مدت کے لیے ہر کونسلر کو ۷۵۰۰۰۰ روپے سالانہ علاقے کے ترقیاتی کاموں کی مد میں ملا کرتے تھے۔ اب اس میں تبدیلی کر کے پانچ سال کی مدت کے لیے ہر کونسلر کو ترقیاتی کاموں کے لیے ۶۸۷۵۰۰۰ روپے دیے گئے تھے۔ یہ زیادہ سے زیادہ رقم تھی جو اب تک کسی کونسلر کو دی گئی تھی۔ مگر ہمارے علم میں نہیں کہ یہ رقم کہاں صرف کی گئی۔ انھوں نے خوبصورت ٹائلوں سے ایک چوک تعمیر کیا اور سڑکوں کی مرمت کروائی تھی۔"

"ہم خاموش نہیں رہے۔ ہم نے ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین اور مرحوم عظیم طارق کو لکھا کہ وہ معلوم کریں کہ رقم کہاں کہاں خرچ ہوئی اور تحقیق کریں کہ یہ رقم عوام کی فلاح میں صحیح صحیح استعمال ہو رہی ہے یا نہیں۔ ہم کو ان خطوط کا کوئی جواب نہیں ملا۔"

پانی کے لیے جدوجہد

ابتدائی ایام میں بستی میں پانی کی سپلائی کا کوئی نظام بھی موجود نہیں تھا۔ روزانہ استعمال کا پانی لانے کے لیے بھی لوگوں کو ۲ کلومیٹر دور جانا پڑتا تھا۔ کارکنوں نے کونسلر کے تعاون سے حکومت سے اس سلسلے میں ہم خیال کاری کی تو ۱۹۸۲ کے اوائل میں روزانہ کا ایک ٹینکر منظور ہوا۔ علاقے میں دو مقامات اس کی تقسیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ چھ ماہ بعد ٹینکروں کی تعداد ۸ سے بڑھا کر ۲۵ کر دی گئی۔ ایک شخص کو پانی کی تقسیم کا ذمہ دار بنایا گیا اور ہر گھر سے اس کو ۱۰ روپے یومیہ دیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ ہر کنستر کے ۵۰ پیسے وصول کیے جانے لگے۔ لوگ اب بھی پانی ٹینکروں سے ہی حاصل کر رہے ہیں۔ اب ٹینکروں کی تعداد بڑھ کر ۱۲۰ ہو گئی ہے۔ مگر درحقیقت لوگوں کو ۶۰ ٹینکرز ہی ملتے ہیں۔ باقی ۶۰ ٹھیکیدار فروخت کر دیتا ہے۔ ۱۵۰ تا ۵۰۰ روپے فی ٹینکر کے حساب سے خاصی معقول رقم بنتی ہے۔ لوگ ۱۵۰ روپے سے لے کر ۵۰۰ روپے ماہانہ تک موسم کی مناسبت سے پانی پر خرچ کرتے ہیں۔

۱۹۸۶ میں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اس علاقے میں پانی کی شدید قلت ہو گئی تھی۔ ایک ٹینکر کی قیمت ۸۰۰ روپے تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے ۱۹۹۰ میں لوگوں نے کراچی کی ایک غیر سرکاری تنظیم بستی کے تعاون سے اپنے خرچ پر تین عدد ہینڈ پمپ نصب کروائے۔ ہینڈ پمپ بستی کو یونی سیف کی طرف سے مفت ملے تھے مگر بورنگ اور متعلقہ اخراجات کے لیے لوگوں کو ۳۴۰۰۰ روپے چندہ جمع کرنا

پڑا۔ اورنگی میں امن وامان کی موجودہ صورت حال میں بھی لوگوں نے ۱۹۰۰ روپے خرچ کرکے ایک اور ہینڈ پمپ نصب کیا۔ یہ ہینڈ پمپ بھی بستی کی معرفت یونی سیف نے مفت مہیا کیا تھا۔

بجلی کے حصول کی جدوجہد

۱۹۸۸ میں غازی آباد کے پاس کی بستی گلشن بہار میں بجلی کے کھمبے نصب ہوئے۔ جمال اختر اور حامد رضا گلشن بہار کے قائدین کے پاس گئے اور بجلی حاصل کرنے کے طریقہ کار کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ گلشن بہار کے ایک کارکن مسٹر پاشا نے کے ای ایس سی سے بجلی حاصل کرنے کے طریقے سے آگاہ کیا۔

نکاس کی لائن کی آزمائش کے لیے واٹر ٹینکر کا استعمال

جمال اختر اور حامد رضا درخواست فارم حاصل کرنے کے لیے کے ای ایس سی کے آفس گئے۔ دفتر میں فارم موجود نہیں تھے مگر قریب ہی ایک پان کی دکان پر فارم ۳۰ روپے سیکڑہ کے حساب سے مل رہے تھے۔ یہ فارم کے ای ایس سی سے مفت ملنا چاہیے تھے۔ جمال اختر اور حامد رضا نے ۹۰ روپے دے کر ۳۰۰ فارم خریدے اور اپنے علاقے میں تقسیم کردیے۔ ۱۹۸۸ میں ۹۶ چالان جمع کرائے گئے۔ بار بار کی تگ ودو کے باوجود علاقے کا سروے کے ای ایس سی نے اکتوبر ۱۹۹۱ میں جاکر کیا۔

مئی ۱۹۹۳ میں این او سی ملا۔ دسمبر ۱۹۹۴ میں ۲۷ کھمبے منظور ہوئے۔ آج کل یہ کھمبے نصب کیے جارہے ہیں۔

صحت کی سہولتوں کے لیے کاوشیں

علاقے میں سات نجی مطب ہیں جو باہر کے ڈاکٹروں نے قائم کررکھے ہیں۔ روزانہ اوسطاً ۱۳۰ افراد ہر مطب میں جاتے ہیں۔ فی مریض اوسط فیس ۱۵ تا ۲۰ روپے ہے۔ پیٹ کے امراض اور ٹائیفائیڈ عام بیماریاں ہیں۔

علاقے میں کوئی ہومیو پیتھ نہیں ہے۔ غازی آباد میں کوئی اسپتال یا زچہ خانہ بھی نہیں ہے۔ ایمرجنسی کی صورت میں لوگوں کو قطر اسپتال جانا پڑتا ہے جو ایک سرکاری اسپتال ہے اور ۵ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

تعلیم کے لیے کاوشیں

غازی آباد میں چھ عدد پرائمری اور ۵ عدد سیکنڈری اسکول ہیں۔ سب کے سب نجی ملکیت میں ہیں۔ مالکان علاقے کے ہی باشندے ہیں۔ انھوں نے یہ اسکول تھوڑا تھوڑا کرکے بنائے ہیں۔ ایک دو کمروں سے اسکول شروع کرکے دھیرے دھیرے بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری امداد کے خود بڑھائے ہیں۔ پرائمری اسکول کی فیس فی بچہ ۳۵ سے ۴۰ روپے اور سیکنڈری اسکول میں ۳۵ تا ۶۵ روپے ہے۔ علاقے کے ۹۰ فی صد بچے کسی نہ کسی اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں یا گھر پر پڑھتے ہیں۔ ۷۰ فی صد آبادی خواندہ ہے۔

پارکوں کے لیے کاوشیں

مجاہد کالونی والوں کو امید تھی کہ بطور پارک ان کو ۵۰۰ مربع گز کا ایک رفاہی پلاٹ ملے گا۔ ۱۹۸۳ سے اس پلاٹ پر تجاوزات کا غلبہ ہے۔ یہاں ۱۲۰ مربع گز کے رقبہ پر ۲ عدد کمرے بنالیے گئے، مگر جب بنانے والوں کو کچی آبادی ڈائریکٹوریٹ سے پلاٹ نمبر الاٹ نہیں ہوا تو اس نے اسے فروخت کردیا۔ یہ پلاٹ مقامی لوگوں کی تنبیہ کے باوجود کئی مرتبہ بک چکا ہے۔ جون ۱۹۹۳ میں محمد شمس الدین، حامد رضا، جمال اختر اور اختر امام نے زیڈ ایم سی غربی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر عرفان علی سے علاقے میں کھلی کچہری لگانے کی درخواست کی۔ اس کچہری میں لوگوں نے مانگ کی کہ اس پلاٹ کو بطور پارک مختص کردیا جائے۔ پروجیکٹ ڈائریکٹر نے لوگوں کی مانگ قبول کرلی۔

تین دن کے اندر اندر اس پلاٹ پر تعمیر شدہ دونوں کمرے ڈھادیے گئے۔ بستی والوں نے پارک کے اردگرد باڑھ لگادی، زمین کو ہموار کیا، گڑھے کھودے اور پودے لگائے۔ پودے او پی پی نے فراہم کیے تھے۔ پارک کا نام عرفان علی پارک رکھ دیا گیا۔

پھر اکتوبر ۱۹۹۳ میں مقامی قبضہ گیر نے پودے اکھاڑ کر پارک کی باڑ توڑ کر کارکنوں کو دق کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے ایس ڈی ایم سے فریاد کی مگر قبضہ گیروں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔

اپریل ۱۹۹۴ میں غازی آباد فلاحی کمیٹی نے پارک میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا اور ایم این اے آفاق خاں شاہد، وزیر اعلیٰ سندھ کے مشیر مسٹر شاہد عالم اور عرفان علی کو مدعو کیا۔ جلسے میں انھوں نے پارک کی ترقی کے لیے بجٹ مختص کرنے اور اس کو قبضہ گیروں کی دست برد سے محفوظ کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ ایم این اے نے ان کی مانگ منظور کی اور سر عام قبضہ گیروں کو اس پارک پر قبضہ کرنے سے باز رہنے کو کہا۔ تقریب کے بعد ایم این اے، وزیر اعلیٰ کے مشیر اور عرفان علی نے یہاں پودے لگائے۔ یوں پارک قبضہ گیروں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا۔ لوگوں نے پودے لگانا اور پارک کو سنوارنا جاری رکھا۔

کونسلر کے توسط سے ترقیات کی کوششیں

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے غازی آباد کا سب سے اہم مسئلہ پانی ہے۔ اس علاقے کے ایک کارکن محمد اختر امام بتاتے ہیں کہ "مجھ کو پانی لینے رحمت چوک تک جانا پڑتا تھا، بعد میں ہم نے اپنا حوض بنالیا۔ ہم کونسلر کے دفتر سے آنے والے ٹینکر کو ۲۰ روپے ادا کرتے تھے۔ بعد میں فی ٹینکر ۲۰۰ روپے ادا کرنا پڑے۔" کارکنوں نے فراہمی آب کے نظام کو سدھارنے کی کوشش جاری رکھیں۔

۱۹۸۴ میں کے ایم سی کے میئر عبدالستار افغانی اور علاقے کے کونسلر محمد شریف الدین تھے۔ کمیٹی جا کر کونسلر سے ملی اور ان کو علاقے میں آنے کی دعوت دی۔ کونسلر کو غازی آباد کے لوگوں کی تنظیمی صلاحیتوں پر اعتقاد نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے اس کو ووٹ بھی نہیں دیے تھے۔ کمیٹی نے محسوس کیا کہ الیکشن میں کامیاب ہو جانے کی بنا پر اس کی ذمہ داری ہے کہ علاقے کی فلاح کے لیے کام کرے۔ کونسلر نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

کمیٹی نے پانی کے ٹینکروں کی منظوری کے لیے کونسلر ظہیر الدین کی معرفت کوششیں شروع کر دیں۔ علاقے کے کونسلر نے یہ دیکھا کہ متصل علاقے کا کونسلر ہمارے علاقے کے کارکنوں کے قریب آتا جا رہا ہے تو اس نے دعوت قبول کی اور ہمارے علاقے میں آیا،" محمد شمس الدین نے بتایا۔

ڈھائی سو افراد جلسے میں شریک ہوئے جس میں کونسلر کے سامنے تین مانگیں پیش کی گئیں۔ ایک علاقے کے لیے پانی کے ٹینکر فراہم کرنے کی؛ دوسری علاقے کے سوک پٹوں سے گندگی اُٹھا کر لے جانے کے لیے کے ایم سی کے ٹرکوں کی اور تیسری پلاٹوں کے نمبر الاٹ کرنے کے لیے علاقے کے سروے کی۔

کونسلر نے ان کی مانگیں فوراً قبول کر لیں۔ علاقے کے لیے ایک پانی کا ٹینکر منظور ہوا۔ علاقے میں کوئی ٹینک موجود نہیں تھا جس میں پانی ذخیرہ کیا جاتا اس لیے لوگوں نے مسجد نورانی کے حوض میں پانی جمع کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس طرح نمازی وضو بھی کر سکتے تھے اور لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پانی کی فراہمی روزانہ یقینی بنانے کے لیے ٹینکر ڈرائیور کو ۲۰ روپے ادا کیے جاتے تھے۔

۱۹۸۶ میں میئر افغانی کے دور میں حب ندی سے ضلع غربی کے علاقوں کے لیے ایک ۴۸ انچ قطر کی لائن منظور کی گئی تھی مگر ڈالی نہ جا سکی۔

غازی آباد میں ایشین ڈیولپمنٹ بنک کی مالی امداد کا منصوبہ

کراچی اربن ڈیولپمنٹ پروگرام (کے یو ڈی پی) کے تحت اور اے ڈی بی قرضہ نمبر ۹۳۷ ایس ایف-پی اے کے کی مدد سے کے ایم سی کو اورنگی کے بالائی علاقوں میں پانی اور نکاس کی لائنیں بچھانے اور سڑکوں کی تعمیر کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ غازی آباد بھی اورنگی میں ایک ذیلی علاقے (سب پروجیکٹ ایریا-ون) کی حیثیت سے شامل تھا۔

نیشنل انجینئرنگ سروسز پاکستان (NESPAK) نامی ایک غیر سرکاری مشاورتی ادارے کو کے اے ڈی کے ایم سی نے پانی اور نکاس کی لائنوں اور سڑکوں کا نقشہ مرتب کرنے پر مامور کیا۔ کراچی واٹر بورڈ کے ذمے اس منصوبہ کا تخمینہ لگانا اور عمل در آمد کرنا تھا۔ کے ڈبلیو ایس بی نے ٹینڈر طلب کیے اور ایک اہل ٹھیکیدار کو کام دے دیا گیا۔

اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کی مداخلت

عقیلہ اسمٰعیل کی کوششوں سے میئر کراچی اور او پی پی کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ اس زمانے میں وہ میئر کی تکنیکی مشیر تھیں۔ ان کو او پی پی کے طریقہ کار اور اورنگی میں صفائی ستھرائی کے کاموں میں عوام کے تعاون کا علم تھا۔ وہ او پی پی آر ٹی آئی کی ڈائریکٹر پروین رحمٰن کی بڑی بہن ہیں۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۹۰ میں او پی پی کے نمائندوں اور میئر کی میٹنگ کروائی۔

اس میٹنگ میں میئر کے سامنے نکاس کی 'بیرونی' اور 'اندرونی' تعمیرات کے بارے میں اوپی پی کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اوپی پی نے میئر کے سامنے اوپی پی کے نمونے کی وضاحت کی جس میں صرف 'اندرونی' تعمیر کے لیے لوگوں کو مالی اور تعمیری امداد کے لیے متحرک کیا گیا تھا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ کے ایم سی بھی یہی نمونہ اپنائے اور خود کو صرف 'بیرونی تعمیرات' تک محدود رکھے اور یوں اخراجات بچا کر اس سے صفائی ستھرائی کے کام کو وسعت دے۔

نومبر ۱۹۹۰ میں اوپی پی نے سلائیڈوں کی مدد سے میئر کے سامنے اورنگی میں صفائی ستھرائی کے سدھار میں عوام کی پیش قدمی کے نتائج اور مبالغہ آمیز نقشوں اور بدعنوانی کے باعث زیادہ لاگت سے تعمیر کیے ہوئے کے ایم سی کے کام کو دکھا کر کے ایم سی کے فنڈز کی بربادی کو ظاہر کیا۔ میئر کو اورنگی کا دورہ کرنے کی دعوت بھی دی گئی۔

میئر جنوری ۱۹۹۱ میں اوپی پی آفس آئے اور ان نکاس کی لائنوں کا معائنہ کیا جو وہاں کے باشندوں نے خود اپنی رقم لگا کر تعمیر کی تھیں۔ اس کے بعد میئر کے زیر صدارت اوپی پی کے نمائندوں اور کے ایم سی کے اعلیٰ افسران کے درمیان لگاتار کئی میٹنگیں منعقد ہوئیں تاکہ کے ایم سی کے اہل کاروں کو اوپی پی کا نمونہ اختیار کرنے پر قائل کیا جا سکے۔

کے ایم سی کے مشیر کی حیثیت سے او پی پی کی تقرری: مئی ۱۹۹۱ میں میئر نے اوپی پی کو دعوت دی کہ وہ اورنگی اور بلدیہ کے لیے اے ڈی بی کی مالی امداد والے منصوبے میں اس کا مشیر بن جائے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں کے ایم سی اور اوپی پی آر ٹی آئی کے درمیان معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اوپی پی کو سالانہ ۳ لاکھ روپے مشاورتی فیس دینا طے ہوا۔ معاہدے کی رو سے اوپی پی کو جو کام تفویض ہوا اس میں سینی ٹیشن کے سلسلے میں بیرونی اور اندرونی ترقیاتی کام؛ فراہمی آب؛ سڑکوں اور گلیوں کی پختگی سب کی صورت حال کی دستاویز سازی اور ضروری ترقیاتی کاموں کی نشان دہی اور ان پر عمل در آمد کے مراحل کے بارے میں مشورے دینا شامل تھے۔

'اندرونی' تعمیر جس میں گلیوں کی نالیاں اور چھوٹی رابطہ نالیاں شامل ہوتی ہیں اور 'بیرونی' تعمیر جس میں بڑے بڑے رابطہ نالے شامل ہوتے ہیں بھی اوپی پی کی مشاورت میں شامل تھیں۔ اس کام اور سڑکوں اور گلیوں کو پختہ کرنے کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے منصوبہ بندی کے سلسلے میں بھی ان کی مشاورت پر اتفاق کیا گیا۔

عمل در آمد کے مرحلے میں اوپی پی کا کردار مشاورتی اور کمیونٹی کو حرکت میں لا کر ان کے ساتھ تکنیکی تعاون (نقشے اور تخمینے مہیا کرنا، نگرانی کرنا، اوزار اور سانچے فراہم کرنا، توسیعی اور رہنما تحریریں فراہم کرنا، راجوں، پلمبروں اور فعال کارکنوں کو تربیت دینا، اور سمعی بصری امدادوں کی تیاری) تھا۔ اس کے علاوہ اوپی پی کے ذمے دستاویز سازی اور پورے سینی ٹیشن کے کام کی نگرانی بھی رکھی گئی۔

ابتدا میں ایک مشاورتی ادارے (عیساپک) کو 'اندرونی' اور 'بیرونی' تعمیرات دونوں کے نقشے تیار کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ اوپی پی آر ٹی آئی کے نظریے کو قبول کر لینے کے بعد کے ایم سی نے اس کو صرف 'بیرونی' سینی ٹیشن ترقیات تک محدود کر دیا۔

نیس پاک اور اوپی پی کے نمائندوں کے درمیان پہلی میٹنگ جون ۱۹۹۱ میں ہوئی۔ یہ میٹنگ کے ایم سی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر نے کروائی تھی۔ پروجیکٹ ڈائریکٹر نے عیساپک سے معائنے کے لیے اپنے نقشے اوپی پی کو دینے کے لیے کہا۔ اوپی پی نے مشیر کی حیثیت سے نقشوں کا معائنہ کیا اور اعتراضات پیش کیے۔ بعض مقامات پر سطحیں غلط تھیں اور مجوزہ لائنیں ڈھلان کے خلاف تھیں۔ ایک جگہ نکاس کی ٹرنک لائن ایک اسکول میں سے گذر رہی تھی۔ عیساپک اور ڈائریکٹر کچی آبادی کو 'بیرونی' ترقی کا تصور سمجھ میں نہیں آیا یا پسند نہیں آیا۔ پائپ کے ضرورت سے زیادہ قطر پر بھی اعتراضات کیے گئے۔

ابتدا میں پروجیکٹ ڈائریکٹر سلیمان میمن اوپی پی آر ٹی آئی کے اعتراضات سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اعتراضات تکنیکی علم کی کمی کی وجہ سے کیے گئے ہیں اور غیر ضروری ہیں۔ تاہم اوپی پی آر ٹی آئی نے نکاس کے نظام کا ایک متبادل ڈیزائن تیار کیا اور کے ایم سی کو دیا۔ ڈیزائن عیساپک نے قبول کر لیا۔ عیساپک نے اس ڈیزائن کی نقل کر کے پروجیکٹ ڈائریکٹر کو پیش کی۔ ڈائریکٹر کچی آبادی کے ایم سی سے کئی میٹنگوں کے بعد تصفیہ ہوا جس کے نتیجے میں ڈیزائن کو دسمبر ۱۹۹۱ میں حتمی شکل دی گئی۔ مئی ۱۹۹۲ میں ٹینڈر جاری ہوئے اور بیرونی ترقیاتی کام جنوری ۱۹۹۳ میں شروع ہوا۔

کے ڈبلیو ایس بی، کے ایم سی کچی آبادی ڈائریکٹوریٹ اور او پی پی آر ٹی آئی کے مراسم: شروع شروع میں عیساپک اور ڈی کے اے کے سائٹ انجینئر اور ایگزیکٹو انجینئر کو اچھا معیاری کام کروانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اوپی پی آر ٹی آئی نے تحریری طور پر خامیوں کی نشان دہی کی مگر انجینئروں نے ٹھیکیدار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

اوپی پی کی طرف سے ڈائریکٹر کچی آبادی کو ماہ بہ ماہ نگرانی کی رپورٹ روانہ کی جاتی تھی۔ کے ڈبلیو ایس بی کے اعلیٰ افسران اوپی پی کی ان نگراں رپورٹوں سے خوش نہیں تھے۔ ایک دفعہ کے ڈبلیو ایس بی میں میٹنگ کے دوران عرفان علی نے واٹر بورڈ کے ناقص کام کا معاملہ اٹھایا۔ اوپی پی کا ایک نمائندہ وہاں موجود تھا جس نے نقائص سمجھائے۔ کے ڈبلیو ایس بی کے انجینئر مسٹر چانڈیو نے کہا، "مجھے نہیں معلوم کہ مشیر کی حیثیت سے اوپی پی کا تقرر جائز بھی ہے یا نہیں۔ اوپی پی ہم سے جواب طلبی کی مجاز نہیں۔" عرفان علی نے جواب دیا کہ ڈائریکٹر کچی آبادی نے اوپی پی کو مشیر مقرر کیا تھا۔ نگرانی رپورٹ جب ڈی کے اے کے ایم سی میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر ہمارے دفتر کا اندرونی معاملہ ہو جاتی ہے۔" خوش قسمتی تھی کہ عرفان علی ایک ایماندار مخلص تھے اور معیار کے معاملے میں کوئی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ عرفان علی جو باقاعدگی سے کے ڈبلیو ایس بی کے چیئرمین اور چیف انجینئر سے ماہانہ جائزہ میٹنگیں کرتے تھے۔ انھوں نے اوپی پی کی نگرانی رپورٹوں کی بنیاد پر اس مسئلے کو اٹھایا اور صاف صاف کہہ دیا کہ غیر معیاری کام قبول نہیں کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر معیار برقرار نہیں رکھا گیا تو ادائیگی نہیں کی جائے گی۔ یوں کے ڈبلیو ایس بی کے اعلیٰ افسران نے سائٹ انجینئروں اور ایگزیکٹیو انجینئر پر زور ڈالا کہ معیار کو برقرار رکھیں اور اوپی پی سے تعاون کریں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انجینئروں نے اوپی پی کے دفتر آکر کام پر تبادلۂ خیالات کرنا شروع کیا۔ یہ طے ہوا کہ خامیوں کی نشاندہی پہلے کے ڈبلیو ایس بی کے سائٹ انجینئروں اور اوپی پی کے درمیان ہونے والی ہفتہ وار میٹنگ میں کی جائے۔ اگر خامیاں دور نہ ہوں تب اوپی پی اس کا ذکر کے ایم سی کو بھیجی جانے والی نگرانی رپورٹ میں کرے۔ تاہم انجینئروں نے خود کبھی ٹھیکیداروں کو نہیں ٹوکا۔ اوپی پی کے سپروائزر کو ناقص کام کی نشاندہی کرنا پڑتی تھی جس کو انجینئر ٹھیکیدار سے درست کروا دیتے تھے۔ اس طرح ۱۸۰۰۰ رواں فٹ طویل ٹرنک لائن ۵۴ لاکھ روپے کی لاگت سے بچھی جو اے ڈی بی نے قرض دیے اور ان کو کے ایم سی ۲۰ سال میں ادا کرے گی۔

سینی ٹیشن میں عوام کا کردار

'بیرونی' ترقیاتی کام: اوپی پی اپنی حدود سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ انجینئروں اور ٹھیکیداروں کی بدعنوانی کو روکنے کا اس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس لیے اس نے نگرانی کے کام میں علاقے کے لوگوں کا تعاون حاصل کیا۔

اوپی پی کے نمائندوں اور علاقے کے فعال کارکنوں کے مابین متعدد میٹنگیں منعقد ہوئیں۔ ان میٹنگوں میں نقشہ اور ڈیزائن اچھی طرح سمجھا کر فعال کارکنوں کے حوالے کر دیا گیا۔ پلان کے اندر محل وقوع کی تفصیلات، پائپ لائن کی گہرائی اور مین ہولوں کی تعداد سب کا ذکر تھا۔ سیمنٹ کس تناسب میں استعمال ہو، کہاں تک کھدائی ہو، ساری پیائش اوپی پی نے کارکنوں کو ذہن نشین کرادی گئی تھیں۔ مین ہولوں کی تیاری کا طریقہ اور کنکریٹ والے حصے میں کتنا لوہا لگا ہو سب سمجھا دیا گیا تھا۔

لوگوں کو پائپ کی کوالٹی جانچنے کا طریقہ بھی بتادیا گیا تھا۔ اس قسم کی نگرانی اس لیے ضروری تھی کہ معیار برقرار رہے اور لوگوں نے جو پیسہ 'اندرونی' تعمیر کے تحت اپنی نکاس کی لائنیں ڈالنے پر خرچ کیا تھا برباد نہ جائے۔

غازی آباد فلاحی کمیٹی کے کارکنوں نے اپنے اراکین کو نگرانی پر لگادیا۔ تین مین ہولوں تک (۱۰۰ سے ۳۰۰ رواں فٹ) کے چار فاصلوں تک دو دو اراکین کو نگرانی کے لیے مقرر کر دیا گیا کہ کام میں نقائص کا پتا لگائیں۔ ان سے کہا گیا تھا کہ کام کو رکوانے کی کوشش نہ کریں، صرف خامی اوپی پی کے علم میں لے آئیں۔ مشترکہ معائنے کے بعد کے ڈبلیو ایس بی کو اس کے بارے میں بتادیا جاتا تھا جو پروجیکٹ ڈائریکٹر کے ذریعے دباؤ ڈالتا تھا۔ بعد میں جب کارکنوں کے حوصلے بلند ہو گئے تو وہ خود ہی ناقص کام کو رکوا دیتے تھے۔ لوگوں نے رمضان کے دوران تراویح اور سحری کے بعد جا جا کر کام کو چیک کیا اور اوپی پی کو ۶۰ خراب مین ہولوں کی اطلاع دی۔ پروجیکٹ ڈائریکٹر، کے ڈبلیو ایس بی کے انجینئروں، اوپی پی کے کارکنوں اور علاقے کے فعال کارکنوں نے مل کر موقعے کا معائنہ کیا اور تمام ناقص مین ہولوں کو توڑ کر دوبارہ بنانے کا حکم دیا۔ ۱۵۰ سے زیادہ مین ہولوں کے ڈھکن بھی تبدیل کیے گئے۔

گلیوں کے فعال کارکنوں نے کام کی تکمیل کے بعد ٹھیکیدار کو حتمی ادائیگی سے قبل کی چیکنگ کو بھی سپروائز کیا۔ ہر علاقے میں ٹھیکیدار اور کے ڈبلیو ایس بی کے انجینئر اپنے بلوں پر این او سی حاصل کرنے کے لیے ان لوگوں پر انحصار کرتے تھے۔ فعال کارکنوں سے این او سی حاصل کرنے کے بعد ہی اوپی پی کے ڈبلیو ایس بی کو حتمی ادائیگی کے لیے این او سی جاری کرتی تھی۔

'اندرونی' تعمیرات: جب لوگ 'بیرونی' ترقیاتی کام کی نگرانی میں شامل ہو گئے تب اوپی پی نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ کے ایم سی ان کی گلیوں اور گھروں میں نکاس کی لائنیں نہیں ڈالے گی۔ اپنی گلیوں میں نکاس کی لائن ڈالنے کی ذمہ داری مکینوں کی ہو گی جو اسے اپنے ہی خرچ سے ڈالیں گے۔ 'بیرونی' کام کی تکمیل سے قبل ہی اوپی پی آر ٹی آئی نے اندرونی سینی ٹیشن کا سروے کر لیا تھا اور ڈیزائن اور تخمینہ

تیار کر کے گلیوں کے منتخب یا نامزد کردہ لین منیجر کے حوالے کر دیا تھا۔

او پی پی آر ٹی آئی نے گلیوں کے لوگوں کو متحرک کیا اور ان کی تکنیکی رہنمائی کی اور مین ہول تیار کرنے کے لیے سانچے فراہم کیے۔ ہر تنظیم کی اکائی ایک گلی تھی۔ میٹنگوں میں گلیوں کے مکینوں کو بتایا گیا کس طرح اپنی جیب سے اپنی ہی نگرانی میں گلیوں کی سینی ٹیشن کے لیے کام کریں۔ لین منیجر اپنی گلی کے ہر گھر سے او پی پی کے دیے ہوئے تخمینے کے مطابق رقم جمع کرتا۔ وہی ضروری سازوسامان خریدتے، مزدور رکھتے اور اپنی اپنی گلیوں میں نکاس کی لائن بچھاتے تھے۔ او پی پی لین منیجر کے ساتھ اس کام کی نگرانی کرتی تھی۔ اس وقت تک ۶۷ گلیوں میں لوگ اپنی مدد آپ کے تحت ایک لاکھ چوالیس ہزار روپے کی لاگت سے نکاس کی لائنیں ڈال چکے ہیں۔

پروجیکٹ ڈائرکٹر، اور او پی پی آر ٹی آئی اور جیس پاک کے نمائندے مین ٹرنک لائن کا مشترکہ معائنہ کرتے ہوئے

سڑکوں کی تعمیر

او پی پی نے مشیر کی حیثیت سے کے ایم سی کو علاقے میں موجود سڑکوں اور متوقع ترقیاتی کام کے بارے میں دستاویز فراہم کیں۔ سڑکوں کا کام 'بیرونی' سینی ٹیشن کا کام مکمل ہونے سے پہلے ہی شروع ہو گیا۔ انجینئر پریشان تھا کہ سینی ٹیشن لائنوں کے پڑنے سے پہلے ہی سڑکیں اور لنک سڑکیں تعمیر کی گئیں تو ان کو سینی ٹیشن لائن ڈالنے کے وقت کھودنا پڑے گا۔ انجینئر نے او پی پی سے ایسے تمام مقامات کی نشان دہی کے لیے کہا جہاں جہاں گلیوں کی سینی ٹیشن کے لیے مستقبل میں لوگ کراس پائپ ڈالیں گے۔ او پی پی نے لین منیجروں سے مل کر انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ لوگوں نے تعاون کیا اور سڑکیں اس طرح تعمیر کی گئیں اور لنک سڑکیں اس ترتیب سے پختہ کی گئیں کہ کہیں بھی دوبارہ کھدائی کی نوبت نہیں آئی۔ فعال کارکنوں نے نگرانی کی کہ ایسی نوبت نہ آئے۔

ماخذ آب کی تعمیر

غازی آباد میں اے ڈی پی کی مالی امداد والے پروجیکٹ کی شقوں میں سے ایک ہر گلی میں پانی کی لائن بچھانا بھی تھی۔ مگر پانی کے ماخذ کی تعمیر کو شامل نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت کے ترقیاتی کام کے لیے پروگرام دوسرا تھا۔ چونکہ اے ڈی پی کی رقم کے ایم سی کی تحویل میں تھی اس لیے اس نے پہلے علاقے میں پانی کی لائنیں بچھانے کا فیصلہ کیا۔ جیساک نے ڈیزائن تیار کیا اور عمل درآمد کرنے والے ادارے کی حیثیت سے کے ڈبلیو ایس بی نے ٹھیکیداروں سے یہ لائنیں بچھوائیں۔

علاقے کے باشندے ناقص تعمیراتی کام کے سلسلے میں کے ایم سی کے ڈائرکٹر کچی آبادی سے شکایت کرتے ہوئے

مکینوں نے محسوس کیا کہ غیر معیاری کام کی وجہ سے فراہمی آب کی ترقی پر خرچ ہونے والی رقم ضائع ہو جائے گی۔ لوگ اس کی نگرانی میں شامل ہونا چاہتے تھے مگر ان کی رہنمائی

کرنے والا کوئی نہیں تھا (کیونکہ او پی پی پانی کے ترقیاتی منصوبے میں کے ایم سی کی مشیر نہیں تھی)۔ مکینوں نے سوچا کہ بغیر درست تشریحات جانے اور بغیر مناسب رہنمائی کے وہ کس طرح پانی کی لائنوں والے کام کو چیک اور سپروائز کریں۔

علاقے کے کارکن ڈائرکٹرز کو علاقے کے مسائل اور تعمیراتی کام کے نقائص سے آگاہ کرتے ہوئے

علاقے کے لوگوں نے ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی کو متعدد خطوط روانہ کیے جن میں ناقص پائپوں اور غیر معیاری کام کی شکایت کی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بعض مقامات پر پائپ نہیں ڈالے گئے مگر ٹھیکیدار کو ادائیگی کر دی گئی۔

ڈائریکٹر کچی آبادی کے ایم سی کا کردار

ایک ہی فرد بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے اگر وہ ایماندار اور بااختیار ہو۔ عرفان علی ایماندار بھی تھے اور بااختیار بھی۔ جب کبھی کسی نقص کی نشان دہی کی جاتی وہ سختی سے پیش آتے۔ خود موقعے کا معائنہ کرتے اور ناقص مین ہولوں کے انہدام کا حکم دیتے۔ انہدام کی تکمیل کے بعد وہ او پی پی سے رپورٹ طلب کرتے۔ دوران معائنہ وہ لوگوں سے بھی مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔

ایک بار کے ڈبلیو ایس بی کے سائٹ انجینئروں نے او پی پی کے سپروائزروں کی شکایت کی تو ڈائریکٹر نے اتنا پوچھا کہ کیا وہ رشوت طلب کرتے ہیں۔ جواب نفی میں تھا۔ اس پر ڈائریکٹر نے حکم دیا کہ او پی پی کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔

مین ہولوں کا انہدام انجینئروں اور ٹھیکیداروں کے لیے ایک بڑا سبق تھا کیونکہ عموماً غریب بستیوں میں غیر معیاری کام کبھی منہدم نہیں کیا جاتا۔ ان کو احساس ہو گیا کہ غلط کام قبول نہیں کیا جائے گا جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ معیار برقرار رکھیں۔

علاقہ کا ریگولرائزیشن

کے ایم سی نے ۱۹۸۹ میں ریگولرائزیشن کی نیت سے علاقے کا سروے کیا۔ علاقے کا نقشہ تیار کیا گیا اور ۱۹۹۰ میں مکینوں سے اعتراضات داخل کرنے کو کہا گیا۔ مکینوں نے اعتراضات داخل کیے۔ ۱۹۹۱ میں کے ایم سی کونسل نے نقشہ منظور کیا۔ منظور شدہ نقشے کے مطابق ریگولرائزیشن علاقہ صرف کل کا ۴۰ فیصد ہے۔ ۶۰ فیصد علاقہ متنازعہ زمین ہونے کی وجہ سے خالی دکھایا گیا ہے جبکہ وہ بھی آباد ہے۔ اہل کاروں نے اس کو صرف اس وجہ سے خالی چھوڑا کہ وہاں رہنے والوں سے ریگولرائزیشن کے نام پر رشوت وصول کریں۔ ۱۹۹۴ میں اس علاقے میں پلاٹوں کی ریگولرائزیشن کے لیے ایک 'لیز کیمپ' قائم کیا گیا۔ لیز چارجز میں زمین کی قیمت اور ترقیاتی اخراجات دونوں شامل ہیں جن کا نرخ مندرجہ ذیل ہے:

۱۲۰ مربع گز کے پلاٹ	۲۵ روپے فی مربع گز
۱۲۱ تا ۱۵۰ مربع گز کے پلاٹ	۳۵ روپے فی مربع گز
۱۵۱ تا ۲۴۰ مربع گز کے پلاٹ	۶۰ روپے فی مربع گز
۲۴۱ مربع گز سے زیادہ کے پلاٹ	۱۰۰ روپے فی مربع گز

علاقے کا ایک کارکن مین ہول کی تعمیر میں نقص کی نشان دہی کر رہا ہے

ناقص مین ہول کو توڑا جا رہا ہے

۱۲۰ مربع گز کے پلاٹ کی لیز حاصل کرنے کے لیے سرکاری چارجز کل پانچ ہزار پانچ سو روپے ہیں۔ اس میں زمین کے دام اور ترقیاتی اخراجات کے علاوہ کے ایم سی ٹکس، کورٹ فیس اور رجسٹریشن فیس شامل ہیں۔

لوگ لیز اسٹیٹ ایجنٹوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں کیونکہ طریقہ کار تکلیف دہ ہونے کی وجہ سے وہ خود اس چکر میں نہیں پڑتے۔ اس کام کے لیے ایجنٹ علیحدہ سے تین ہزار روپے وصول کرتا ہے۔ اہل کاروں اور ایجنٹوں کے درمیان گٹھ جوڑ ہے لہٰذا اگر کوئی فرد خود لیز حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اہل کار اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

عورتوں کا کردار

پس منظر

غازی آباد میں اکثر خاندان مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے آئے ہوئے مہاجر ہیں جو اردو بولنے والے ہیں۔ وہ دس پندرہ برس قبل یہاں آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ بنگلہ دیش کے شہری علاقوں میں رہتے تھے۔ اس طرح ان کا کلچر اور پس منظر شہری ہے۔

وہ مشترکہ خاندانی نظام کے مطابق رہتے ہیں اور ان کے اوسطاً ۳ تا ۶ بچے ہیں۔

سماجی رسم و رواج اور آمدنی

شادیاں والدین طے کرتے ہیں مگر یہ قرابت داروں اور نسلی گروپ سے باہر بھی ہوتی ہیں۔ تاہم ایک جیسا پس منظر رکھنے والوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پہلے لڑکی کی شادی چودہ برس کی عمر میں کردی جاتی تھی مگر آج کل لڑکی کی عمر ۱۸ یا ۲۰ برس ہونے کے بعد ہی شادی کرنے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ شادی پر بہت زیادہ اخراجات کیے جاتے ہیں اور اس کے لیے رقم بیسی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ بیسی عموماً عورتیں چلاتی ہیں اور ہر عورت ماہانہ ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے تک جمع کراتی ہے۔ بچوں سمیت گھر کا ہر فرد کام کرتا ہے۔ عورتیں کپڑے کی بنائی اور رنگائی کا کام کرتی ہیں جو پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ بہت سے مرد بھی اس کام میں اور اس کی فروخت میں مشغول ہیں۔ بچے بھی کام کرتے ہیں اور بعض حالات میں عورتوں کی آمدنی مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

بہت سی عورتوں نے اپنے مکانات کی تعمیر میں مالی اور مشاورتی دونوں طرح سے حصہ لیا ہے اور اس سلسلے میں فیصلوں میں بھی شامل رہی ہیں۔

ناقص مین ہول کو توڑا جا رہا ہے

تعلیم

بیشتر مرد اور عورتیں پڑھ اور لکھ سکتے ہیں۔ تاہم ۱۰ فیصد سے زیادہ بچے باقاعدہ اسکولوں میں نہیں جاتے کیونکہ اسکول مہنگے ہیں۔ مگر بچوں کو مسجد مدرسوں، ٹیوشن سینٹروں میں، جوکہ محلے میں ہیں اور سستے ہیں، بھیجا جاتا ہے یا خود گھر پر تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ طرز عمل لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے یکساں ہے۔

صحت

زیادہ تر مکین بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگوانے کی اہمیت سے واقف ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ دیہاتوں سے نقل مکانی کرنے والوں کی نسبت غازی آباد میں زیادہ تر زچگیاں (۵۰ فیصد سے اوپر) ہسپتالوں میں ہوتی ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کی خواہش کمیونٹی میں موجود ہے مگر سہولیات تک رسائی مشکل ہے۔

انٹرویوز اور کارکنوں کے خاکے

محمد مسعود، کے ڈبلیو ایس بی کے ایگزیکٹو انجینئر

محمد مسعود، اے ڈی بی کی مالی امداد والے پروجیکٹ کے اورنگی میں کے ڈبلیو ایس بی کے ایگزیکٹو انجینئر تھے جس کا منظور شدہ ڈیزائن کچی آبادی ڈائریکٹریٹ کے ایم سی نے مہیا کیا تھا اور جس پر عمل درآمد کے ڈبلیو ایس بی کر رہا تھا۔ "ڈیزائن کے مطابق ٹینڈر کی منظوری کے بعد مجھ کو یہ کام سونپا گیا،" مسعود بتاتے ہیں۔ "ڈیزائن کے مطابق صرف زیرزمین مین لائن کی تعمیر ہونا تھی جبکہ گلیوں کا کام لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہمارے دفتر نے مطلع کیا کہ او پی پی آر ٹی آئی ہمیں سپروائز کرے گی اور اس کی ماہانہ رپورٹ ڈی کے اے کے ایم سی کو بھیجے گی کیونکہ فاروق ستار میئر کے ایم سی نے ان کو اس پروجیکٹ کا مشیر مقرر کیا ہے۔ ہم کو حکم ملا کہ او پی پی سے رابطہ کریں۔

"جب معلوم ہوا کہ ہمارے کام کی نگرانی او پی پی کرے گی تو مجھے خدشہ محسوس ہوا۔ میں نے سوچا کہ او پی پی بھی ہمارے کے ڈبلیو ایس بی کے افسران کی طرح ہوگی اور اپنی ذاتی اغراض کے لیے سائٹ انجینئروں اور ٹھیکیداروں کو تنگ کرے گی، مگر او پی پی کے اراکین سے ملنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ میں نے ان کو ہمدرد پایا اور یوں ہمارا کام آسان ہوگیا۔

"ابتدا میں ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہ سکے۔ دونوں طرف بے اعتمادی پائی جاتی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ او پی پی سمجھتی ہے کہ ہم رشوت کے لیے ٹھیکیدار سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ رائے اس وقت بدلی جب ہم نے ہفتہ وار میٹنگیں شروع کیں۔ جب بھی میٹنگ میں او پی پی کے اراکین نے کسی خامی کی طرف اشارہ کیا ہم نے اس کو دور کیا۔

"ٹھیکیدار کا ٹینڈر تخمینے سے ۴۵ فی صد کم تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں بھی وہ کے ڈبلیو ایس بی کے دوسرے کاموں کی طرح غیر معیاری مال لگا کر اور کام کے معیار کو کم کرکے، کم کھدائی کرکے، بے بنیاد مین ہول بنا کر اور مین ہولوں کی دیواروں کی موٹائی کم کرکے اس پروجیکٹ سے کمائی کرلیں گے۔ ہم نے او پی پی کے سپروائزروں کے ساتھ مل کر اتنی سختی سے اس کو سپروائز کیا کہ ٹھیکیدار بھی ناراض ہوگئے مگر بہرحال کام کی کوالٹی کم نہ ہونے پائی۔

"ہم کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ لوگوں کو کام اور ڈیزائن کی ایک ایک تفصیل کا علم تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ کون سا مال استعمال ہوتا ہے، اس کا تناسب کیا ہوگا، مین ہول میں کتنا لوہا لگتا ہے، مین ہول کی دیواروں کی لمبائی کتنی ہو، مین ہول کی گہرائی کتنی ہو اور مین ہول کی بنیاد کتنی گہرائی پر ہو۔ لوگوں کی اچھی تربیت ہوئی تھی۔

ڈھلانوں کی پیائش

صرف 'بیرونی' کام کروانے سے محکمے پر مالی بوجھ کم ہو گیا اور جو بچت ہوئی وہ دیگر علاقوں کے کام آ سکی۔

"کہیں اور یہ ارتباط کام نہیں آ سکتا۔ اورنگی میں یہ اس لیے کامیاب ہوا کہ او پی پی، آر ٹی آئی کے پاس مہارت تھی۔ اورنگی کے لوگوں اور او پی پی کے مابین تعلقات بہت گہرے ہیں اور اعتماد بھی بہت ہے۔ اورنگی کے باشندے منظم اور تربیت یافتہ ہیں۔

"بلدیہ میں اے ڈی بی والے کام میں لوگوں سے اتنا گہرا تعلق قائم ہونا ممکن نہیں۔ نہ تو کوئی رسمی تنظیم موجود ہے اور نہ ہی لوگ تربیت یافتہ ہیں۔ علاقے کے مقامی لیڈروں نے ہم پر زور ڈالا کہ ہم ان کا حصہ رقم کی شکل میں دے دیں۔ اورنگی کے باشندوں کو علم تھا کہ وہ اپنی خود کی تعمیر کردہ لائن مین لائن سے جوڑیں گے اس لیے انھوں نے کوالٹی برقرار رکھنے پر توجہ دی اور ٹھیکیدار اس کا پابند ہوا۔ وہ دو چار سائٹ انجینئروں کو تو رشوت دے کر غیر معیاری کام کو منظور کروا سکتا تھا مگر علاقے کے سینکڑوں افراد کو رشوت دینا ظاہر ہے کہ ممکن نہیں۔ جب سینکڑوں افراد کام کی نگرانی پر مامور ہوں تو محکمہ بھی معیاری کام کروانے پر مجبور ہوگا۔"

لوگوں کے ہاتھوں تعمیراتی کام

"ہم نے سوچا کہ ایسے لوگوں کو جو تمام معلومات سے لیس تھے اور کام کی چیکنگ کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو سمجھتے تھے مطمئن کرنا مشکل ہوگا۔ مگر بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ اس سے معیار برقرار رکھنے میں مدد ملی۔ لوگوں نے موقع پر ہی خامیاں پکڑ کر ٹوکا اور او پی پی کے کارکنوں کو بھی آگاہ کیا۔

"او پی پی اور فعال کارکنوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ شراکت داروں میں آپسی اعتماد بڑھنے میں وقت لگا۔ کے ڈبلیو ایس بی کے سائٹ انجینئر سخت نگرانی کے عادی نہیں تھے۔ مین ہول خراب ہونے کی صورت میں توڑ دیے جاتے تھے۔ ہمارے سائٹ انجینئر اس کام کو چیک نہیں کر پاتے تھے کیونکہ یہ رمضان میں رات کے وقت کیا جاتا تھا۔ خامیاں علاقے کے لوگوں اور او پی پی نے پکڑیں۔

"کے ڈبلیو ایس بی کے ذریعے جو کام کیا جاتا ہے وہ اس کام سے چار گنا مہنگا ہوتا ہے جو لوگ خود کرتے ہیں کیونکہ اس میں ٹھیکیدار کا منافع بھی شامل ہوتا ہے۔ کے ڈبلیو ایس بی کے ذریعے

محمد شمس الدین، جنرل سیکریٹری، غازی آباد فلاحی کمیٹی

محمد شمس الدین مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۶ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان یوپی ہندوستان سے ۱۹۴۸ میں ہجرت کر کے وہاں گیا تھا۔ ان کے والد تاجر تھے اور ضلع

مقامی تنظیم کے جنرل سیکریٹری ڈائرکٹر کچی آبادی کو لوگوں کی کوششوں کے بارے میں بتا رہے ہیں اور ترقیاتی کام میں اعانت کی درخواست کر رہے ہیں

کھلنا، مشرقی پاکستان میں ایک ہوٹل کے مالک تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۹ میں آر ایس کے اسکول راجباڑی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ہوٹل کے کاروبار کی وجہ سے ان کے والد کھلنا میں رہتے تھے جبکہ باقی خاندان کھلنا سے ۱۰۰ کلو میٹر دور ایک چھوٹے قصبے راجباڑی میں رہتا تھا۔ ۱۹۷۰ میں مشرقی پاکستان کی خانہ جنگی کے دوران سارا خاندان کھلنا منتقل ہو گیا۔ وہاں محمد شمس الدین ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورس (ای پی سی اے ایف) میں شامل ہو گئے۔ تین ماہ کی تربیت کے بعد وہ پاکستانی فوج کے ساتھ بنگالیوں سے جیسور کے محاذ پر مارچ ۱۹۷۰ سے دسمبر ۱۹۷۰ تک برسرپیکار رہے دسمبر ۱۹۷۰ میں سقوط ڈھاکہ کے بعد وہ جنگی قیدی بن گئے اور راجشاہی سنٹرل جیل میں قید کر دیے گئے۔

مارچ ۱۹۷۴ میں شمس الدین کو رہائی ملی اور وہ اپنے خاندان کے پاس کھلنا چلے گئے۔ مغربی پاکستان کے جنگی قیدی تو ہندوستان میں قید رکھے گئے تھے جبکہ ای پی سی اے ایف کے جنگی قیدیوں کو بنگلہ دیش میں ہی قید رکھا گیا تھا۔ رہا ہونے کے بعد انھوں نے ریڈ کراس سے رجوع کیا اور اپنے اور اپنے خاندان کے پاکستان واپس جانے کے لیے فارم پر کیا۔ مگر ان کو پروانۂ راہداری نہ ملا۔ وہ ریڈ کراس کے چیف مسٹر گارڈنر سے ملے اور پروانہ راہداری دینے کی درخواست کی۔ ان کو بتایا گیا کہ پاکستان واپسی بند ہو چکی ہے اور پروانہ راہداری صرف ان کو ہی پیش کیا گیا، ان کے خاندان کو نہیں، انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے جیسے ۱۳۳ ای پی سی اے ایف والے اور بھی تھے جنہوں نے اپنے خاندان کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کیا۔

پروانۂ راہداری کی کوششوں کو تیز کرنے کے لئے شمس الدین نے 'آرمز' کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ ۱۹۷۴ سے ۱۹۷۹ تک وہ ڈھاکہ میں پاکستانی سفارت خانے کے اعلیٰ افسران مسٹر محمد خورشید اور فرسٹ سیکریٹری سے ملتے رہے۔ ۱۹۷۹ میں ڈاکٹر کمال سفیر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ان ۱۳۳ ای پی سی اے ایف والوں کے معاملے کو آگے بڑھایا۔ جس کے نتیجے میں ان کے خاندان کو اپنے خرچ پر پاکستان آنے کی اجازت ملی۔ وہ ۱۹۷۹ میں کراچی پہنچے اور قصبہ کالونی میں اپنے ایک دوست مسٹر سلیمان کے ساتھ ٹھہرے۔ پھر وہاں سے ایک ماہ کے لیے دھابے جی میں ایک اور دوست کے مہمان رہے۔

شمس الدین نے ایک جوٹ مل میں روزانہ اجرت پر کام شروع کیا جہاں ڈیڑھ ماہ کام کر کے انھوں نے ہر پندرھواڑے ۱۵۰ روپے کمائے۔ پھر انھوں نے دھابے جی چھوڑ کر ناصر کالونی کورنگی میں ایک مکان کرائے پر لیا۔ انھوں نے پاکستان جوٹ مل میں ۷۰۰ روپے ماہوار پر ایک لوم ورکر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ چھ ماہ بعد ان کے خاندان کے باقی افراد بھی پاکستان آ گئے اور ان کے ساتھ ناصر کالونی کورنگی میں ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ ۱۹۷۹ سے ۱۹۸۲ تک وہ کورنگی میں قیام پذیر رہے اور ناصر کالونی میں کوئی نہ کوئی سماجی کام کرتے رہے۔

جوٹ مل میں ان کو ۱۵ یوم دن میں اور ۱۵ یوم رات میں ڈیوٹی دینا پڑتی تھی اس لیے وہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے دنوں میں دن کو فارغ ہوتے تھے۔ ان کی سماجی سرگرمیوں میں بیماروں کو ڈاکٹر یا اسپتال تک لے جانا تھا۔

وہ لوگوں کو روزگار دلانے میں بھی مدد دیتے تھے۔ شمس الدین حسین گلزار کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے جو اس وقت مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے۔ شمس الدین اور حسین گلزار نے مل کر ناصر کالونی میں ایک فلاحی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ وہ تنظیم کے جنرل سیکریٹری اور حسین گلزار صدر چنے گئے۔ شمس الدین نے 'شاہین اسٹار کلب' کے نام سے ایک فٹ بال کلب بھی قائم کیا کیونکہ وہ بچپن سے فٹ بال کے شوقین تھے۔ علاقے کے کونسلر کے تعاون سے کالونی کے ایک کھلے میدان کو ہموار کیا گیا اور کے ایم سی کے ذریعے روشنیاں لگوائی گئیں۔

۱۹۹۲ میں انھوں نے ۱۲۰۰ روپے میں ۱۲۰ مربع گز کا ایک پلاٹ مجاہد کالونی، غازی آباد میں خریدا۔ انھوں نے نیوڈال کر ایک مقامی ٹھیلے والے سے ماہانہ قسطوں پر بلاک خریدے۔ شمس الدین نے ایک راج لگا کر ایک کمرہ اور دوسرے کمرے کی دیواریں بنائیں۔ وہ اپنے خاندان کو لے کر غازی آباد منتقل ہو گئے اور رفتہ رفتہ اپنے مکان کی تعمیر مکمل کی۔

ان دنوں ابو بکر کالونی میں چند خاندان آباد تھے، بنگالیوں کے ۱۲ خاندان مجاہد کالونی میں تھے، چند خاندان گرین ٹاؤن میں تھے اور کرسچین کالونی میں چند گھر تھے۔ غازی آبادی میں یہ گھروندے پانچوں محلوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

مسجد میں بنگالی خاندانوں کا بنایا ہوا ایک حوض تھا۔ "ہم نے بڑا کڑا وقت جھیلا۔ اس وقت پانی، بجلی اور ٹرانسپورٹ جیسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی،" شمس الدین بتاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اردگرد لوگوں کو اکٹھا کیا اور غازی آباد فلاحی کمیٹی کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ ایک اور مقامی تنظیم غازی آباد انجمن فلاح و بہبود کے نام سے قائم تھی مگر انہیں علم ہوا کہ اس تنظیم کے فعال کارکن زمینوں پر قبضہ کرنے اور لوگوں سے رقم اینٹھنے میں ملوث تھے۔ اس لیے انھوں نے ۱۹۸۴ میں لوگوں کو اکٹھا کر کے 'غازی آباد فلاحی کمیٹی' تشکیل دی۔ تب سے وہ اس تنظیم کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ شمس الدین نے تنظیم کی طرف سے ٹینکروں کی منظوری حاصل کرنے، ووٹر لسٹ میں مکینوں کا اندراج کرانے میں، پلاٹ نمبر حاصل کرنے میں، بجلی کے لیے

کوششوں میں اور کونسلر اور سرکاری محکموں کے ساتھ علاقے میں سہولیات حاصل کرنے کے لیے ہم خیال کاری میں بہت اہم رول ادا کیا۔ علاقے میں ان کی ہر دلعزیزی نے انھیں ۱۹۸۷ میں کونسلر کا الیکشن لڑنے پر مجبور کیا مگر وہ ہار گئے کیونکہ غازی آباد کے ووٹ پانچ دیگر نمائندوں میں تقسیم ہو گئے۔

شمس الدین نے ۱۹۸۷ میں پاکستان جوٹ مل کی ملازمت ترک کر دی اور ۲۰۰۰ روپے ماہوار پر بفر زون میں ایک سینیٹری کی دکان میں ملازمت کر لی۔ وہاں انھوں نے ۱۹۹۲ تک کام کیا۔ ۱۹۹۱ میں انھوں نے شام ۵ بجے کے بعد سینیٹری سامان کمیشن (۵۰ فیصد منافع) پر فروخت کرنا شروع کیا۔ دو سال بعد دکاندار سے اختلاف ہو جانے کے بعد انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔

اس کے بعد شمس الدین نے اپنے ایک دوست کے کارخانے میں پلاسٹک ڈھالنے کا کام ایک ہفتے تک سیکھا اور اپنے گھر میں پلاسٹک مولڈنگ کی ایک مشین لگالی۔ اب ان کے پاس چار عدد مشینیں ہیں۔ اس کام سے وہ ۳۰۰۰ روپے کے لگ بھگ کما لیتے ہیں۔

غازی آباد میں جن دنوں اے ڈی کی مالی امداد والا پروجیکٹ جاری تھا، شمس الدین نے علاقے کے ۱۸ فعال کارکنوں پر مشتمل ایک نگران کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے غازی آباد میں اے ڈی کی مالی امداد والے نکاس کے کام کی کوالٹی کی برقرار رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اپنے کام کے باعث علاقے میں ان کی بڑی عزت ہے۔

شمس الدین کی علاقے میں اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ مجاہد کالونی کی جامع مسجد نورانی کے سیکریٹری ہیں۔ وہ کے ایم سی کی مشاورتی کونسل کے اراکین کے مشیر بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "مجھے بات کرنا آتی ہے اور یہ جانتا ہوں کہ اعلیٰ منصب والے عہدیداروں کے سامنے اپنا مافی الضمیر کس طرح واضح کروں۔ یہ کام میں نے اس وقت سیکھا جب میں ۳۳ ای پی سی اے ایف والوں کی وطن واپسی کے لیے پیروی کر رہا تھا۔ اس تجربے سے مجھ میں کافی خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب میں گفت و شنید کر سکتا ہوں اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے حقوق پیش بھی کر سکتا ہوں اور ان کے لیے تکرار بھی کر سکتا ہوں۔"

زردوز شبیر عالم

شبیر عالم کی عمر بائیس برس ہے۔ دو سال قبل اورنگی کے ایک اسکول سے انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے۔

شبیر یہاں گلشن بہار سے ۱۹۸۸ میں آئے تھے۔ انھوں نے اپنا مکان ۲۷۰۰ روپے خریدا تھا۔ وہ پچھلے دس برس سے زری کا کام کر رہے ہیں جو انھوں نے ۱۲ برس کی عمر سے شروع کیا تھا۔

شروع میں انھوں نے یہ ہنر ایک شاگرد کی حیثیت سے روزانہ چار گھنٹے لگا کر چھ ماہ تک بغیر محنتانہ لیے سیکھا۔ چھ ماہ بعد ان کو ہفتے کے ۲۵ روپے ملنے لگے۔ ایک سال بعد وہ ۸ گھنٹے روزانہ کام کر کے چالیس روپے یومیہ کما رہے تھے۔

"اورنگی زردوزی کا مرکز ہے۔ یہاں تقریباً ۱۰۰۰ چھوٹے کارخانے ہیں،" شبیر بتاتے ہیں۔ "زری کا ہنر سیکھنے میں مجھے پانچ سال لگے۔" "عموماً اس کام میں دو سال لگتے ہیں مگر مجھے پانچ سال لگے کیونکہ میں اسکول کے بعد صرف دو سے چار گھنٹے کام کرتا تھا۔ ۱۹۹۲ میں مجھے استاد سے آزادانہ کام کرنے کی اجازت ملی۔ میں نے ۴۰۰ روپے میں ۱۲ فٹ کا ایک اڈا خریدا۔ اب یہ ۷۰۰ روپے میں آتا ہے۔ کام مجھے میرے استاد دیتے تھے۔ ان کو جو کام ۴۰۰ روپے کا ملتا تھا وہ مجھ سے ۳۵۰ روپے میں کرواتے۔ میں نے ۱۹۹۲ سے ۱۹۹۴ تک دو سال کام اپنے گھر پر ہی کیا۔ پھر میں نے ۲۵۰۰ روپے ماہوار کرائے پر ایک دکان لے لی اور اپنا کاروبار بڑھالیا۔"

فی الوقت شبیر کے پاس دو اڈے ہیں اور پانچ کاریگر ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ دو کاریگر ۴ روپے فی گھنٹہ پاتے ہیں اور دو کو دو روپے فی گھنٹہ ملتے ہیں۔ ایک کاریگر مکمل تربیت یافتہ ہے اس کو ۶ روپے گھنٹہ ملتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنا کام شروع کر سکتا ہے۔ شبیر کو کاغذی بازار سے راست آرڈرز ملتے ہیں جو زری کے کام کی خوردہ مارکیٹ ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست کی معرفت وہاں رسوخ حاصل کیا تھا۔ ایک اور دکان کے لیے بھی وہی وہاں سے آرڈرز حاصل کرتا ہے۔ آرڈرز کا حصول کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

شبیر ہفتے میں چار سوٹ تیار کرتا ہے جو اس کی کل گنجائش ہے اور ہر ہفتہ آٹھ سو، نو سو روپے کماتا ہے۔ کاریگر ۱۲۵ سے لے کر ۴۰۰، روپے تک فی ہفتہ کما لیتے ہیں۔ ڈیزائن ان کو ۱۰۰ روپے فی ڈیزائن کے حساب سے ایک ڈیزائنر سے حاصل ہوتے ہیں۔ شبیر کا چھوٹا بھائی بھی اب اسکول کے بعد زری کا کام سیکھ رہا ہے۔

"ہم بہت رازداری سے کام کرتے ہیں۔ ہم اپنے ڈیزائن ظاہر نہیں کرتے، اس لیے ہم زردوزوں میں آپس میں کاروباری رشتہ کم ہے،" شبیر کہتے ہیں۔ "بیچ والا (دوکاندار) زیادہ منافع مار لیتا ہے۔ مثلاً دوپٹے کے کپڑے کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔ مزدوری کے ہم کو ۷۰۰ روپے ملتے ہیں۔ اس طرح لاگت ۱۰۰۰ روپے بنتی ہے۔ دوکاندار اسی دوپٹے کو ۲۳۰۰ روپے میں بیچتا ہے اور اس طرح ۱۳۰۰ روپے مار لیتا

ہے۔اگر ہم کو آرڈر براہ راست خریداروں سے ملیں تو ہم دگنا تگنا کما سکتے ہیں۔"

زری کی ضرورت کا سارا مال علاقے میں دستیاب ہے۔ غازی آباد اور پڑوس کے علاقے گلشن بہار میں دس دکانیں ہیں۔ سامان میں مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگے اور موتی وغیرہ ہوتے ہیں۔اگر یہی مال شہر کے تھوک مارکیٹ سے خریدیں تو دھاگے کا ایک پیکٹ اورنگی کے مقابلے میں ۸ روپے کم میں ملتا ہے۔ تاہم تمام مال اورنگی میں آسانی سے مل جاتا ہے اس لیے چھوٹے کاروباری اورنگی کی مقامی مارکیٹ سے ہی خریداری کرتے ہیں۔

نتائج

اس مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

• **ترقی کے اسباب:** غازی آباد مقابلتاً ایک نئی آبادی ہے۔ خاص طور پر تعلیم اور صحت سے تعلق رکھنے والے مسائل میں یہاں بہت کچھ ترقیاتی کام ہوا ہے۔ تقریباً نوے فیصد لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کامیابیوں کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے باشندے بڑی تعداد میں شہری پس منظر رکھتے ہیں اور خدمات اور سہولیات کے عادی رہے ہیں۔ ان کے اپنے کوئی نظریات یا سیاسی وابستگیاں نہیں ہیں۔ ان کے تمام افعال ضرورت سے بندھے ہیں۔ یہی حالات کمیونٹی کو ترقیاتی کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں۔

• **مقابلتاً بہتر معاشی حالت کے اسباب:** دیگر غیر رسمی آبادیوں کے مقابلے میں غازی آباد کی معاشی حالت بہتر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غازی آباد کے باشندے تعلیم یافتہ اور ہنر مند دستکار ہیں۔ وہ بستی میں ہی بیٹھ کر اپنے ہنر سے کام لے سکتے ہیں اور اس طرح آنے جانے پر خرچ ہونے والا وقت اور رقم بچا سکتے ہیں۔

• **سرکاری محکموں سے معاملت:** غازی آباد کے باشندے دوسری بستیوں کے باشندوں کے مقابلے میں سرکاری اداروں کے ساتھ معاملت زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غازی آباد کے بیشتر فعال کارکن سرکاری اداروں اور پولیس سے معاملت کا تاریخی پس منظر رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے بنگلہ دیش سے پاکستان آنے کے سلسلے میں بہت پاپڑ بیلے تھے۔ مزید برآں وہ چالاک بھی ہیں اور سرکاری ملازمین اور سیاستدانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ وہ سرکار کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ ترقیاتی امور کے سلسلے میں حکومت کی پیش قدمی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ خود بڑھ کر کام کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔

• **کمیونٹی کی کمزوریاں:** خانہ جنگی، قیدی کیمپوں میں اسیری، اور ایذا رسانیوں کا تجربہ رکھنے کی وجہ سے غازی آباد کے فعال کارکن طاقت ور سیاسی گروپوں سے نپٹنے کا حوصلہ کم رکھتے ہیں۔ وہ کسی قسم کا سیاسی دباؤ برداشت نہیں کر پاتے اور اس کا سامنا ہوتے ہی پسپا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی سیاسی گروپ کا ساتھ نہیں دیتے اس لیے ان کو بھی سیاسی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی وہ ہر بیرونی مداخلت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا عملی رشتہ بس او پی پی سے ہے۔

• **فعال کارکنان اور اجتماعی فیصلے:** غازی آباد کے فعال کارکن سرکاری ملازم ہیں، ایسے افراد جو سرکاری طریقہ کار کو سمجھتے ہیں یا پھر دکاندار ہیں جو ہر وقت کمیونٹی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ دیگر کم آمدنی والی آبادیوں کے برخلاف غازی آباد کے کارکنوں کے کردار کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے تمام فیصلے اجتماعی طور پر کیے جاتے ہیں اور کمیونٹی کی رائے لی جاتی ہے۔ کسی ایک لیڈر یا قیادت کا فیصلہ نہیں تھوپا جاتا۔ اس کا سبب بھی غالباً یہی ہے کہ کمیونٹی میں تعلیم کا معیار بلند ہے اور پس منظر شہری ہے۔

منڈی یونین

پس منظر

منڈی میں مزدوروں کی دو یونینیں ہیں: سبزی منڈی یونین اور فروٹ منڈی یونین۔ یہ دونوں یونینیں مل کر کام کرتی ہیں۔ دونوں کے ۱۰،۵۰۰ ارکان میں سے ہر ایک کے پاس شناختی بیج ہے۔ ان یونینوں کا آغاز ۶۴-۱۹۶۳ میں ہوا تھا جب منڈی شہر کے وسط میں سولجر بازار کے علاقے میں قائم تھی۔

یونینوں کو متحد کرنے والا پہلا مسئلہ بیگاری نظام کا تھا جس کے تحت آڑھتی مزدوروں کو یومیہ اجرت پر بھرتی کرتے تھے۔ ٹھیکے دار اپنی مرضی سے کسی بھی مزدور کو نوکری پر رکھتے یا نکالتے تھے۔

جن افراد نے مزدوروں کو منظم کیا وہ عصمت اللہ، حبیب چارلی، حاجی تاج محمہ، حبیب اللہ ڈار اور سلیم سیٹھی تھے۔ حاجی تاج محمہ اس وقت فروٹ منڈی لیبر یونین کے صدر اور محبوب شاہ جنرل سیکرٹری ہیں۔ مزدور پہلی بار چھ ماہ کے احتجاجی عرصے کے دوران منظم ہوئے جب یونین کی رجسٹریشن کے لیے دستخط حاصل کرنے کے لیے فریئر ہال میں خفیہ میٹنگیں منعقد کی گئیں اور آڑھتیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر بازوؤں پر کالی پٹیاں باندھی گئیں۔ جواب میں ٹھیکے داروں نے مزدوروں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے غنڈوں کی مدد حاصل کی۔ متعدد لڑائیاں ہوئیں اور مزدوروں نے ٹھیکے داروں کی بھی پٹائی کی۔ یہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ معاملات کو صاف ہوتے ہوتے سال بھر کا عرصہ لگا۔ کچھ ٹھیکے دار منڈی چھوڑ گئے اور باقی نے مزدوروں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

منڈی کی سرگرمیاں

اشیائے فروخت لاہور، کوئٹہ اور پشاور کے فارموں سے منڈی میں کمیشن ایجنٹوں کے پاس لائی جاتی ہیں۔ ایجنٹوں کو ۷ فیصد کمیشن، سامان اتارنے کا معاوضہ اور ٹرک ڈرائیور سے "منڈی ٹیکس" کے نام سے ایک اور کمیشن وصول ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ہر ٹھیکے دار فی ٹرک اوسطاً ۲،۵۷۵ روپے یومیہ کماتا ہے۔ منڈی میں موسم کے اعتبار سے ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک ٹھیکے دار ہوتے ہیں۔

ٹھیکے دار مال اتارنے اور کریٹوں کو اپنی دکان تک پہنچوانے کے لیے ٹھیکے دار ایک یا دو مزدور ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ تک کی تنخواہ پر ملازم رکھتا ہے۔ ایک ٹھیکے دار اپنی دکان کے لیے تین سے ۱۵ تک مزدور رکھتا ہے۔ مزدوروں کے اوپر ایک جمعدار یا سپروائزر ہوتا ہے جس کو مال کے ضائع یا چوری ہونے کی صورت میں ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔ یومیہ اجرت تمام مزدوروں کے درمیان برابر تقسیم ہوتی ہے لیکن جمعدار کو دگنا حصہ ملتا ہے۔ یہ بات محبوب شاہ کے لیے سخت ناگواری کا باعث ہے جو اس معاملے کو یونین میں اٹھانا چاہتے ہیں لیکن یونین کی کونسل میں جمعدارو کی کثیر تعداد کے باعث ایسا نہیں کرپاتے۔

فروٹ منڈی میں صبح چھ بجے سے رات ۱۲ بجے تک اور کبھی کبھی رات ۳ بجے تک کام ہوتا ہے۔ تھوک فروشوں کے ہاتھ مال کی نیلامی تین گھنٹے میں مکمل ہو جاتی ہے۔ سبزی منڈی میں کام آدھی رات کو شروع ہوتا ہے اور ۴ بجے شام تک جاری رہتا ہے۔

مال کے ٹرک خریدنے والے کو "ماشاخور" کہا جاتا ہے جو اسے ٹھیلے والوں اور چھوٹے پھل اور سبزی فروشوں کو قرض پر دیتا ہے۔ منڈی میں تقریباً ۱۷۵ مال نگران ہیں جو منڈی کے باہر سڑک پر بیٹھتے ہیں۔ جب تھوک خریدار مختلف ٹھیکے داروں سے مال خرید لیتا ہے تو دکان کے مزدور اسے لا کر مال نگران کے حوالے کر دیتے ہیں۔ مال نگران اپنی نگرانی میں آنے والے مال کے لیے فی کریٹ قلیل معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اس کے پاس بھی ایک یا دو مزدور ہوتے ہیں۔

ٹھیکے دار اور مزدور

ٹھیکے دار عموماً پنجاب، ملتان اور سرحد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزدوروں کا تعلق پشاور، باجوڑ، دیر اور ہزارہ سے ہے اور وہ کراچی کے مختلف حصوں (لیاڑی، اورنگی، لانڈھی، ملیر، نیو کراچی، نارتھ کراچی، سپر ہائی وے، سرجانی اور منڈی کے آس پاس کی

آبادیوں) میں رہتے ہیں۔ تقریباً ایک چوتھائی مزدور ویلفیئر کالونی میں رہتے ہیں۔

مزدور ۲۰ یا ۲۲ برس کی عمر میں کام شروع کرتے ہیں اور ان کی پوری توانائی سے کام کرنے کی مدت صرف آٹھ سے دس سال تک ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض سبزی کا ٹھیلا چلانے لگتے ہیں، یا کم بوجھ اٹھانے لگتے ہیں یا کریٹوں اور بوریوں پر نمبر ڈالنے کا ہلکا کام کرنے لگتے ہیں۔

فروٹ منڈی کے مزدوروں کا کام موسمی نوعیت کا ہے، اور صرف دو موسموں یعنی آم کے موسم (اپریل تا جون) اور نارنگی کے موسم (اکتوبر تا دسمبر) میں کام ہوتا ہے۔ اس عرصے میں مزدور ۱۰۰ تا ۱۵۰ روپے یومیہ کماتے ہیں اور سال کے باقی دنوں میں اس سے کم۔ موسم ختم ہونے پر وہ اپنے گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ہر مزدور کا نام ٹھیکے دار کے پاس درج رہتا ہے۔ اگر کوئی مزدور بیمار ہو یا زیادہ کام کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کا کوئی رشتے دار اس کی جگہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ مر جائے، اور اس کا بیٹا یا کوئی اور عزیز کم عمر ہو تو ٹھیکے دار اس کے گھر والوں کو اس وقت تک کچھ رقم دیتا رہتا ہے جب تک وہ کام کرنے کی عمر کو نہ پہنچ جائے۔ مزدور اپنے گروپ کے بوڑھے یا بیمار لوگوں کو ہلکا کام دے کر ان کے حصے کا کام آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

یونینوں کا انتظامی ڈھانچا

دونوں یونینوں کی انتظامی ساخت یکساں ہے اور دونوں کی رجسٹریشن ایسوسی ایشن کے طور پر ہوئی ہے نہ کہ مرکزی سوداکاری ایجنٹ کے طور پر۔ سبزی منڈی کے کل ۵۰۰۰ مزدوروں میں سے صرف ۲۵۰۰ اور فروٹ منڈی کے کل ۵۵۰۰ میں سے صرف ۳۵۰۰ یونین کے رجسٹرڈ ارکان ہیں۔ یونین کا دفتر منڈی میں واقع ہے۔

مجلس عاملہ کے ۱۲ ارکان ہیں۔ مجلس کے انتخابات ہر دو سال بعد علاقے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس، تھانے کے ایس ایچ او اور یونین کے وکلا کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ گزشتہ انتخابات ۱۹۹۴ میں ہوئے تھے۔ یونین کے ارکان مجلس عاملہ کے ارکان کے علاوہ سات عہدے داروں یعنی صدر، نائب صدر، جوائنٹ نائب صدر، جنرل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، خزانچی اور پروپیگنڈا سیکرٹری کا بھی چناؤ کرتے ہیں۔ مجلس کا اجلاس ہر ماہ ہوتا ہے۔

رکنیت کی فیس دس روپے ماہانہ ہے۔ حسابات احتیاط سے رکھے جاتے ہیں اور اجلاسوں کی کارروائی کا بھی ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

یونین کی سرگرمیاں

جس مسئلے کا یونین کو ہر روز سامنا کرنا پڑتا ہے وہ گم ہونے والے مال کا مسئلہ ہے۔ یہ واقعہ دن میں تین چار بار ضرور پیش آتا ہے اور اکثر اس کے لیے مزدوروں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یونین مزدوروں، مال نگرانوں اور ٹھیکے داروں کے درمیان تصفیہ کراتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں فریقوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ نقصان آپس میں برابر برابر بانٹ لیں۔

حال ہی میں آموں کے دو ذخیرے، جن کی مالیت مختلف تھی، ٹرک میں لادے جاتے وقت غلطی سے ایک دوسرے سے بدل گئے۔ جب مہنگے ذخیرے کے خریداری کو اس غلطی کا پتا چلا تو اس نے اس کے لیے جمعدار کو قصوروار ٹھہرایا۔ مزدور کئی دن تک دوسرے ذخیرے کے خریدار کو تلاش کرتے رہے اور آخر کار اسے باتھ آئی لینڈ میں ڈھونڈ نکالا۔ خریدار نے فاضل رقم ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی جو اصل خریدار کے حوالے کر دی گئی۔ اگر دوسرا خریدار نہ ملتا تو مزدور کو تقریباً دو ہزار روپے کا نقصان بھرنا پڑتا۔

جنوری ۱۹۹۱ میں ہونے والی ایک ڈکیتی میں فروٹ منڈی کنٹریکٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین حاجی افتخار کی دکان سے ساری رقم لوٹ لی گئی۔ تمام یونینوں نے انتظامیہ کے خلاف احتجاج کے طور پر دو دن کی ہڑتال کی اور مطالبہ کیا کہ ڈاکوؤں کو گرفتار کیا جائے اور منڈی میں تحفظ کے بندوبست بہتر بنایا جائے۔

۱۹۹۲ میں گنے کی منڈی کو گودھرا کیمپ منتقل کر دیا گیا۔ ٹھیکے داروں نے تمام پرانے مزدوروں کو نوکری سے الگ کر کے ان کی جگہ نئے مزدور بھرتی کر لیے۔ مزدوروں نے دس دن تک ہڑتال کی لیکن انھیں حکومت کی طرف سے کوئی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ فروٹ منڈی کے مزدوروں کو پورٹ قاسم، پپری گودام اور کیماڑی کے دوبوں کی مزدور یونینوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ ان یونینوں نے منڈی کے مزدوروں کی طرف سے حکومت سے احتجاج کیا۔ تاہم منڈی کی یونینوں سے دوسری یونینوں کی اسی طرح حمایت کرنے کو نہیں کہا گیا، غالباً اس لیے کہ ان کو سی بی اے کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

یونینوں کے موجودہ معاملات

یونین کی ایک بڑی ترجیح یہ ہے کہ اسے (ایسوسی ایشن کے بجائے) ٹریڈ یونین کے طور پر رجسٹریشن، اور اس کے بعد اجتماعی سوداکاری ایجنٹ کا درجہ حاصل ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ کے ایم سی کی طرف سے منڈی کو سپرہائی وے منتقل کرنے کا منصوبہ ہے۔ موجودہ منڈی میں ٹھیکے داروں کے پاس کرائے کی دکانیں ہیں چنانچہ انھیں اپنی مرضی سے مزدوروں کو بھرتی کرنے یا نکالنے کی یا انتظامیہ کے طے کیے ہوئے اجرتوں کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ منڈی کے مزدوروں کو معلوم ہوا ہے کہ نئی منڈی میں ٹھیکے داروں کو دکانوں کی مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے، اور ان مزدوروں کو ڈر ہے کہ انھیں نکال کر ان کی جگہ نئے مزدور رکھ لیے جائیں گے۔ یونین سرکاری منصوبے کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ دکانیں کرائے پر دی جائیں۔

نئی منڈی میں مزدوروں کے لیے کسی رہائشی کالونی کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی ہے اور یونین منڈی کی نئی جگہ کے قریب رہائش کے لیے زمین حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ڈپٹی کمشنر سے گوٹھ آباد اسکیم (صوبائی حکومت کے تحت چلائی جانے والی دیہی علاقوں کو زمین فراہم کرنے کی اسکیم) کے تحت ۱۶۰ ایکڑ زمین فراہم کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اور اس زمین کی قیمت، جو ۵۰،۰۰۰ روپے فی ایکڑ ہے، ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ وہ فی ایکڑ ۱۰،۰۰۰ روپے کی رشوت بھی دینے کو تیار ہیں، لیکن ڈپٹی کمشنر ڈھائی لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ایک ایکڑ میں ۲۴ سے ۲۸ پلاٹ تک حاصل ہوں گے، جبکہ کل ۱۶۰۰ پلاٹوں کی ضرورت ہے، زیادہ تر ان مزدوروں کے لیے جو موجودہ منڈی کی دکانوں کی چھتوں پر رہتے تھے اور ۱۹۹۲ میں منڈی میں لگنے والی آگ کے باعث بے گھر ہو گئے تھے۔ مزدور محسوس کرتے ہیں کہ وہ تیس سال سے منڈی کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے نئی منڈی کے قریب رہائش کے لیے جگہ حاصل کرنا ان کا حق ہے۔

یونین کے رابطے

سبزی اور فروٹ منڈی یونینوں کا ان آبادیوں کے ساتھ رابطوں کا ایک سلسلہ قائم ہے جہاں منڈی کے مزدور رہتے ہیں۔ جب کبھی انھیں حمایت اور اپنے حق میں اقدام کی ضرورت ہوتی ہے وہ کارکنوں اور مقامی تنظیموں کے ساتھ اپنے رابطے استعمال کر کے اسے منظم کر لیتے ہیں۔ جب مقامی تنظیموں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو منڈی یونینیں بھی انھیں مدد فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

- جب ویلفیئر کالونی کے پلاٹ پر منشیات فروشوں کا قبضہ ختم کرانے کے لیے محبوب شاہ اور ان کے گروپ نے جدوجہد کی تو منڈی کے مزدوروں نے ان کا ساتھ دیا۔
- ویلفیئر کالونی کے قبرستان کو قبضہ گیروں سے چھڑانے اور اس کے گرد چاردیواری تعمیر کرنے کے لیے فرقان آباد، نشتر بستی اور گبول گوٹھ کی مقامی تنظیموں اور مزدور یونینوں کو متحرک کیا گیا۔
- لیز دستاویزات حاصل کرنے، عرفان اللہ مروت کی حمایت حاصل کرنے اور علاقے کے سروے کے لیے رقم اکٹھی کرنے کے سلسلے میں تنظیم کی کوششوں کو یونین کی حمایت سے تقویت حاصل ہوئی۔
- جولائی ۱۹۹۵ کے آخر میں بلدیہ نے نشتر بستی میں عوامی استعمال کے لیے مخصوص ایک بڑا پلاٹ بعض بارسوخ افراد کو الاٹ کر دیا جن میں مسجد کا ایک مذہبی اور سیاسی رہنما قاری شیر افضل بھی شامل تھا۔ نشتر بستی کے باشندوں نے منڈی یونین کے صدر تاج محمد اور جنرل سیکرٹری محبوب شاہ سے مدد طلب کی۔ دو ہفتے کے اندر اندر ۵۰۰۰ روپے کی رقم اکٹھی ہو گئی اور ایک وکیل نے بستی کے باشندوں کی طرف سے حکم امتناعی کی درخواست دائر کرنے کی رضاکارانہ پیش کش کی۔

آبادیوں) میں رہتے ہیں۔ تقریباً ایک چوتھائی مزدور ویلفیئر کالونی میں رہتے ہیں۔

مزدور ۲۰ یا ۲۲ برس کی عمر میں کام شروع کرتے ہیں اور ان کی پوری توانائی سے کام کرنے کی مدت صرف آٹھ سے دس سال تک ہوتی ہے۔ اس کے بعد ان میں سے بعض سبزی کا ٹھیلا چلانے لگتے ہیں، یا کم بوجھ اٹھانے لگتے ہیں یا کریٹوں اور بوریوں پر نمبر ڈالنے کا ہلکا کام کرنے لگتے ہیں۔

فروٹ منڈی کے مزدوروں کا کام موسمی نوعیت کا ہے، اور صرف دو موسموں یعنی آم کے موسم (اپریل تا جون) اور نارنگی کے موسم (اکتوبر تا دسمبر) میں کام ہوتا ہے۔ اس عرصے میں مزدور ۱۰۰ تا ۱۵۰ روپے یومیہ کماتے ہیں اور سال کے باقی دنوں میں اس سے کم۔ موسم ختم ہونے پر وہ اپنے گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ہر مزدور کا نام ٹھیکے دار کے پاس درج رہتا ہے۔ اگر کوئی مزدور بیمار ہو یا زیادہ کام کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کا کوئی رشتے دار اس کی جگہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ مر جائے، اور اس کا بیٹا یا کوئی اور عزیز کم عمر ہو تو ٹھیکے دار اس کے گھر والوں کو اس وقت تک کچھ رقم دیتا رہتا ہے جب تک وہ کام کرنے کی عمر کو نہ پہنچ جائے۔ مزدور اپنے گروپ کے بوڑھے یا بیمار لوگوں کو ہلکا کام دے کر ان کے حصے کا کام آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

یونینوں کا انتظامی ڈھانچا

دونوں یونینوں کی انتظامی ساخت یکساں ہے اور دونوں کی رجسٹریشن ایسوسی ایشن کے طور پر ہوئی ہے نہ کہ مرکزی سوداکاری ایجنٹ کے طور پر۔ سبزی منڈی کے کل ۵۰۰۰ مزدوروں میں سے صرف ۲۵۰۰ اور فروٹ منڈی کے کل ۵۵۰۰ میں سے صرف ۳۵۰۰ یونین کے رجسٹرڈ ارکان ہیں۔ یونین کا دفتر منڈی میں واقع ہے۔

مجلس عاملہ کے ۲۷ ارکان ہیں۔ مجلس کے انتخابات ہر دو سال بعد علاقے کے سپرنٹنڈنٹ پولیس، تھانے کے ایس ایچ او اور یونین کے وکلا کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ گزشتہ انتخابات ۱۹۹۴ میں ہوئے تھے۔ یونین کے ارکان مجلس عاملہ کے ارکان کے علاوہ سات عہدے داروں یعنی صدر، نائب صدر، جوائنٹ نائب صدر، جنرل سیکرٹری، جوائنٹ سیکرٹری، خزانچی اور پروپیگنڈا سیکرٹری کا بھی چناؤ کرتے ہیں۔ مجلس کا اجلاس ہر ماہ ہوتا ہے۔

رکنیت کی فیس دس روپے ماہانہ ہے۔ حسابات احتیاط سے رکھے جاتے ہیں اور اجلاسوں کی کارروائی کا بھی ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

یونین کی سرگرمیاں

جس مسئلے کا یونین کو ہر روز سامنا کرنا پڑتا ہے وہ گم ہونے والے مال کا مسئلہ ہے۔ یہ واقعہ دن میں تین چار بار ضرور پیش آتا ہے اور اکثر اس کے لیے مزدوروں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یونین مزدوروں، مال نگرانوں اور ٹھیکے داروں کے درمیان تصفیہ کراتی ہے۔ بیشتر صورتوں میں فریقوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ نقصان آپس میں برابر برابر بانٹ لیں۔

حال ہی میں آموں کے دو ذخیرے، جن کی مالیت مختلف تھی، ٹرک میں لادے جاتے وقت غلطی سے ایک دوسرے سے بدل گئے۔ جب مہنگے ذخیرے کے خریداری کو اس غلطی کا پتا چلا تو اس نے اس کے لیے جمعدار کو قصوروار ٹھہرایا۔ مزدور کئی دن تک دوسرے ذخیرے کے خریدار کو تلاش کرتے رہے اور آخر کار اسے باتھ آئی لینڈ میں ڈھونڈ نکالا۔ خریدار نے فاضل رقم ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی جو اصل خریدار کے حوالے کر دی گئی۔ اگر دوسرا خریدار نہ ملتا تو مزدور کو تقریباً دو ہزار روپے کا نقصان بھرنا پڑتا۔

جنوری ۱۹۹۱ میں ہونے والی ایک ڈکیتی میں فروٹ منڈی کنٹریکٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین حاجی افتخار کی دکان سے ساری رقم لوٹ لی گئی۔ تمام یونینوں نے انتظامیہ کے خلاف احتجاج کے طور پر دو دن کی ہڑتال کی اور مطالبہ کیا کہ ڈاکوؤں کو گرفتار کیا جائے اور منڈی میں تحفظ کے بندوبست بہتر بنایا جائے۔

۱۹۹۲ میں گنے کی منڈی کو گودھرا کیمپ منتقل کر دیا گیا۔ ٹھیکے داروں نے تمام پرانے مزدوروں کو نوکری سے الگ کر کے ان کی جگہ نئے مزدور بھرتی کر لیے۔ مزدوروں نے دس دن تک ہڑتال کی لیکن انھیں حکومت کی طرف سے کوئی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ فروٹ منڈی کے مزدوروں کو پورٹ قاسم، پپری گودام اور کیماڑی کے دوبوں کی مزدور یونینوں کی حمایت حاصل ہوئی۔ ان یونینوں نے منڈی کے مزدوروں کی طرف سے حکومت سے احتجاج کیا۔ تاہم منڈی کی یونینوں سے دوسری یونینوں کی اسی طرح حمایت کرنے کو نہیں کہا گیا، غالباً اس لیے کہ ان کو سی بی اے کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

یونینوں کے موجودہ معاملات

یونین کی ایک بڑی ترجیح یہ ہے کہ اسے (ایسوسی ایشن کے بجائے) ٹریڈ یونین کے طور پر رجسٹریشن، اور اس کے بعد اجتماعی سوداکاری ایجنٹ کا درجہ حاصل ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ کے ایم سی کی طرف سے منڈی کو سپرہائی وے منتقل کرنے کا منصوبہ ہے۔ موجودہ منڈی میں ٹھیکے داروں کے پاس کرائے کی دکانیں ہیں چنانچہ انھیں اپنی مرضی سے مزدوروں کو بھرتی کرنے یا نکالنے کی یا انتظامیہ کے طے کیے ہوئے اجرتوں کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ منڈی کے مزدوروں کو معلوم ہوا ہے کہ نئی منڈی میں ٹھیکے داروں کو دکانوں کی مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے، اور ان مزدوروں کو ڈر ہے کہ انھیں نکال کر ان کی جگہ نئے مزدور رکھ لیے جائیں گے۔ یونین سرکاری منصوبے کی نقل حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ دکانیں کرائے پر دی جائیں۔

نئی منڈی میں مزدوروں کے لیے کسی رہائشی کالونی کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی ہے اور یونین منڈی کی نئی جگہ کے قریب رہائش کے لیے زمین حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ڈپٹی کمشنر سے گوٹھ آباد اسکیم (صوبائی حکومت کے تحت چلائی جانے والی دیہی علاقوں کو زمین فراہم کرنے کی اسکیم) کے تحت ۱۶۰ ایکڑ زمین فراہم کرنے کا مطالبہ کیا ہے، اور اس زمین کی قیمت، جو ۵۰،۰۰۰ روپے فی ایکڑ ہے، ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ وہ فی ایکڑ ۱۰،۰۰۰ روپے کی رشوت بھی دینے کو تیار ہیں، لیکن ڈپٹی کمشنر ڈھائی لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ایک ایکڑ میں ۲۴ سے ۲۸ پلاٹ تک حاصل ہوں گے، جبکہ کل ۱۶۰۰ پلاٹوں کی ضرورت ہے، زیادہ تر ان مزدوروں کے لیے جو موجودہ منڈی کی دکانوں کی چھتوں پر رہتے تھے اور ۱۹۹۲ میں منڈی میں لگنے والی آگ کے باعث بے گھر ہو گئے تھے۔ مزدور محسوس کرتے ہیں کہ وہ تیس سال سے منڈی کے لیے کام کر رہے ہیں اس لیے نئی منڈی کے قریب رہائش کے لیے جگہ حاصل کرنا ان کا حق ہے۔

یونین کے رابطے

سبزی اور فروٹ منڈی یونینوں کا ان آبادیوں کے ساتھ رابطوں کا ایک سلسلہ قائم ہے جہاں منڈی کے مزدور رہتے ہیں۔ جب کبھی انھیں حمایت اور اپنے حق میں اقدام کی ضرورت ہوتی ہے وہ کارکنوں اور مقامی تنظیموں کے ساتھ اپنے رابطے استعمال کر کے اسے منظم کر لیتے ہیں۔ جب مقامی تنظیموں کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو منڈی یونینیں بھی انھیں مدد فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

- جب ویلفیئر کالونی کے پلاٹ پر منشیات فروشوں کا قبضہ ختم کرانے کے لیے محبوب شاہ اور ان کے گروپ نے جدوجہد کی تو منڈی کے مزدوروں نے ان کا ساتھ دیا۔
- ویلفیئر کالونی کے قبرستان کو قبضہ گیروں سے چھڑانے اور اس کے گرد چاردیواری تعمیر کرنے کے لیے فرقان آباد، نشتر بستی اور گبول گوٹھ کی مقامی تنظیموں اور مزدور یونینوں کو متحرک کیا گیا۔
- لیز دستاویزات حاصل کرنے، عرفان اللہ مروت کی حمایت حاصل کرنے اور علاقے کے سروے کے لیے رقم اکٹھی کرنے کے سلسلے میں تنظیم کی کوششوں کو یونین کی حمایت سے تقویت حاصل ہوئی۔
- جولائی ۱۹۹۵ کے آخر میں بلدیہ نے نشتر بستی میں عوامی استعمال کے لیے مخصوص ایک بڑا پلاٹ بعض بارسوخ افراد کو الاٹ کر دیا جن میں مسجد کا ایک مذہبی اور سیاسی رہنما قاری شیر افضل بھی شامل تھا۔ نشتر بستی کے باشندوں نے منڈی یونین کے صدر تاج محمد اور جنرل سیکرٹری محبوب شاہ سے مدد طلب کی۔ دو ہفتے کے اندر اندر ۵۰۰۰ روپے کی رقم اکٹھی ہو گئی اور ایک وکیل نے بستی کے باشندوں کی طرف سے حکم امتناعی کی درخواست دائر کرنے کی رضاکارانہ پیش کش کی۔

مصنفین کے بارے میں

عارف حسن آرکیٹکٹ کے طور پر کراچی میں پریکٹس کرتے ہیں اور ۱۹۸۲ سے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے مشیر اعلیٰ ہیں۔ وہ اربن ریسورس سنٹر کراچی کے چیئرمین، اور ایشین کوالیشن فار ہاؤسنگ رائٹس بنکاک کے بانی رکن بھی ہیں۔ عارف حسن نے رہائش، ماحولیات، اور شہری ترقیات اور اس عمل میں شہریوں کی شراکت کے موضوعات پر متعدد کتابیں، تحقیقی مضامین اور رپورٹیں تحریر کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی شہری تنظیموں، حکومتی اداروں اور بین الاقوامی اداروں کے لیے مشاورت کی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ۱۹۷۹ سے داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی میں آرکیٹکچر اور پلاننگ کے مضامین پڑھاتے رہے ہیں۔ ان کی کوششوں سے کالج کے اس شعبے میں دوررس تبدیلیاں آئیں اور فن تعمیر کی تعلیم کو سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا گیا۔ انھوں نے ہم خیال اساتذہ کے ساتھ مل کر شعبے میں ایک تحقیقی مرکز قائم کیا جسے ۱۹۹۱ میں ایک خود مختار ادارے کی شکل دی گئی۔ ان کی نگرانی میں اربن ریسورس سنٹر شہری امور بالخصوص رہائش و آبادکاری، اور ٹرانسپورٹ کے بارے میں تحقیق اور پیروکاری میں مصروف ہے۔

سارا صدیقی نے ۱۹۸۰ میں کراچی یونیورسٹی سے طبعیات میں ماسٹرز کیا اور پھر ۱۹۸۶ میں یونیورسٹی آف منے سوٹا سے بھی ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے کراچی میں کارپوریٹ سیکٹر کے کئی اداروں میں خدمات سرانجام دینے کے بعد انھوں نے ایک غیر سرکاری تنظیم کراچی ایڈمنسٹریشن ویمنز ویلفیئر سوسائٹی کے لیے کام شروع کیا جو کراچی ایڈمنسٹریشن سوسائٹی کے طبعی حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں تھی۔ ۱۹۹۳ میں انھوں نے سٹیزن پولیس لائژاں کمیٹی کے لیے رضاکارانہ بنیاد پر کام شروع کیا۔ آج کل وہ شہریوں کے ایک اتحاد "کریڈ" کے پلیٹ فارم سے ناموزوں سرکاری پالیسیوں اور نامناسب ترقیاتی منصوبوں کے خلاف جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کراچی کے سماجی اور طبعی حالات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں چلائی جانے والی بیشتر شہری تحریکوں کا بھی حصہ رہی ہیں۔

رشید کھتری نے ۱۹۸۶ میں این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی سے سول انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرنے کے بعد انھوں نے ایک غیر سرکاری تنظیم "بستی" کے ساتھ تکنیکی مشیر کے طور پر کام شروع کیا۔ ۱۹۸۸ میں انھوں نے ماری پور میں شہریوں کی ایک ترقیاتی تنظیم قائم کی۔ ۱۹۹۱ میں رشید کھتری نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے ہاؤسنگ اینڈ سینی ٹیشن پروگرام میں بطور انجینئر کام شروع کیا۔ اس کے علاوہ وہ دیہی ترقی کے پروگرام میں موزوں ٹیکنالوجی کے سلسلے میں تحقیق میں بھی شامل رہے ہیں اور اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے خبرنامے کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اپنے زمانۂ طالبعلمی ہی سے رشید کھتری ترقی پسند سیاست میں عملی حصہ لیتے رہے ہیں۔

پروین رحمن نے ۱۹۸۲ میں داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی سے آرکیٹکچر میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد انھوں نے چند ماہ ایک آرکیٹکچر کنسلٹنٹ کے ساتھ کام کیا اور اسی دوران اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے سینی ٹیشن پروگرام میں بھی جز وقتی کام شروع کر دیا۔ ۱۹۸۳ میں وہ او پی پی کے ساتھ باقاعدہ کل وقتی طور پر وابستہ ہو گئیں اور اب او پی پی آر ٹی آئی کی ڈائرکٹر کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ اپنے کام کے دوران انھوں نے کراچی کی کچی آبادیوں کے حالات بہتر بنانے کے سلسلے میں شہریوں اور سرکاری محکموں کے ساتھ شراکت عمل کا قیمتی تجربہ حاصل کیا۔ ان کے کاموں میں تحقیق و توسیع اور تربیت کے فرائض شامل ہیں۔ ۱۹۸۳ سے وہ داؤد کالج میں آرکیٹکچر کی تدریس سے بھی وزٹنگ لیکچرر کے طور پر وابستہ ہیں۔ وہ داؤد کالج میں ینگ پروفیشنلز ٹریننگ پروگرام کی بانی رکن ہیں اور اس کی سرگرمیوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ وہ اربن ریسورس سنٹر کراچی کی بھی بانی رکن اور خزانچی ہیں۔

سلیم علیم الدین نے ۱۹۸۲ میں کراچی پولی ٹیکنک سے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا، اور سال بھر ایک تعمیراتی فرم کے ساتھ کنسٹرکشن سپروائزر کے طور پر کام کرنے کے بعد داؤد کالج کے آرکیٹکچر ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لیا۔ اپنی طالب علمی کے دنوں ہی سے انھوں نے اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے سینی ٹیشن اینڈ ہاؤسنگ پروگرام میں خدمات انجام دینا شروع کر دیا۔ ۱۹۸۹ میں آرکیٹکچر میں گریجویشن کرنے کے بعد وہ او پی پی سے باقاعدہ طور پر منسلک ہو گئے۔ او پی پی آر ٹی آئی میں کام کرنے کے دوران ہی انھوں نے ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بنکاک سے شہری منصوبہ بندی میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ او پی پی میں اپنے کام کے دوران سلیم علیم الدین نے کچی آبادیوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں سرکاری محکموں اور کچی آبادیوں کے باشندوں کے ساتھ کام کرنے کا قیمتی تجربہ حاصل کیا۔ آج کل وہ او پی پی کے ماڈل پر تیار کیے جانے والے مختلف ترقیاتی منصوبوں میں تحقیق، توسیع اور تربیت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ وہ بھی اربن ریسورس سنٹر اور داؤد کالج کے ینگ پروفیشنل ٹریننگ پروگرام کے بانی ارکان میں سے ایک ہیں۔

انور راشد نے ۱۹۷۹ میں کراچی یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ماسٹرز کی تعلیم مکمل کی اور پھر اسی یونیورسٹی کے اپلائیڈ اکنامک ریسرچ سنٹر سے ایک سال کا ایڈوانس کورس مکمل کیا۔ انھوں نے دو سال کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اقتصادیات میں لیکچرر کے طور پر خدمات انجام دیں اور پھر ۱۹۸۳ میں او پی پی کے سینی ٹیشن اینڈ ہاؤسنگ پروگرام سے ریسرچ کے طور پر وابستہ ہو گئے۔ اس پروگرام اور اس نمونے پر چلائے جانے والے دیگر ترقیاتی منصوبوں میں کام کرنے کے علاوہ انھوں نے او پی پی کے صحت، چھوٹے قرضوں، اور تعلیم کے پروگراموں میں بھی خدمات انجام دی ہیں۔ آج کل وہ اورنگی چیریٹیبل ٹرسٹ کے سربراہ کی حیثیت سے چھوٹے کاروباری قرضوں کے پروگرام کے نگران ہیں۔ اس کے علاوہ وہ او پی پی سوسائٹی کے ڈائرکٹر بھی ہیں۔

روشن مثالیں

کراچی کی چار بستیوں میں شہریوں کے ترقیاتی اقدامات کا مطالعہ

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ساڑھے چار لاکھ تھی۔ آج یہ ایک کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے، اور اس میں ہر سال تقریباً پانچ لاکھ افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کم آمدنی والے باشندوں کی تعداد شہر کی کل آبادی کے ساٹھ فیصد کے برابر ہے۔ ریاستی اور رسمی پرائیویٹ سیکٹر کے ادارے اس بڑھتی ہوئی آبادی کے اس طبقے کی روزگار، رہائش اور اس سے متعلق طبعی اور سماجی انفراسٹرکچر کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ شہر کے غریب باشندوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا کہ وہ خود کو منظم کر کے زمین کے مالکانہ حقوق حاصل کرنے، انفراسٹرکچر تعمیر کرنے، اپنی آبادیوں میں موجود کھلی جگہوں کا قبضہ گیروں سے تحفظ کرنے اور مجموعی طور پر ایک بہتر طبعی اور سماجی ماحول پیدا کرنے کے لیے اجتماعی طور پر جدوجہد کریں۔

زیرِ نظر کتاب کراچی کی چار کم آمدنی والی بستیوں میں شہریوں کی اسی جدوجہد کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بستیاں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، لیکن ان سب کے باشندوں نے اپنے سماجی اور طبعی ماحول کو بہتر بنانے کی کوششیں کی ہیں۔ اپنی اس جدوجہد کے دوران انھیں سیاست دانوں کی خود غرضی، سرکاری محکموں، بلدیاتی اداروں اور پولیس کے اہلکاروں کی بدعنوانی، غیر رسمی سیکٹر کے تاجروں کے استحصالی طرزِ عمل اور کبھی کبھی خود اپنے رہنماؤں کی انا پرستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کتاب میں پیش کی جانے والے مطالعے اس جدوجہد اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کی کہانی سناتے ہیں۔

یہ چار مطالعے کراچی کے معروف ترقیاتی کارکنوں نے تیار کیے ہیں جو شہر اکی ترقیات اور اس کے متعلقہ مسائل کے ضمن میں مقامی باشندوں اور گروپوں کے ساتھ عملی کام میں طویل عرصے سے مصروف ہیں۔ سارہ صدیقی کراچی ایڈمنسٹریشن ویمن ویلفیئر سوسائٹی سے وابستہ ہیں اور سٹیزن پولیس لائزان کمیٹی کی بھی رکن ہیں۔ انجینیئر رشید کھتری اور آرکیٹکٹ سلیم علیم الدین اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (او پی پی آر ٹی آئی) کے لیے کام کرتے ہیں۔ انور راشد اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے جوائنٹ ڈائرکٹر ہیں، اور آرکیٹکٹ پروین رحمن او پی پی آر ٹی آئی کی ڈائرکٹر ہیں۔ ان چاروں مطالعوں کو ترتیب دینے اور کراچی اور پاکستان کی مجموعی صورت حال کے تناظر میں شہریوں کے ان ترقیاتی اقدامات کا تعارف کرانے کا کام آرکیٹکٹ عارف حسن نے انجام دیا ہے۔ وہ ان مطالعوں کی تیاری میں بھی بطور مشیر شامل رہے ہیں۔

ISBN 969-8380-33-7

Rs. 200